

امرتسر کی یادیں



احمد

امرتسری یادیں

پیارے بیٹے خانقاہ محمد الیف فراہ کا لئے
حضرت مولانا محمد الیف فراہ

احمدیہ

اس کے محمد

الزمر ۶۹۹

۱۲/۱۱

مکتبہ
مکتبہ
مکتبہ

۱۲/۱۱

مکتبہ عالیہ لاہور

شایدیں کہ مرزا

آمرتسریگی یادیں

اے حمید

ناشر : محمد جمیل انبسی

طابع : ایف۔ ڈی پرنٹرز، لاہور

سرورق : طاہر رشید

قیمت

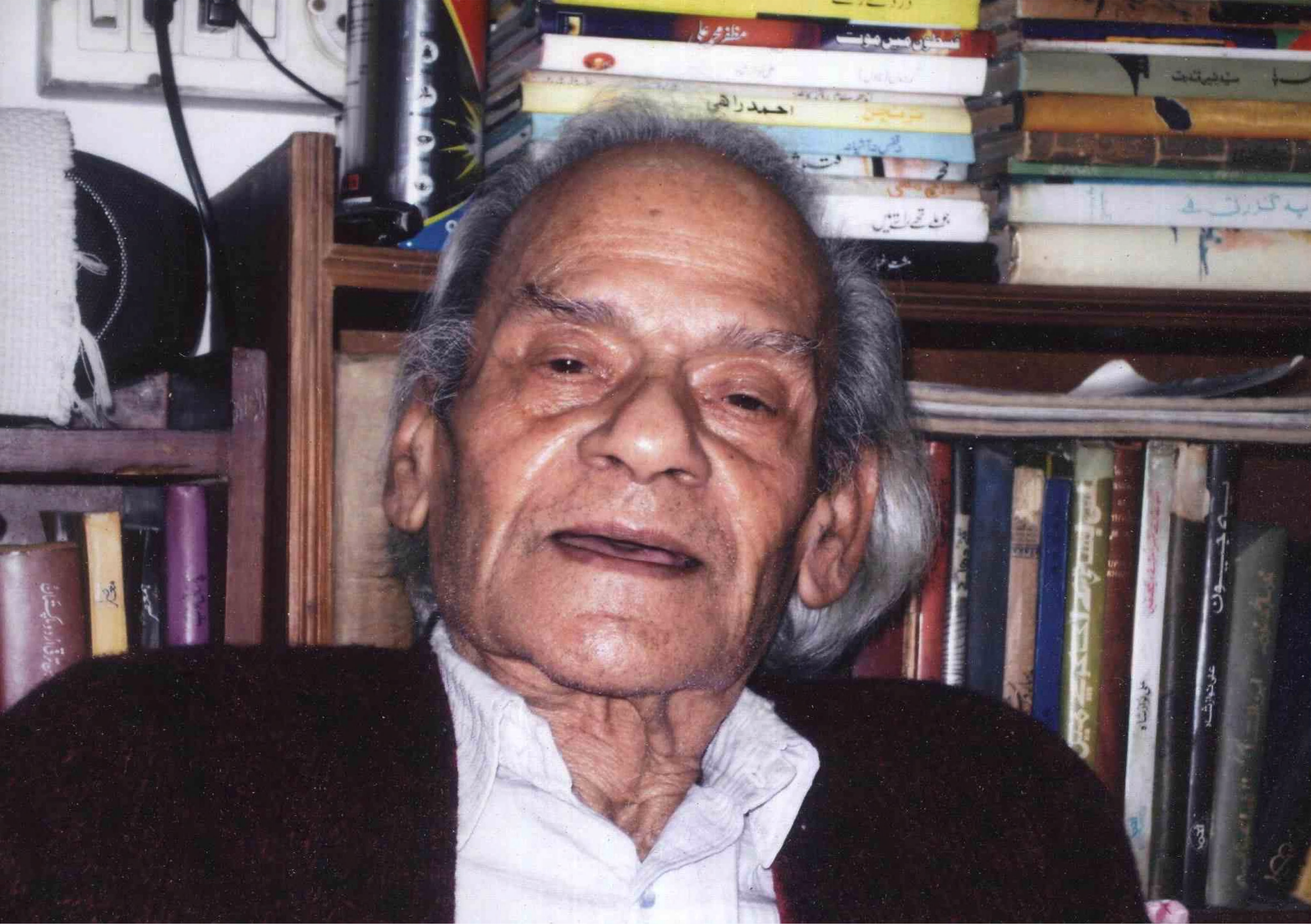
۲۰۰/-

یکے لایز مطبوعہ :

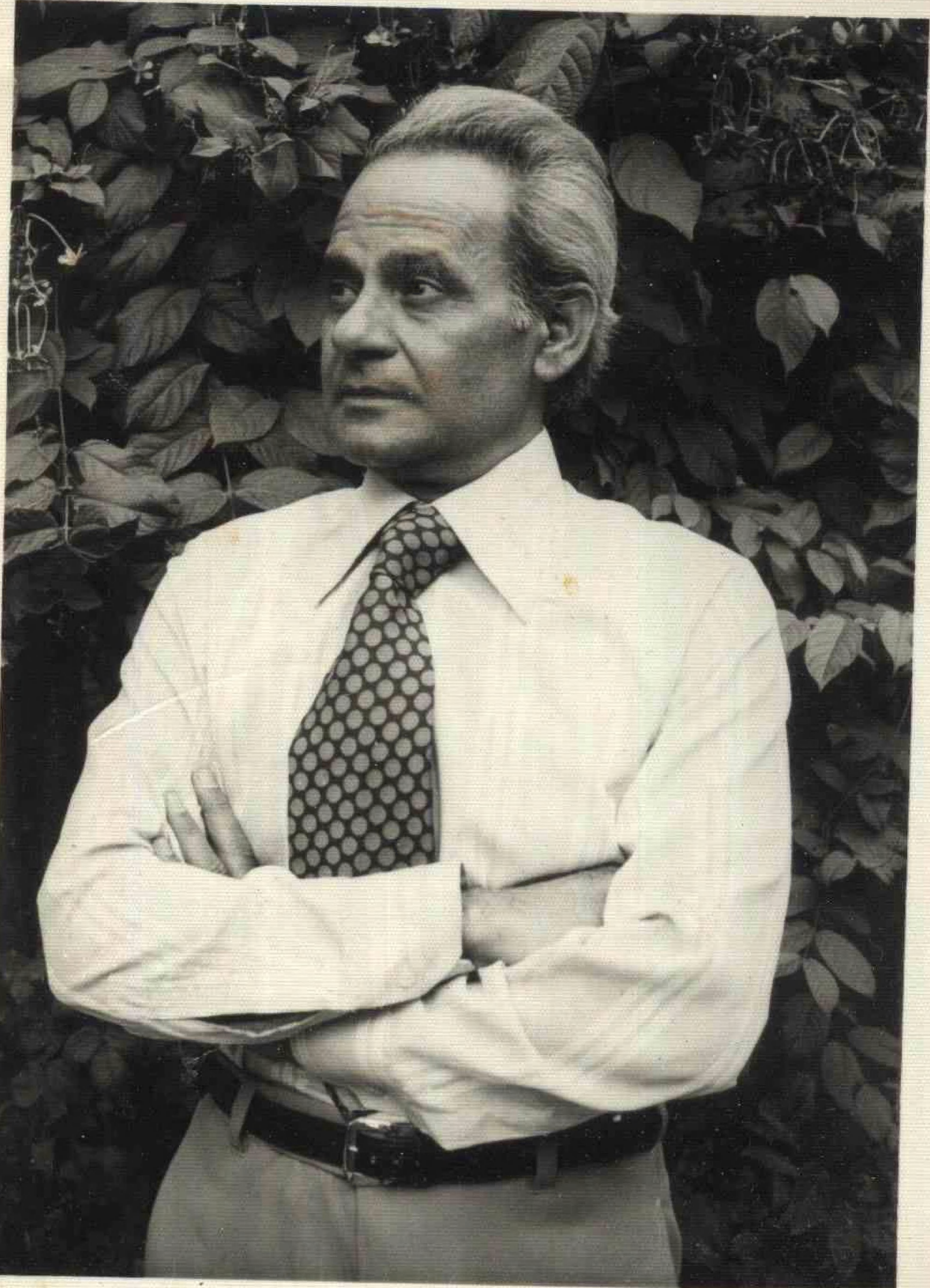
مکتبہ عالیہ آفس : ایک وڈ (انارکلی) لاہور
شوروم : اردو بازار

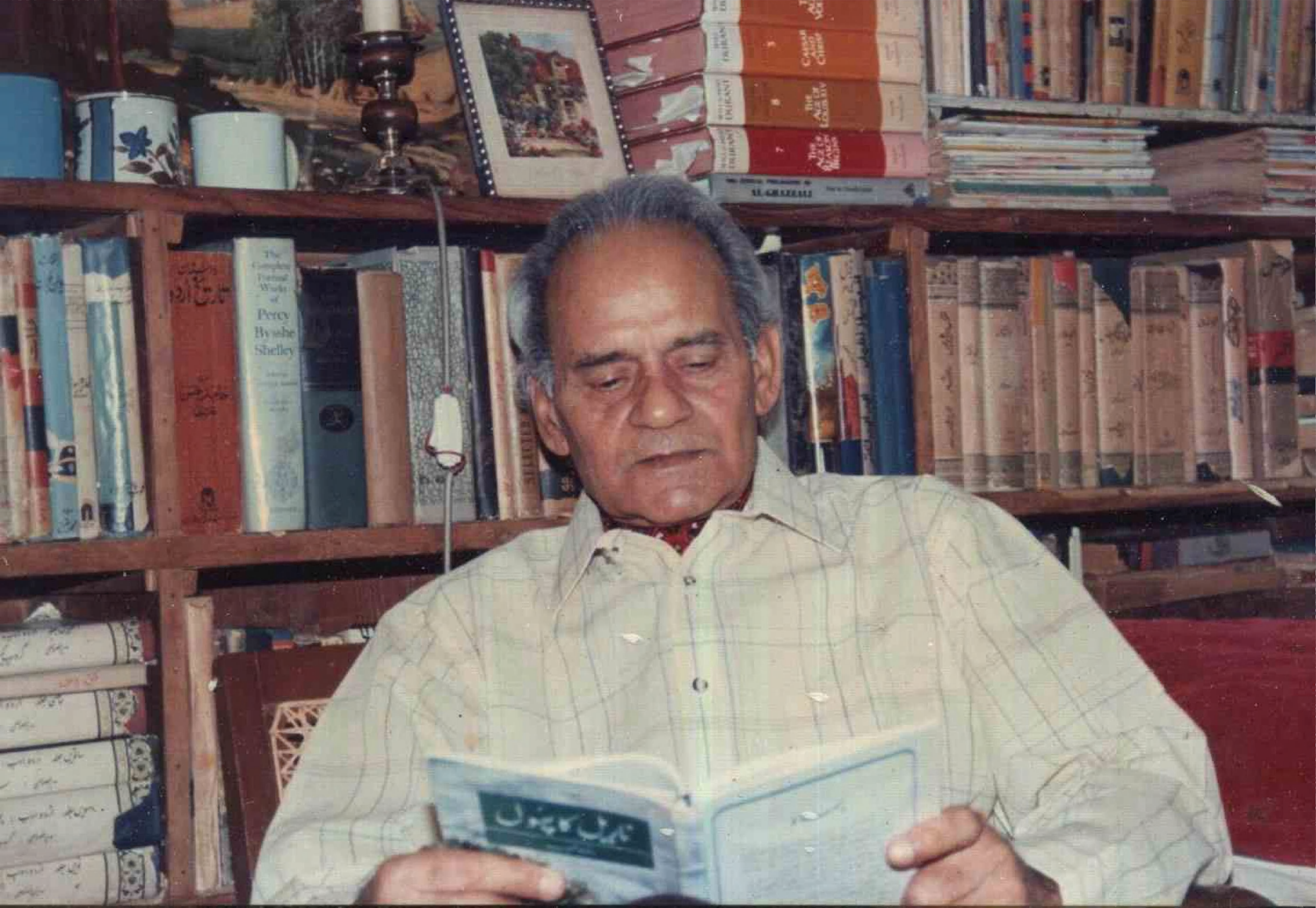
"امبرسریوں"

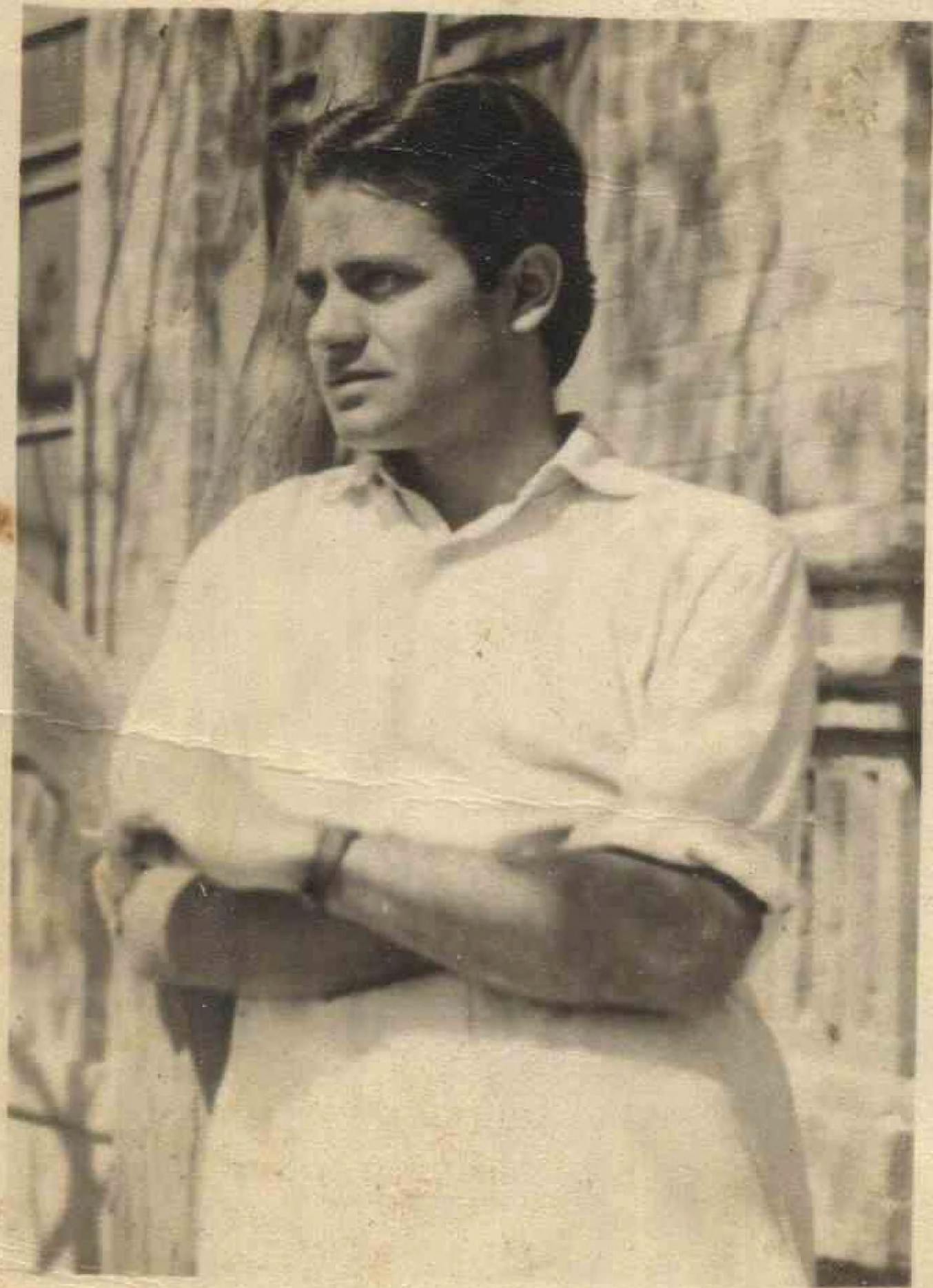
فہرست کے نام



















Radio Ceylon
1947

Cap. Muntaz
Malik

A Hameed

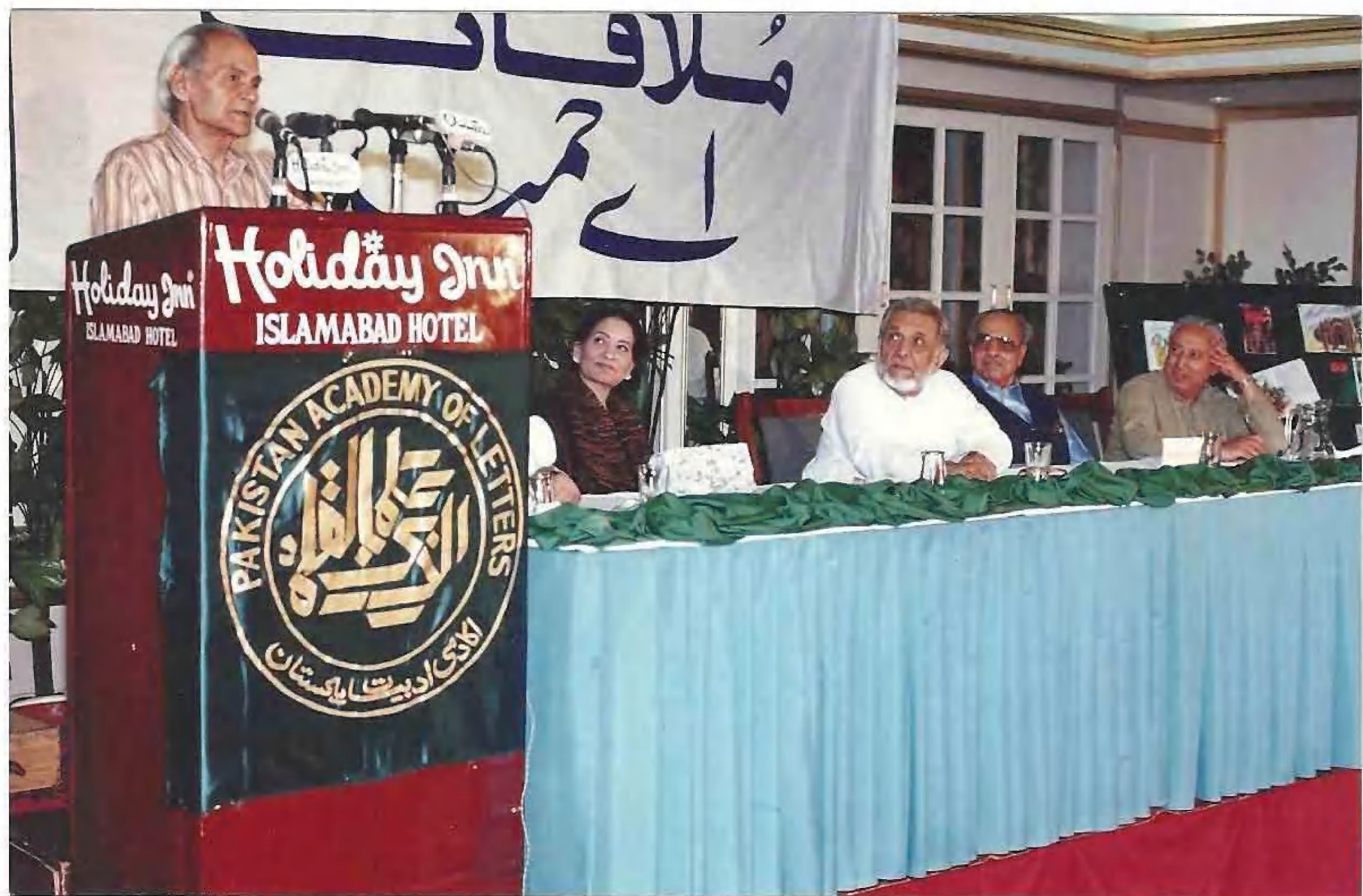


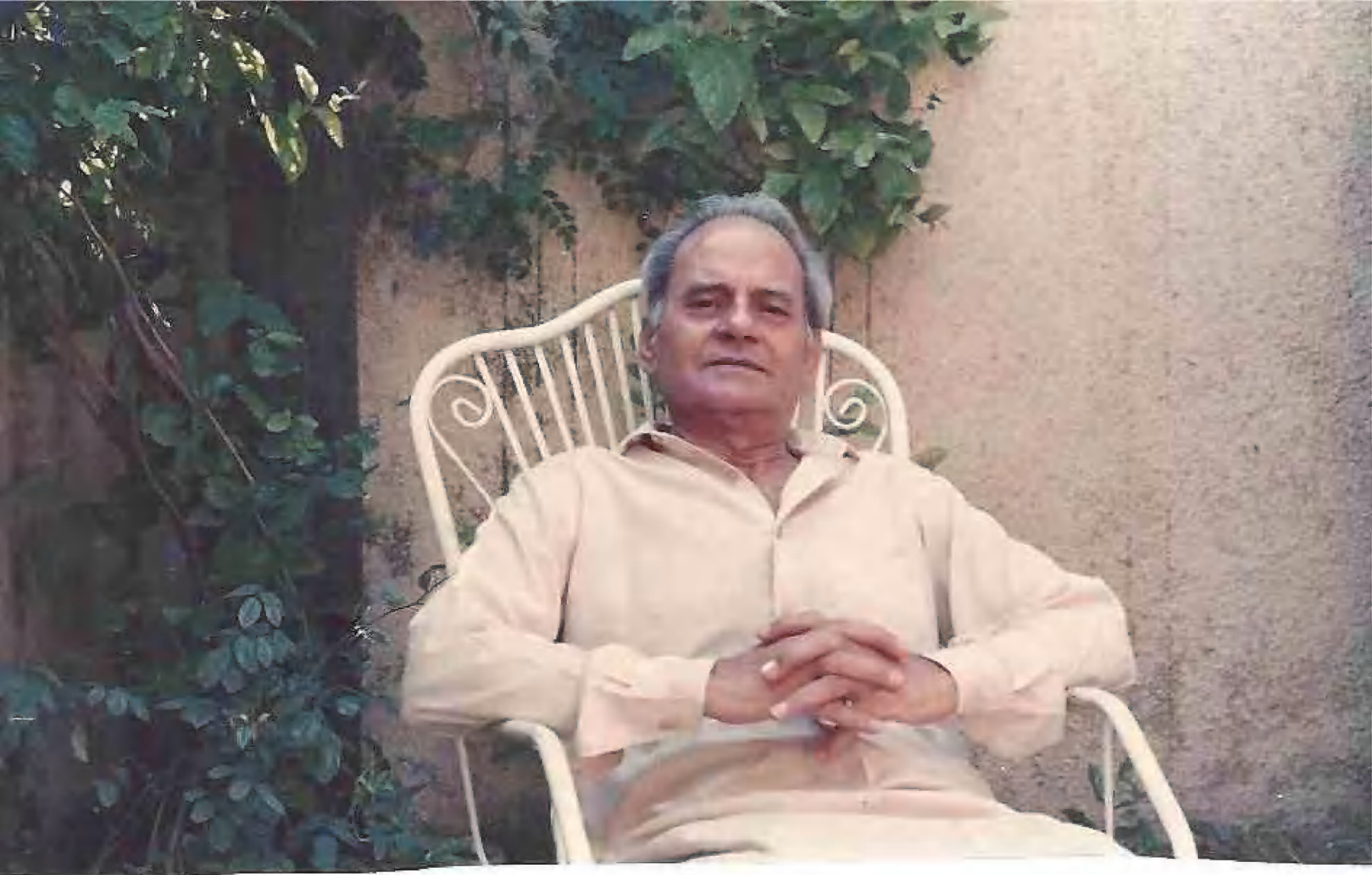




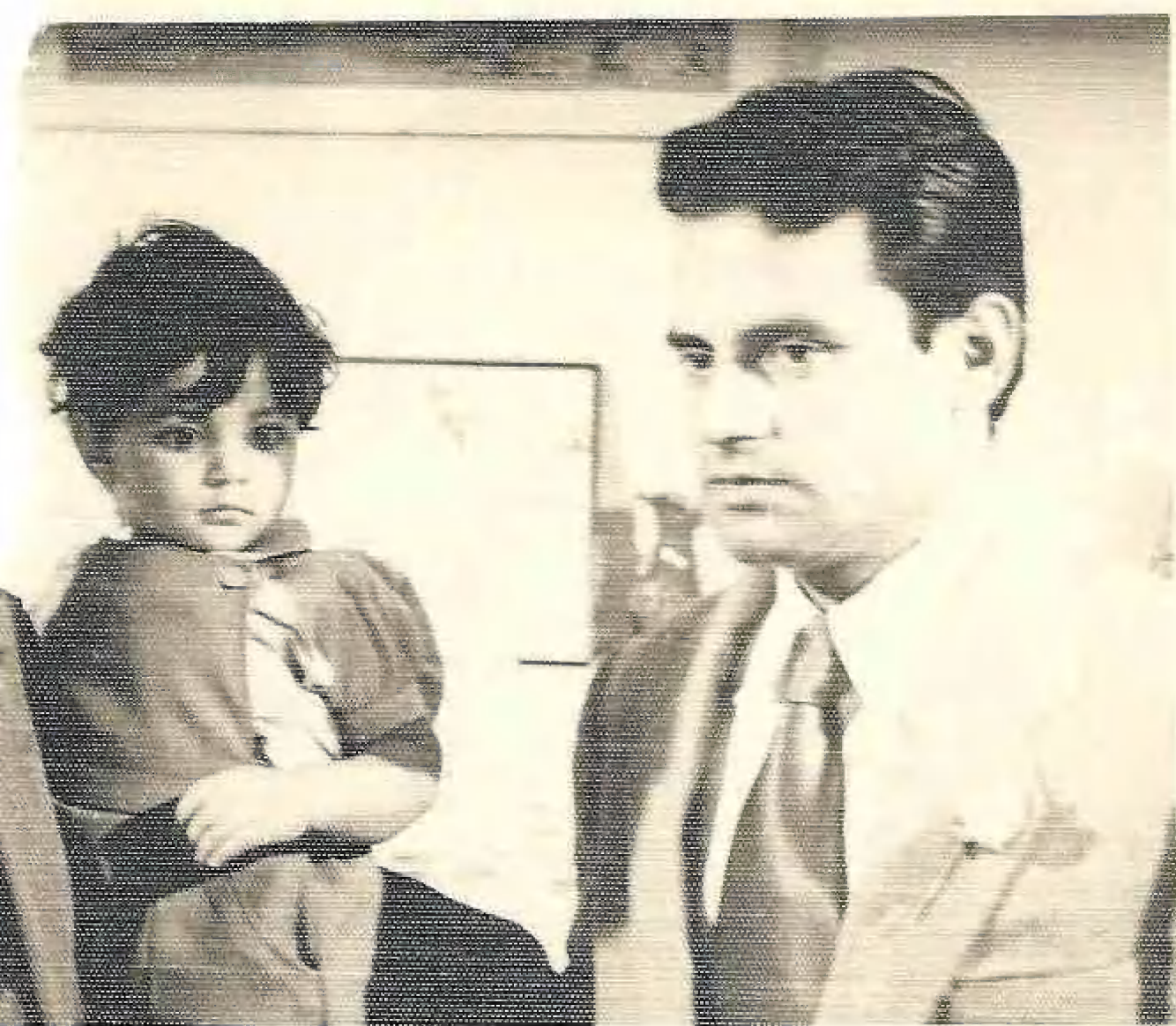
A Hameed













607.

A Hameed at his Residence,
Lahore-Taken By: Rashid Ashraf in
March 2007





(ساحرہ بیانی کے چہنچہ ہوئے اور کوٹ میں) اے حمید۔ احمد راہی۔ عبدالباقی عارف
(چینی پنچ ہوم کے باہر)

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

نیاں

مشرق اوسطی - جلد ۱۱

فہرست

- ۱۔ چند یادیں - چند باتیں
- ۲۔ امرتسر میں فساد کا پہلا شعلہ
- ۳۔ آگ اور خون کے گلاب
- ۴۔ امرتسر میں ۱۳ اگست
- ۵۔ امرتسر کا جیاناوالہ باغ
- ۶۔ امرتسر کا کمپنی باغ
- ۷۔ امرتسر کی ایک گلی
- ۸۔ امرتسر کی مسجدیں
- ۹۔ امرتسر کا رمضان المبارک
- ۱۰۔ امرتسر کی عید
- ۱۱۔ امرتسر کی ایک درگاہ
- ۱۲۔ امرتسر اور سیب کا درخت
- ۱۳۔ امرتسر کی ایک ہولناک رات
- ۱۴۔ امرتسر کے دانشور
- ۱۵۔ امرتسر کا ماسٹر نثار

۱۳

۲۷

۴۷

۵۶

۶۷

۸۸

۱۰۸

۱۱۶

۱۲۹

۱۴۱

۱۵۵

۱۶۹

۱۸۶

۲۰۲

۲۱۰

بند مت شریعت جاب

نور: ۱۶۸۸۱

انجمن ترقی اردو • لاہور • حمید شاہد

۱۰۰ اردو لکرا، ضلع لاہور

لاہور

لازم اعلیٰ:

لاکڑی سید عیسیٰ

حوالہ نمبر

۱۶/۵/۷۹

تاریخ

پیارے منصف عزیز دوست! حمید!

امرتسر کی مسجدوں پر پارا مضمون لکھنے والے

حمید کو میرا سلام پہنچے۔

کتنے پیاری تصویر کھینچی ہے آپ نے امرتسر
کی (قبل از پاکستان کی) ماسٹرٹ کی۔ یہ سکھوں

کا اور انگریزوں کا دور تھا کس قدر آباد

تھیں قریبہ کی بیٹیاں، کتنے اچھے امام صاحب

اور ان کے بیٹے جو آپ کے دوست تھے۔ قریبہ

کے حوالے نے تاریخ کے درتے کھول دیے جن سے

اس ملک کے مستقبل پر دھندلی دھندلی روشنی

— ذرے ذرے کچھ چمکتے ہوئے کچھ بجھتے ہوئے

۱۶۔ امرتسر کی میاں پوٹرو

۱۷۔ امرتسر کا ایک درویش

۱۸۔ امرتسر کا اسد جو

۱۹۔ امرتسر کا ایک گیٹ کیپر

۲۰۔ امرتسر کا ایک جواری

۲۱۔ امرتسر کا پروفیسر مندی

۲۲۔ امرتسر کے جن اور بھوت

۲۳۔ نور کبھی ہاتی جیک نہیں ہوتا

۲۴۔ الوداع مسجد کے میناروں

۲۵۔ امرتسر کی آخری جھلک

۲۱۹

۲۲۹

۲۳۸

۲۴۹

۲۵۷

۲۶۵

۲۸۰

۲۸۹

۲۹۳

۲۹۷

کمالنا
مستطابین
۱۳۰۶
عمران پور

۵۴
عبدالحامد اعظم بزرگ

۵۵
اسلام علیہ السلام

۵۶
پایام مبارک

بسم الله الرحمن الرحیم

حالیہ ہندو پاکستان ادب نمبر میں آپ کا افسانہ "ہرے باغ کا ارستہ" نظر آتا ہے۔ خوبصورت افسانہ ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

فقط
ایک پاکستان
گورنر الہ آباد

نظر آئے۔ اشارت نے جو طبیعت روشن کر دی،

پیرا احمد پھر جاگ اٹھتا مگر منہ بند ہے

تلم بھی جاگتا رہے گا یا نہیں۔ ماشی ایسی

شاہکار تحریری دوستیں اور لکھ ڈالے۔

شاید میرا جذبہ دل میرا پیغام آپ

پتہ پنجاب -

فصل

عبدالله

نسخه از کتاب کتب و خطبه

Handwritten text in Persian script, likely a manuscript or letter. The text is written in a cursive style and is mostly illegible due to fading and blurring. It appears to be a single page of text, possibly a page from a book or a letter.

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰

المرکز

کی یادیں

اے حمید

کی یادیں

اے حمید

چند یادیں۔ چند باتیں

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سرٹ سٹ سکول کے پہلو سے گزرتی، دائیں جانب بودی شاہ کے نیلے کو اور بائیں طرف پاتھی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہرے سبز چھاؤں والے باغوں کے بچوں بیچ ایک تنگ سا کچا راستہ جالندھر جٹالہ ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ، اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں باغ کی سیر کو جلتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا، آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا اور سفید پھولوں کو — لیکن یہ نہیں کہاں نکل آیا! کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک پل میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سرٹک گھوم جائیے۔ ایک طرف شیشم کے سایہ دار درختوں کی قطار قدر تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیلیا اور چیل کے پھولوں سے مہکتا باغ سرٹک کے ساتھ ساتھ دروازہ گھی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یو کلپس کے نو عمر چہرے درخت ہوا کرتے تھے جن کی لمبوتری پتوں والی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھٹکرتی تھیں۔

۱۴ اگست کی خون آلود۔ دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم افراتفری کے عالم میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پور کیمپ کی طرف بھاگے تو گورنمنٹ اسپورٹس ریلوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسلم بستی سے لٹختے دھوئیں کے بادلوں میں آگ کی سرخ زبانیں لپک رہی

سنگھ

یادیں

چند

تھیں اور اس باغ کے نو عمر پوکپٹس کے درختوں کی لمبی نازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت و جامہ نشیں جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دُور سے آمادیکھ کر اپنی شاخیں ہلا ہلا کر مجھ اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں۔ اپنی سونفنی خوشبو کی آواز میں میرا نام لے لے کر پکھا۔ اور جب میں اُن کے پاس گیا تو وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے یہ جنت کی تال تھی۔ ہمہ گیر، ہمہ ازاد ست، ہمہ تن گوش، کبھی نہ ٹھیلانی جانیوالی، کبھی نہ چڑھنے والی کبھی نہ یاد آنے والی جنت کی تال۔ کبھی نہ چڑھنے والی، کبھی نہ اترنے والی شراب کا نشہ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر باتیں کرتے رہے۔ اُس نے کہا۔

”تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟“

میں نے کہا۔

”سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ امرتسر تو مسلمانوں کے لیے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کراس اور سمن آباد میں کچھ پوکپٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی صبح دم جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور نیم روشن صحن میں ٹٹماتے تاروں بھرے آسمان سے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آیا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں۔“

پوکپٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہرانے لگیں اور۔۔۔۔۔

معاف کیجئے گا میں پھر اپنے موضوع سے بہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہاں۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اگلی سکھوں یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے

بُرج ٹھولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں نے اپنے گردوارے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومت پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جلسے ہوئے مرسکندر کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے لیکن کچھ نہ بجا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے کے سوراخوں سے گھی منڈی اور مہاں سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دُھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان جیرا مال والا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سرک نیچے کو اترتی ہے۔ کونے پر ایک مسجد ہے کتوال اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا آگے جا کر ہسلی آجاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں میں کہنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور گنگا مٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بقیعہ نورانی، اس کی نقائیں بیدم وارثی کے عارفانہ کلام سے گونجیں، وہاں دودھ کی نہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اُس کے برقی قمقموں اور ٹونٹیاں اتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جالے تن لیے۔ یہ درگاہ امرتسر کی بھاری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں اُن دنوں ایم اے اور اُنی سکول میں۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے دولت آگئی انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان بھی بتایا کرتی تھیں) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دُور دراز سے کارگیر مٹلوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لال نے وہاں بجلی کی ساری فیکٹ فوڈ کی۔ میں آج بھی چشم تصور میں اُسے پتھر کس دانٹھ میں دباؤں سے سیر می پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں۔ اگر وہ دلی اور کھٹو سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ فائوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا غالباً اُن کی تانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا اور تیسرا تعویذ اُن کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تھپتھپتے

میں کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ یہی تہہ خانے میں اتر گیا۔ چھوٹا سا لحد نما تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سینٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چمکتی برکیٹوں والے دو دھیا غبارہ منالبل لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گر میوں میں پھلتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں کہرا کرتا ہے جب کہ لاہور میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پرسکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امرود کے باغوں کے بیچ میں اگر بن گیا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی درخت کا سایہ نہ ہو اور پھولوں کا بیاگیندے کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ ہمیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی، بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ سو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چھوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں ندی کے ٹپا لے ٹنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے برسات میں ان نالوں میں درختوں سے ٹپکے ہوئے آم اور امرود ہوا کرتے جنہیں ہم وہیں کسی پتھر پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گھنگھور گھٹائیں برسیں اور ہم یہاں امرود کے درختوں پر چڑھے اور امرود پھل پھسائے امرود توڑ توڑ کر نیک کی جیبیں بھرا کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیر سے لوگ قبرستان جا کر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے۔ میں بھی اپنے چھوٹے کرٹس بجائی کے ساتھ مزدور جاتا۔ ہم لوگ گمی منڈی والے دروازے سے نکل کر کونے والی مسجد کے پاس آتے تو ہمیں سٹے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سرک کنارے گلاب کے پھول بیچنے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگیریں سُرغ گلابوں اور ان کی تیلیوں سے بھری ہوتیں۔ دو پیسے کے پھول لے کر وہاں میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دیکے ٹھنڈی سردی میں قبرستان میں داخل ہو جاتے ان دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بجاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹٹکتے تارے ندر دھورے

ہوتے تھے۔ چوٹی سی سرک کے دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیلائے بیٹھے، اپنی اپنی بولیوں میں خیرات مانگ رہے ہوتے۔ ان کے پیچھے امرودوں اور اناروں کے باغوں میں گھنٹ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے دھیمی اثر انگیز آوازیں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتی۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے۔ پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں ان کے آواں چہرے چرخوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں ابھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مٹی جون کی تپتی سفنان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور لکیر کے پیسے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پورے ایک نہر بہتی تھی۔ ادھر سے جو ہوا آتی اس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ حالانکہ ہر طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا ادھر یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پہلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قد آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا: امرتسر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ اس کے بعد درگاہ کے بارے میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفل سماع کی صدارت حضرت بیہم وارثی فرمائیں گے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آکر اپنی اپنی دکانیں سجالیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں بچھٹانا پڑے۔ قوالوں کا باقوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالو جان مرحوم یہ اشتہار چھوٹے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پورے کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر بولے۔

”میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔“

خالو جان ساٹھ پینسٹھ برس کے دیو قامت، بھاری بھر کم اونچے لمبے بزرگ تھے۔ لمبی ڈاڑھی کھلا گنڈی رنگ، لمبا کھدر کا کرتہ۔ کھدر کی دھوٹی، لال چمڑے کی جوتی، ہاتھ میں مونا عصا۔ بازار کبر واناں کی روڑاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریک خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب گھرانوں کو لے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کس مہر سی کے عالم میں واپس امرتسر آئے۔ کابل میں جہاں مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ بابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ بابر کے سنگ مزار پر لکھی ہوئی فارسی لکھی

بڑے جوش و خروش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ سیلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر غیریت معلوم کرنے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کشاکش کر گھر کے کسی فرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلمینگ روڈ پر راکتاتھا خالوجان کی پاٹ دار آقا ہر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

”بالو عبدالحمید۔“

خالوجان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ اُن میں ظرافت کی جس بڑی تیز تھی۔ بڑے لطیفے سناتے۔ بات کو خوب مزہ مسالہ لگا کر پیش کرتے۔ فلاسی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نو عمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر حاسہ پاک لگے اور عھا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”لو بھی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قفسہ سناتا ہوں۔ وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی جن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قدر بھاری جسم، رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفوں ایسا بھر پور چہرہ۔ لیکن اُس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ اُن کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے

”لو بھی دوستو! کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے اُن بچوں کو جو میرے پاس

قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن والو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے

میرے بدن پر ہلکی ہلکی ٹکیاں مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزہ آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے

بچے جاچکے تھے صرف عبدالرحمان نامی لڑکا میری پنڈلیوں پر ٹکیاں مار رہا تھا۔ حجرے

میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کر دو۔

اور تم بھی جا کر آرام کرو۔ عبدالرحمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بجا دیا۔ پس پھر

کیا تھا۔ میں وہیں اٹھ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان

گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو بولا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں۔ لو بھی دوستو

اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری انار لاکر کھلاتا ہے۔ پس

چٹکی بجاتا ہے اور سرنج قندھاری انار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

وہ کہے بارے میں بھی خالوجان نے میرے والد صاحب کو کھٹے لفظوں میں کہہ دیا۔

مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں لگائی ہیں۔ ہمیں شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالوجان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھاڑے اپنی نگرانی میں زردے بریانی کی دلیں دم کروا رہے تھے۔ مہنتی نائی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

”زردے میں سنگرتے کے ترنج ڈال دیئے؟“

”مہنتی! مجھے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے۔۔۔۔۔“

”بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک بُر کی چکھانا مجھے۔۔۔۔۔“

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کا سُن کر آئے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سینٹ کے پختہ ایک لمبوترے ٹینک کو کچے دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرد گرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹوٹیاں تھیں لوگ ٹوٹیاں کھول کر گلاس، پیالے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہر چلا دی۔ درگاہ کے سامنے سڑک کے کٹے ہوئے کھیتوں میں تمبوقتا میں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ قتلے تلے چارے تھے۔ جھولے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں اٹیاں باندھ کر تھیں مانگ رہے تھے۔ میں نے ایک حالی کی ٹنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر بچوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اُس قبر پر بھی جس کی لحد میں ابھی خواجہ صاحب دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ اُن کی خالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری، سارے رشتے دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتہ دار میں میں نے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ان بھنڈا را کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے

قابلوں پر وہ چُن چُن کر قورنے کی بوٹیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قناتوں کے پاس دریوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے نہڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آگیا۔ وہ لوگوں کو ٹکڑی مارنے لگا۔ کسی کے قابو میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چہ آدمیوں نے پکڑ کر اُسے رسیوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رسیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدم وارثی کو دیکھا۔ پُر سکون و بلا چہرہ ملائم چمک والی آنکھیں، نرد رنگ کی چادر اوڑھے اگلی قطار میں خاموش بیٹھے تھے۔ قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گارہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دونوں جو بن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تمبوؤں کے نیچے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ درسی کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آگیا۔ یہاں دالان کے کونوں کھدروں میں لوگ کھبل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جھاڑ فالو کس روشن تھے۔ بے شمار گر بقیاں سنگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے کوکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے منہ لگائے، آنکھیں بند کیے کچھ بڑبڑا رہی تھی اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دالان کے مغزلی حصے میں سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، متولی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھاتے اُدھر کو نکل گئے۔ ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ فوجہ صاحب گاؤں کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سرخ و سپید بارعجب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ دالے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانک کر تو ایک بھولی بھولی توہم والا موٹا تازہ آدمی گرم کشمیری شال کی ٹیکل مارے قالین پر اکیلا آلتی پالتی مارے بیٹھا زروہ اُڑا رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پچھوڑے چڑیا گھر کی طرف آگئے۔ دس بارہ مرے زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف خانوں

میں مور، تیتڑ، طوطے، کبوتر اور تین چار بہن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر وچھ میں ایک بڑا سائبب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جھگکے کے پاس آتا دیکھ کر بہن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی ہلکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آواز یہاں بھی آرہی تھی۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھگکے ہوئے درختوں کے گہرے سایوں میں قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آگئے۔

رات منجے کے بعد محفل سماع ختم ہوئی۔ خالو جان اپنا بھالے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگائے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا راستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چل رہا تھا اور دل کو اس خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالو جان ساتھ ہیں اور جین بھوت چڑیلیں اُن کی مطلع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا کسی وقت کوئی آواز نہ ملے لگتا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی اونچی آواز میں باتیں کر کے اپنے خوف کو دور کر رہی تھیں۔ لمبے ترنگے خالو جان موٹا عصا زمین پر بار بار مارتے، بار بار کھنکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا راستہ ختم ہوا اور ہم دروازہ گئی منڈی سے نکل کر بازار کبر و اماں میں آگئے لگے روز خالو جان نے ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھائی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل بلی پر بیٹھی ہے۔ اُس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیر اُٹھتے ہیں۔ دانست باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھپٹ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا السلام علیکم پیر جی! یہاں پہنچ کر خالو جان باقاعدہ اُٹھ کر چڑیل کی نقل اتارتے۔ ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر چہرے پر کجا جت بھری مسکراہٹ لا کر چڑیل کے سلام کرنے کا انداز بتاتے۔

”میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا: اونا مراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟
مجھے خبر نہیں کہ پیچھے میرے بچے آرہے ہیں، چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ
بھاگ! — اور چڑیل ہی ہی ہی ہی سلام پیر جی سلام پیر جی! کہتی اُلٹے
پاؤں بھاگ کر اوروں کے درختوں میں غائب ہو گئی۔“

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کر کے پسینے آ گئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا
کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔
عرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھینٹے اور پتنگ اڑانے درگاہ پر جایا کرتے تھے۔ باغوں
میں گھس کر کچے کپے اوروں توڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لا کر
دھو تے اور نمک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہر میں عام طور پر درگاہ پر ہی
گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر درسی بچا کر بیٹھ جاتے۔ روٹی کے بھورے کر کے چڑیوں
کو ڈالتے۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا کٹورہ پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آکر بڑی آزادی سے دائرہ دنگا
چیتیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چونچے ڈبا ڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتے
دادا جان بھی اُن سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پیتا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت
اُن سے باتیں کرنے لگتے۔ ہم دونوں بھائی گڈی میں ڈور ڈالتے۔ جب ہماری گڈی یا پتنگ سرسوں
کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھو
بنا کر اسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

شباباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے بائیں طرف کئی کھاتی ہے۔
درگاہ پر دو یا تین عرس ہی ہوئے تھے کہ اُس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستر
لے کر گھر میں داخل ہوا تو خالہ میری والدہ کے ساتھ رازداری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستر ایک
طرف پھینکا۔ چنگیر میں سے روٹی نکالی۔ مائڈی میں سے ایک آلو، ایک بوٹی نکال کر اس پر رکھی اور
وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ خالہ جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف والے
خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس
بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ محترمہ تھیں، اس لیے میں بھی فکر مند ہو گیا اور مجھے محسوس

ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوس ناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا، کیونکہ
درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے
خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری تو دھڑ سے نہ کر سکتے تھے۔ تیجہ یہ تبلا کہ لوگ حوض کی ٹونیاں اور دودھ
کی نہروں والے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ خانوس اتار کر
خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچاتے تو لوگ وہ بھی اتار کر لے جاتے۔ سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، فرائضی
اور متولی کے جالی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے۔ چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اُلٹ گئے۔ عورتوں
کو قبرستان کے جنگلی بٹے کھا گئے، کیونکہ اب رات کو اُن کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب
کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں بہن کھول کر گھر لے گیا، دروازے کا پھینکا بھی محال تھا۔ میں کبھی اُن کے گھر
جاتا تو وہاں دالان میں سناٹا چھایا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا جالی دار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں
پرانے دکنویں صوفوں اور مسہریوں، قدیم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنئی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں
کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور آوازیں گونجا کرتی تھیں ادب و ہاں خاموشی طاری تھی۔

ایک روز دوپہر کو میں ڈور پتنگ لے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں
پیلی پیلی سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے صحن میں ویران مقبرے کے پاس درسی کا ٹکڑا بچھائے دادا
جان اُسی طرح بیٹھے چڑیوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی اُن کے کندھوں
سراور زانوں پر آکر بیٹھ رہی تھیں۔ اُن کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں اور دادا جان
ہنس ہنس کر اُن سے تو لگی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ
نشین کے اُجڑے ہوئے ٹھنڈے سچ کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور
کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں موٹی تھی۔ وہ خشک موٹی سے تنور کی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر
کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے ہیں لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں
کے سامنے ہے۔ یہ وہ سجادہ نشین تھا جو عرس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے طشت
بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اس کا چہرہ بھرا بھرا گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ
اُتر گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں نجد سے فاصلہ بڑھا تھا۔ میں ڈور اور
پتنگ ہاتھ میں لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی

کے خشک نوالے لنگ رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اڑتی ہوئی دادا جان کے کندھے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آگے بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ ہلکا نہیں کرتے تھے۔ میں نے دادا جان کو دیکھا تو وہ بہت بے بیٹھے تھے اور بوڑھی لکڑیوں سے چڑیا کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندنی چونچ اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز باغ میں — اُس باغ کے حسین ترین درختوں میں — شگاف پانیوں والی نہروں کے کنارے اُن دیکھے پھولوں کی وادیوں میں اور —

”تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

درگاہ کے عرس، اُس کی رونقیں، اُس کی روشنیاں بجھ گئیں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گہریاں دوڑتی پھرتی اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک دیوان خانوں میں ٹلکتے جالوں والی چیتوں کے نیچے ٹنگ چرس، بھنگ پی کر سوئے رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بٹنا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ امرتسر کو بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر کے اپنے نئے شہر نئے وطن میں آ گئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جالندھر میں پاکستانی ہائی کشن کی جانب سے ایک زبردست مشاعرہ ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جالندھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ چلو اسی بہانے امرتسر کے کپنی باغ، ریاٹو سینٹر، ٹینگو پارک اور دروازہ وہاں سنگھ کے باہر والے باغ کے یو کلیٹس کے درخت سے ملاقات ہو جائے گی۔ جاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جالندھر چلے گئے۔ والہی پر جالندھر سے امرتسر آتے ہوئے بس تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اُتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

”اے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟“

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

”یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستہ کیسے بھول سکتا ہے؟“ میں جانے کتنی دیر سگریٹ پیتا،

دیران اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ نہان سنگھ حد مارے والے یو کلیٹس کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں تیسرے پہر میں بڑج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اُتر گیا۔ قبروں پر بل پھر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگر بقیان لگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں کمنی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر نئے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے باغ اُڑھ گئے تھے، کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ میں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ہاتھ پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اس کھائی کا پل آدھاڑے گیا تھا اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو ناشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگ مرمر بارہ در کی بنی ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت قبر مرحوم کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگ مرمر پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُڑھے ہوئے قبرستان میں یہ سنگ مرمر کی بارہ در کی والی قبر چوں کی تول موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ والان۔ نہ چوڑہ نہ مکرے، نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ۔ میری آنکھوں کے سامنے گنبد کی آویھی دیوار تھی جس پر تھا پیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹادھاری سادھو بیٹھا، انگ بھبھوت رہائے چرس کے سونے لگا رہا تھا اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آگ اور متوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں — پلٹے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان در کی

پر اٹھتی پاتنی مارے بیٹھے چڑیوں کو بھورے ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے، اور جب کوئی چڑیا ان کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی دامان نہیں تھے، لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گھبر، شیشم کے پتوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

امر تسر میں فساد کا پہلا شعلہ

ابھی امر تسر کو آگ نہیں لگی تھی۔

ابھی امر تسر زندہ تھا۔ اُس کے گلی کوپے زندگی کی ہنگامہ آرائیوں سے بھر پور تھے۔ اسکی رگوں میں حسن اور زندہ دلی کا خون گردش کر رہا تھا۔ اُس کے باغوں میں کھلے ہوئے گلابوں پر کوئی رات کو شبیم گرا کرتی اور باغوں میں ہو کر گزرنے والی نہروں میں ٹھکی ہوئی ٹہنیوں کے ٹوٹ کر گرے ہوئے امر و ترا کرتے۔ ابھی امر تسر کو آگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امر تسر کی مسجدوں کے دو جہا گنبد سنہری دھوپ میں چمکا کرتے اور کمپنی باغ والی نہر کے کنارے پر وہ مکتب کے غوت میں ناشپاتی کے درختوں پر مارچ اپریل میں سفید اور گلابی شگوفوں سے شاخیں جھک اٹھتیں تحصیل پورے والی مانی کی بیری موٹے اور بیٹھے سیو بیروں سے لہ جاتی اور ہم روڑے مار مار کر بیر گراتے اور جب مانی گالیاں دیتی باہر نکلتی تو بھاگ جاتے۔ ابھی مال بازار والی مسجد خیر الدین میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور اُس کے صحن والے تالاب میں نہری اور سُرخ مچھلیاں وضو کرتے نمازیوں سے چھپیں کیا کرتیں اور بوہڑ والی مسجد کے باہر جمعہ کی نماز پر ایک طرف بکلی والے چوک اور دوسری جانب بھائریاں والی گلی تک صفیں بچھ جاتیں۔ مسجد جان محمد کے خراب ابھی سلام بابا کے پُر جوش خطبات کے گونج رہے تھے اور سکری باغ کی نقادوں میں عید میلاد النبی کے پُر شکوہ جلوس کے سبز و سُرخ ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔ رمضان کے مہینے میں پچھلے پہر امر تسر کے گلی کوچوں میں بگانے والے دھول تاشے بجاتے آیا کرتے اور نعت خوانوں کی ٹولیاں گیس اور لائٹیں اٹھانے نعتیں پڑھتی گھوما کرتیں۔ عید کی صبح رنگ برنگ غباروں، بچوں کے معصوم تہنوں اور

گرما گرم سیویوں کی خوشبو اور ننھی ننھی بچیوں کے لال پیلے گوڑے گے آنچلوں کے ساتھ طلوع ہوتی۔
گلی گلی بچے غبارے اڑاتے، بابے بجاتے نکل آتے اور آلو کچا لوٹنگلیاں اور اٹلی چورن پیپنے
والوں کی چھا بڑیوں کے آگے بیٹھ جاتے۔ چوکوں میں علوانیوں کی دکانوں پر شامیانے
تن جاتے اور قسم قسم کی مٹھائیوں کے بھرے ہوئے مقال تحت پوشوں سے لے کر
چھت تک بچ جاتے۔

ابھی امرتسر گواگ نہیں لگی تھی۔ ابھی امرتسر زندہ تھا اور ہر جہرات کو فتح شاہ بخاری
کے مزار پر تارکی کا لنگر بٹاتا تھا اور شکر شاہ کا پُر جلال مقبرہ گیندے اور گلاب کے پھولوں
سے جھک رہا تھا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں مسلمان لڑکیاں ہندو سکھ لڑکیوں کے
ساتھ بیٹھ کر سبق یاد کر رہی تھیں اور فرنیچر میل کا دیوہیکل سیاہ انجن دھوئیں کے بادل
چھوڑتا دھک دھک کرتا امرتسر شیش سے نکل کر میٹھیوں والے پل کے نیچے سے
گزر رہا تھا اور بوڑی سائیں کے تکیے میں مجرم زمرہ کی انگوٹھیوں سیاہ لمبے بالوں اور سرخ
آنکھوں والے فقیر گھڑے کی تال پر اپنی درو بھری آواز میں گار رہا تھا۔

قیر بدل جو آئے ہیں

دھوئیں میرے دل والے۔ اسماناں تے چھائے ہیں

اور اکھاڑے میں پہلوان اور کٹر، میاں سنگھ اور تحصیل پورے کے نوجوان زور کر
رہے تھے اور دروازہ گھی منڈی والے قبرستان میں لوگ قبروں پر پھول ڈال کر فاتحہ
پڑھ رہے تھے اور انجن پارک کے جلے میں کلاہ، اچکن اور سفید براق ڈاڑھی والے
مولوی ہمدانی اپنا نورانی چہرہ لئے، گے میں پھولوں کے ہار ڈالے کرسی صدارت پر
بیٹھے تھے اور الیگزینڈرا پارک اور میٹنگ پارک میں ڈی اے ڈی کالج اور ایم او کالج
کی ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ مروت شاہ باولنگ کر رہے تھے اور
ہمارے دینیات کے مولوی صاحب دم پڑھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، ہل بازار
والی میوہ منڈی میں مسلمان آرٹھتی خریداروں کے شور میں بھی کھاتے کھولے کا رو باد
میں معروف تھے۔ بازار سان سنگھ میں کالا عمرو کی دکان پر اونچا لمبا اسد جو جھوم جھوم

کر قلعے تانے اور گردے لگا رہا تھا۔ کالا عمرو پانی والے بینڈ پیپ کے پاس کھڑا
اوپر منہ کئے اپنے لڑکے بشیر کو آواز دے رہا تھا کہ اپنی آپوسے کہے کہ سما وار نیچے بھجوا دے۔
ابھی امرتسر میں کشمیریوں کے سما وار نکلیں چائے اور گرم قبوے سے ٹھک رہے
تھے اور قائد روڈ کی دکانیں، باقر خانیوں، اراروٹ، شیر مال، کھنہ قلموں ٹکیوں قلموں
اور ورق لگی روغنی روٹیوں سے جی ہوئی تھیں۔ ابھی اس شہر بے مثال کا دل امرتسر کی کشمیریوں
کے کچر اور تہذیب کی گرنی سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی آگ جو گھروں کے چولہوں میں جلتی
تھی اور اس آگ نے گھروں، محلوں، بازاروں، مسجدوں اور پورے شہر کو اپنی لپیٹ
میں نہیں لیا تھا۔ گرمیوں کی شام کو کمپنی باغ والی ٹھنڈی کھولی پر مسلمانوں کا ہجوم ہوتا۔
پردہ بارغ میں مسلمان بچیاں، لڑکیاں اور عورتیں جھولتیں اور نوجوان بھری ہوئی،
نہروں کے ٹھنڈے پانی میں چھلا لگیں لگاتے۔ جھیل روڈ والے دو رویہ گھنے درخت کالی
کالی مینھی جامنوں سے لد جاتے اور نہر پار والے باغوں کی فضا میں آم، ناشپاتی، لکڑ
اور امرود کی دھیمی دھیمی خوشبوؤں سے لبریز ہو جاتیں بازار رام باغ والی مارکیٹ حکم
سنگھ کی تنگ گلی میں، آسنے سامنے کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل میں امرتسر
ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں کی محفلیں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ تمام چینی
کی پرائی زرو چکیوں میں پکی ہوئی چائے کے دور چل رہے تھے۔ کامریڈ ہوٹل کے
انگلیٹھیوں کے پاس بورے کی گدی پر بیٹھا سرخ و سپید خلیفہ بڑی چٹک میں چائے
کو بار بار جوش دے رہا ہے سامنے ترک ہوٹل کی گدی پر امرتسر کی سیاسی تاریخ کی نامور
شخصیت صوفی غلام محمد ترک براہاں ہے۔ صوفی صاحب گردن گھما کر غازی عبدالرحمان سے
کسی سیاسی مسئلے پر بحث بھی کر رہے ہیں اور چٹیک کے کھولتے پانی میں چائے
کی پتی بھی ڈال رہے ہیں۔ ساتھ والے ہوٹل میں الہ دیا تھاں میں چٹیک اور پیالیاں
رکھ کر لوگر کو آواز دے رہا ہے۔

”پل بے پخیر ہے۔“

یہ تینوں چائے خانے چوک گول ہٹی سے دروازہ رام باغ کو جاتے بازار کی

بغلی لگی میں تھے۔ چھتیں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ بوسیدہ بنچوں کے درمیان میں دو تین لمبی میزیں رکھی تھیں جن پر چائے، پان اور سگریٹوں کے جلے ہوئے نشان تھے۔ یہاں صبح سے رات کے دو دو بچے تک چائے کے دور چلتے اور افلاطون سے لے کر برٹینڈرل اور ولی دکنی سے لے کر اقبال تک گرم بجشیں ہوتیں۔ آئیے آپ کو صوفی ترک ہوٹل کی ایک محفل کی جھلک دکھائیں۔ یہاں سیف الدین سیف نے اپنی محفل سجا رکھی ہے۔ ایک طرف موٹی موٹی نشیلی آنکھوں والا دُبلّا پتلا نازک احساس شاعر علا الدین کلیم گرم کشمیری مثال اوڑھے سگریٹ سدا رہا ہے۔ دوسری جانب فلک شگن قہقہے لگانے والا اور ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ پوٹ ہو جانے والا خوش گوش شاعر اقبال کوثر بیٹھا سیف کے کسی شعر پر سروصن رہا ہے۔ سامنے احمد راہی اور اسے حمید بیٹھے کسی بات پر ہنس رہے ہیں۔ سنہری داڑھی اور لمبے لمبے سنہری بالوں والا ظہیر کشمیری بھی یہیں بیٹھا تھانیر لب مسکراتے ہوئے چائے کی چکیاں لے رہا ہے اس کے سامنے ممتاز لغت گو شاعر چاچا عیسیٰ بھی طرہ نکانے کرسی پر اکڑوں بیٹھا پان چہا رہا ہے۔ لیجئے خوش وضع اور خوش گفتار شاعر شہزاد احمد شہزاد اور صلاح الدین ندیم بھی آگئے۔ آتے ہی دوستوں سے دوچار چلیں ہوئیں۔ اور ہنستے مسکرتے بیٹھ گئے۔ اب عارف عبدالمیتیں بھی صوفی کریم کے ساتھ نیلی شال اوڑھے پہنچ گئے ہیں۔ کونے میں پنجابی شاعر معراج دین اختر، استاد محبت اور ناظر وغیرہ بیٹھے ہیں۔ بھاری بھر کم سیاسی لیڈر گلشن بیٹھا کسی بات پر ہنس ہنس کر رشید عینکوں والے سے ہمکلام ہے۔ گنگوہی لے چکیلے نسواری بالوں والا رشید اب سیاست پر بے لگان بولتا ہے۔ ظرافت اور بذلہ سخی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ سنہری فریم والی عینک کے شیشوں میں گول گول زندگی سے بھر پور آنکھیں بے قراری سے چمکتی رہتی ہیں۔ لطیف سناکر، محفل کو لوٹ پوٹ کر کے بڑا پکا منہ، بنائے عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتا ہے اور کنکھیلوں سے دائیں بائیں دیکھ کر پھر زیر لب خود بھی مسکرانے لگتا ہے۔ کامریڈ ہوٹل میں سرخ و سفید، ادھر عمر زمین اور دھن اسٹاؤنڈلش کشمیری اپنے چہتے شاگرد منبٹ قریشی کے ساتھ بیٹھے

منطق، فلسفہ، عروض اور بیان پر بحث بھی کر رہے ہیں اور پنجابی شاعر استاد محبت پر پھبتیاں بھی کس رہے ہیں۔

متھ۔ تو بھیاں دیاہ سبجان اللہ

ادھر دن متھے اور دھر گنڈ پے گئی

تن سیر روپے دے چاؤل آئے

پنچ سیر کئی آوتے کھنڈ پے گئی

ننھو بھی جوڑے کے پٹھاں ورتاؤں لے

جدھر کھنڈ لگی اور دھر ڈنڈ پے گئی

سیف الدین سیف اپنی تازہ کہی ہوئی طویل نظم "ساربان" میں سے کچھ بند سنانے کے بعد اپنی سلگتی پُر سکون نیم وا گرم آنکھوں سے باہر لگی میں تک رہا ہے اور ایک ہاتھ میں سگریٹ سلگائے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں آہستہ آہستہ اپنی باریک مونچھوں کے کونوں پر پھیر رہا ہے۔ اب صدیق کلیم بھی بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ سست قدم اٹھاتے آگئے ہیں۔ چاچا عیسیٰ نے آواز لگائی۔

۔ صوفی صاحب چائے اور آئے گی۔

اور صوفی ترک نے دہکتے کونوں پر تام چینی کی ایک اور چینک رکھ دی ہے۔ کلہریڈ ہوٹل کے پھٹے پر ادھیر عمر کا بھاری بھر کم حوالہ رفضل آکر بیٹھ گیا ہے اور خلیفے سے تیز چلنی والی چائے بنوا رہا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے وہ ایک چھٹانک افیم ادھر سیر حلوسے کے ساتھ روزانہ کھاتا ہے۔ الہ دے کے ہوٹل میں چاق و چوبند، تیز و طرار امرتسر کار جزگو شاعر نفیس خلیلی آگیا ہے اور تمباکو والا پان منہ میں دبائے دینے جہالتی حاجی حرامدے اور جیرے گوئے کو اپنا تازہ کلام سنار رہا ہے۔

جہاں جا کے جھنڈے کو گاڑا وطن ہے۔ جہاں شیر ناگہاں دھاڑا وطن ہے

وطن ہے مجاہد کے پاؤں کے نیچے۔

موٹی آنکھوں، تیکھی ناک اور زنانہ چال ڈھال والا جیرا گویا نفیس خلیلی کا تیش

کلام سن رہا ہے اور واہ واہ کر رہا ہے۔ حاجی حرامہ اپنی کافی آنکھ سے پانی پونچھتے ہوئے نفیس خلیلی پر پھبتی کہنے کو پرتول رہا ہے۔ دنیا جہالتی بھری بھری مونچھوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے بڑے غور سے شعر سن رہا ہے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے کالے پمپ شو والا پاؤں ہلاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کئے اس فکر میں ہے کہ خلیلی کے کس شعر پر اعتراض کرے۔

اب بچپن ساٹھ کے سن کا چوڑا چکلا، راجپوتی شان کی سفید گچے دار مونچھوں اور چکیلی آنکھوں والا ایک بزرگ سلیٹی شیروانی پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے کامریڈ ہوٹل میں داخل ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر مغل بادشاہوں کے شاہی چوہداروں کا خیال آتا ہے ان کا نام شیخ حبیب ہے۔ غالباً پٹیا لے کے ہیں۔ موسیقی پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ پوپے منہ والے کالے بھنگ مشہور ربانی استاد فیروز کے پاس جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ استاد فیروز کو امرتسر کے بے مثال فارسی شاعر استاد کی فارسی غزلیں زبانی یاد ہیں جنہیں وہ اپنی خشک و پرسوز آواز میں لہک لہک کر گایا کرتا ہے۔ خود بھی روتا ہے۔ اوروں کو بھی رلاتا ہے۔ وہ درد بھری آواز والے، وہ آنکھوں سے محبت کے اتمول موتی گرانے والے لوگ کہاں چلے گئے؟ امرتسر کو آگ لگ گئی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ محفلیں اجڑ گئیں۔ پھول مڑھاکر سوکھ گئے۔ ڈالیوں سے ٹوٹے پتوں کو ہوا اڑا کر لے گئی۔

اب کے بچھڑے کہاں میں گئے؟ - دور پڑے ہیں جا۔

لیکن ابھی تو خلیفے اور صوفی ترک کے ہوٹل میں یاروں کی محفلیں سبھی ہیں۔ نفیس خلیلی انقلابی شعر سنانے کے بعد لطیفے سنا سنا کر فلک شکاف قہقہے لگا رہا ہے ترک ہوٹل میں علا الدین کلیم کے بعد اقبال کو ترنم سے شعر پڑھ رہا ہے۔ چوک والی دکان سے پانوں کا تھاں بچ کر آگیا ہے۔ چائے خانے کی فضا پانسنگ شو، قینچی ٹاؤن ٹاک۔ پلیئر زنیوی کٹ اور کیپشن بیگم کے دھوئیں سے بھر گئی ہے۔ اب ماسٹر ابراہیم اور ماسٹر حبیب بھی آگئے ہیں۔ دونوں بڑے گہرے دوست ہیں ضلع

اور پھبتی نوک بزدبان رہتی ہے۔ بازار والے حمام کے ایک خوش شکل نو عمر کارگر سے دونوں پیار کرتے ہیں اور ہر روز اسی سے جا کر ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ ایک روز سیف نے مذاق کیا تو ماسٹر حبیب نے کہا۔

”سیف صاحب! معاملہ الٹ ہو رہا ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم اس کی شیو بنائیں الٹا اس سے ہمیں شیو بنوانی پڑتی ہے۔“

لیجئے۔ بابو غلام محمد بیٹ اور شریف متین کی جوڑی بھی آگئی۔ بابو غلام محمد بیٹ کا ہال بازار کی ایک گلی میں قالینوں کا کارخانہ ہے اور شریف متین قالینوں کی لکھنئی کرتا ہے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا غالباً سکرٹری بھی ہے۔ درمیانے قد اور لمبو ترے چہرے والا گول مٹول بابو غلام محمد بیٹ بڑا جذباتی اور ہنس مکھ ہے۔ عروض منطق اور فلسفے پر لمبی لمبی بحثیں کرنا اور گونگو گوشت کھانا اسے بہت مرغوب ہے سیف اور ضبط سے اس کی بحث کسی کئی روز جاری رہتی اور مجھے یاد ہے ہیکل کی جدلیات کا ذکر بار بار آیا کرتا۔ اقبال کو ٹرکے لطیفوں پر وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ فارسی، اردو یا انگریزی کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی ہے بحث کرتے ہوئے آنکھوں میں ہلاکی چمک آجاتی ہے بحث علمی مسائل سے نکل کر ذاتیات کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے ہونٹوں سے جھگ اڑنے لگتا ہے۔ طبیعت میں شوخی اور شجاعتی دونوں اعتدال کی حد میں ہیں۔ قالینوں کے نقشے بنانے میں بھی وہ ایک ماہر نقاش ہے۔ ایک بار اس کے کارخانے میں سمرقند کا ایک قالین آیا جس پر میکیم گورکی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بابو غلام محمد بیٹ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا ایک ایک مربع ٹکون اوڑھ کر دیکھی۔ پھر کتاب میز پر رکھی اور سگریٹ کا لمبا سونٹا لگا کر چٹکی سے گل جھاڑتے بولا۔

”میں اگر قالین پر جناح کی تصویر بنوا کر سمرقندیوں کو نہ دکھاؤں تو بابو غلام محمد

بیٹ نہ کہتا۔“

اور اسی روز اس نے پرانے میز پر موٹے کاغذ کا تاؤ پھیلا کر کالی سیاہی سے قالین کا متن تیار کرنا شروع کر دیا۔

کامریڈ ہوٹل اور ترک ہوٹل کی یہ زندگی سے بھرپور محفلیں رات کے بارہ ایک بجے تک جی رہتی ہیں۔ یہاں بنگال کے دیہشت پسندوں، تلنگانہ کے اشتراکیوں، امرتسر کے نیلی پوشوں، احراریوں، مسلم لیگیوں اور پٹیا لہ گھرانوں کے گائیکوں، رام باغ کی طوائفوں، کٹرہ کنہیا کی رقاصاؤں اور شہابو کے فالودے تک — ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ آغا شہر والی داری کا مکان قریب ہی ہے۔ اس کا ذکر ہوتا ہے تو ماسٹر فیروز رگیں پھلا لیتا ہے اور بھیکم پرنگیا کھیل کا کوئی منظر اس طرح سناتا ہے کہ محفل پر وجد طاری ہو جاتا ہے، ترک ہوٹل کے دروازے پر لکڑی کے آدمی کی طرح چلتا اونچا لمبا، ڈبلا خوش شکل، بے باک رشید لمبو نمودار ہوا ہے۔ خوب شور مچا کر بولتا ہے اور گے پیچھے جھول جھول کر قہقہے لگاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی خورشید کم گو اور اکرم مزاج ہے۔ دونوں پاؤں میز کے کنارے پر ٹیکا کر کرسی پر بیٹھتا ہے۔ پنڈلیوں پر سے دھوتی کھسکا لیا کرتا ہے اور مٹھوڑی مٹھوڑی دیر بعد رگڑ رگڑ کر موٹھھی ہوئی پنڈلیوں کو رد مال سے جھاڑتا رہتا۔ بہت کم بولتا ہے۔ جب بولتا ہے کفن پھاڑ کر بولتا ہے اور جملے کا لٹھ گھما کر ملتا ہے۔ اس کی بیٹھک میں انیسویں صدی کے مصوروں کے بڑے شہکار آویزاں تھے جو فسادات کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔ اور امرتسر میں فسادات کی آگ کا پہلا شعلہ گول ہٹی سے بلند ہوا تھا۔

گول ہٹی ہال بازار سے کٹرہ کنہیا کی طرف مڑتے ہوئے کونے والی تین کاناں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں دکانیں موٹے تازے، گول مٹول تین سیکھ بھائیوں کی تھیں۔ دو دکانیں منہابی کی تھیں اور ایک دکان پر عمارتی روغن، سپرٹ اور تارپین کا تیل فروخت ہوا کرتا تھا۔ یہ تینوں سیکھ امیر تھے اور ان کی دکانیں مال سے بھری رہا کرتیں۔ منیاری کی دکانوں کے آگے چھڑے کے بیلٹ، اذار بند پراندے اور تلواریں کرپائیں لٹکی رہا کرتیں فروری ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دن تھے۔ پاکستان کی حمایت میں اور ہندو سیکھ پاکستان کے خلاف جوس نکال رہے تھے۔ فروری کے اخیر میں یا غالباً مارچ کی پہلی دوری کو ماسٹر تارا سنگھ نے لاہور اسمبلی ہال کے باہر تھوڑا لہرا کر اعلان کیا کہ سیکھ

پاکستان نہیں بلکہ مسلمانوں کا بھارت میں قبرستان بنائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ امرتسر کی فضا میں بھی بے حد کشیدگی پیدا ہو گئی۔ غالباً مارچ کی تیسری یا چوتھی تاریخ تھی۔ ٹاؤن ہال والے باغ میں موسری اور کھٹے کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دوپہر کے بعد میں دکان سے حسب عادت دو دھڑپی کر دھوتی قمیض اور سیلپر پہنے ترک ہوٹل جانے کے لیے ہال بازار میں آگیا۔ میں نے اُن ہی دنوں کا لزوری کا ناولٹ "سیب کا درخت" پڑھا تھا اور سیب کے شگوفوں، موسیقی، لمبوں کی کلیوں کی جھلک اور سلیک فارسٹ کی سرسبز ڈھلوانوں پر اگنے والے سویٹ پیسز کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ اڑا کرتا اور تصور ہی تصور میں اس نیلے سرو چشے پر پہنچ جاتا جس کے اوپر سیب کے گھنے درخت کا سایہ تھا اور جس کے برقاب میں ڈوب کر خیال پرست رومانی لڑکی میگن نے اپنے بے وفا محبوب اشٹریٹ کی یاد میں جان دے دی تھی۔ میں سیب کے گلابی شگوفوں کو چومتا، غم زدہ میگن کو یاد کرتا پانگ شوگرٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے ہال بازار میں سے گزر رہا تھا۔ امرتسر کی فضا میں کشیدگی ضرور تھی۔ مگر ہم امرتسر والے اس کے عادی تھے۔ کیونکہ قریباً ہر غم پر ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا تھا اور پلٹے ہمیشہ مسلمانوں کا بھاری رہا کرتا۔ چنانچہ امرتسر کے مسلمان بڑے مطمئن اور بغیر کسی خوف کے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں جب سکندر خان کی اونچی مسجد سے گزر کر گول ہٹی والے چوک میں آیا تو پیچھے سے ایک تانگہ آکر چوک میں رُک گیا۔ اس تانگے میں تین پیلی گڈیوں والے اکالی سیکھ بیٹھے تھے۔ پیچھے ایک نوبت رکھی تھی۔ ایک اکالی نے دھما دم نوبت پٹنی شروع کر دی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے۔ گول ہٹی والے سیکھ بھائی بھی اپنی اپنی گڈیوں پر کھڑے ہو گئے۔ نوبت بجنی بند ہو گئی۔ اب تانگے کی اگلی جانب سے ایک ہٹاکٹا اکالی سیکھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کھلے اور اشتعال انگیز لفظوں میں کہا کہ ماسٹر جی نے لاہور میں اعلان کر دیا ہے کہ سیکھ پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ مسلمانوں کا پاکستان نہیں قبرستان بنے گا۔ گورو دے پیارو! اٹھ کھڑے ہو جاؤ اور اس گورو کی نگری کو مسلمانوں سے پاک

کر دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس اکالی سکھ نے مسلمانوں کے خلاف انتہائی زہریلی اور اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ وہ بمشکل کوئی ڈیڑھ ایک منٹ بولا ہو گا کہ رام بارغ والے بازار کی جانب جو مسلمان نوبت کی آواز سن کر جمع ہو گئے تھے انہیں اللہ اکبر کا فلک شکاف نعرہ بلند کیا۔ اس کے جواب میں اکالی سکھوں نے مست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ میں گول ہٹی کے آگے نکلے کے پاس ٹھہرا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے گول مٹول سکھ نے دکان کے آگے ٹپکتی ہوئی تلواریں دونوں ہاتھوں سے جھٹکا دے کر کھینچیں اور تانگے میں کھڑے اکالی سکھوں کی طرف اُچھال دیں۔ جو تلواریں اور کمر پائیں سونت کر مسلمانوں پر پل پڑے۔ میں وہاں سے بھاگ کر خراسیوں والی گلی میں آ گیا۔

یہ امر تسر شہر کے مسلمانوں پر سکھوں کا پہلا مسلح حملہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس سوئے زور بازو کے اور کچھ نہ تھا۔ کسی نے دکان پر سے بٹہ اٹھایا۔ کسی نے ساٹھان کا بانس کھینچا اور کمر پانوں تلواروں سے مسلح سکھوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔ کچھ مسلمان زخمی ہوئے۔ بہر حال پولیس آگئی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم تھی کہ گول ہٹی والوں نے اکالی سکھوں کو مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے لئے تلواریں دی تھیں چنانچہ اسی رات رام بارغ چوک فرید اور گلی خراسیاں کے نوجوان مسلمانوں نے گول ہٹی والی تینوں دکانوں کو آگ لگا دی۔ یہ امر تسر میں فساد کی پہلی آگ تھی۔ فساد کا پہلا شعلہ تھا جو نصف شب کے بعد تک اچانک بھڑک اٹھا۔ نے اپنے گھر کی چیت پر کھڑے ہو کر آگ کے سرخ و زرد شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وارنش اور سپرٹ سے بھرے ہوئے ڈرموں کے دھماکے کے ساتھ پھٹنے کی آوازیں بلند ہوئیں تھیں۔ سارے محلے میں پینٹ اور وارنش کی بدبو پھیل گئی اگلے روز پولیس نے کچھ مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر میں مسلمانوں اور ہندو سکھوں کے درمیان زبردست کشیدگی پھیل گئی۔ مسجدوں میں پاکستان کی حمایت میں اور گرو داروں مندروں میں پاکستان کے خلاف تقریر ہونے لگیں۔ گلیوں کے منہ دھڑا دھڑا لوہے کے دروازوں سے ہندو سکھ جانے لگے۔ ہندو سکھ ایک عرصے سے

اپنے محلوں میں اسلحہ جمع کر رہے تھے۔ اب مسلمانوں کو بھی ہوش آیا اور مسلم محلوں میں کلباڑے اور بلیں تیار ہونے لگیں۔ ہمارے محلے کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے گلی کے ایک سربراہ کپڑے کے تاجر کو پیش اور اسلحہ خریدنے بھیجا۔ وہ سارے پیسے ہضم کر گیا اور پچھاپس نہ آیا۔ اسی روز لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ اُس کی خبر امر تسر پہنچی تو اشتعال اور بڑبڑ گیا اگلے روز جمعہ تھا۔ کٹرہ میاں سنگھ چوک فرید اور گلی رنگریزاں کے بہت سے مسلمان جمعہ کی نماز پڑھنے چوک پر اگر داس ڈالی مسجد میں گئے۔ یہ مسجد سکھوں کے محلے میں گھری ہوئی تھی۔ اس اقدام سے مسلمان غیر مسلموں کو اپنی شجاعت اور اسلام سے محبت دکھانا چاہتے تھے۔ مگر جذبات کے جوش میں نہتے ہی دشمنوں کے بیچ چلے گئے۔ چنانچہ وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ سکھوں نے کمر پانوں اور تلواروں سے اُن پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے دھوکے لوٹے چلانے شروع کر دیئے جہاں سے لوٹا ہم کی اصطلاح عام ہوئی۔ لیکن دھوکے لوٹے تلواروں کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے تھے بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ بہت شدید زخمی ہوئے سکھوں نے چوک پر آگ داس کے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا دی مسلمان عورتیں ننگے پاؤں ننگے سر عزت بچا کر کٹرہ میاں سنگھ اور شریف پورے پہنچیں۔ میں اُس وقت ہال بازار کے بھلی بازار میں تاج محل ہوٹل کے اوپر احمد راہی کے ماہنامہ ”محور“ کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ نیچے شور مچا۔

”مسلمانو! چوک پر آگ داس میں سکھوں نے تمہارے بھائیوں کو شہید کر دیا“ ہر طرف ایک جوش اور ہیجان پھیل گیا۔ ہال بازار میں سکھوں اور ہندو اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے اُن دکانوں کو ٹوٹ کر آگ لگا دی۔ ہمارے محلے میں کیسر سنگھ اور لکھتی ٹال دے کے ٹڑکے کی منیاری کی دکانیں ٹوٹ لی گئیں۔ کیسر سنگھ سے جب کوئی گاہک نمبر آٹھ مارکہ ڈور کی گوٹ لینے آتا تو وہ سیڑھی لگا کر بندر کی طرح اوپر چڑھتا اور ایک ڈبے میں سے گوٹ نکال کر لے آتا تھا۔ لوٹ مار کے دن میں نے اسی طرح سیڑھی دیوار کے ساتھ لگائی۔ بندر کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھا اور نمبر آٹھ کی ڈور کی پوری درجن گوتیں لے کر نیچے آ گیا۔ لکھتی والی دکان سے میں نے جیلٹ بیڈ کے کتے ہی پیکٹ

لوٹے اور گھر میں سنبھال کر رکھ دیئے۔ یہ سب کچھ وہیں پڑے کا پڑا رہ گیا۔ نہال سنگھ عطار کی دکان لٹی تو میں نے محلے کے ادھیر عمر داروغہ کو دیکھا کہ دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھا سیب کا مرتبہ کھا رہا تھا۔ دروازہ میاں سنگھ والے سکھ کا شراب کا ٹھیکہ بھی لوٹ لیا گیا۔ ہماری گلی کا جان بد معاش میٹھا مالٹا شراب کی بوتلوں کی بوری بھر کر اپنے گھر لے آیا اور پورے چھ مہینے یعنی امرتسر چھوڑنے تک وہ شراب کے نشے میں دھت رہا۔ محلے کے ایک سکھ کے مکان میں سے اُسے ایک برجس اور دونالی بندوق مل گئی تھی۔ پھولی ہوئی برجس پہنے کندھے پر دونالی لٹکائے۔ شراب کے نشے میں جھومتا جھومتا وہ راتوں کو گلی کے آہنی دروازے کے گرد پہرہ دیا کرتا۔ جب موج آتی دھائیں دھائیں ہوا میں ایک دو فائٹر کر دیتا۔

شہر کے دوسرے علاقوں میں مسلمان، ہندو سکھ مغلوں میں گھرے ہونے کے باوجود بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے خنجر زنی اور چھرا گھونپنے کی جگہ جگہ وار داتیں ہو رہی تھیں۔ جس روز مسلمانوں نے کٹرہ کنہیا لال کی ساری ہندو دکانوں کو آگ لگا دی اُس سے اگلے روز شہر میں پہل بارودوں کا کر فیو لگا دیا تھا۔ ایک ہوائی جہاز نے شہر پر اشتہار پھینکے۔ ایک اشتہار اتفاق سے میرے پاس محفوظ ہے۔ اُس کی ایک طرف گورکھی اور دوسری طرف اردو میں کر فیو کا حکم درج ہے۔ میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

اعلان

۱۱۔ امرتسر شہر میں، مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن کے دو دن کے لئے ۲ گھنٹے کا کر فیو نافذ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کر فیو جس میں ۱۰ بجے سے ۳ بجے دن ۲ گھنٹے کا وقفہ ہوگا، لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونسپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو۔ پائی گئی یا جو کوئی شخص نوٹیا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اُس کو نظر پڑتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔

اعلان

۱۲۔ امرتسر شہر میں، مارچ ۱۹۴۷ء دو بجے دن کے دو دن کے لئے ۲ گھنٹے کا کر فیو نافذ کیا گیا ہے۔ اُس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کر فیو جس میں ۱۰ بجے سے ۲ بجے دن ۲ گھنٹے کا وقفہ ہوگا، لاہور جالندھر میں ریلوے لائن کے جنوبی جانب میونسپل حدود میں نافذ رہے گا۔ جس شخص کے قبضہ میں کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو بطور ہتھیار کے استعمال ہو سکے ماسوائے کرپان کے جو میان میں ڈالی ہوئی ہو۔ پائی گئی یا جو کوئی شخص نوٹیا یا آگ لگاتا ہوا دیکھا گیا اُس کو نظر پڑتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ ان احکام کو نافذ کرنے کے لئے فوجی دستے دو بجے دن کے بعد شہر میں گشت کریں گے۔

امرتسر میں انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کر فیو کا اعلان

”اوئے مار سٹیا اسی“

ਇਲਾਨ

اور تیسری انگریز حکومت کی طرف سے لگائے گئے کریڈو کا گورکھی اشتہار

دروازہ میاں سنگھ کے باہر مشرقی جانب کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر اکالی اور نینگ سکھوں کا ایک گردوارہ تھا جہاں انہوں نے ایک قلعہ بنا رکھا تھا اس قلعے کی دیواروں میں سے سکھ اس قلعے کا نام بُرج پھولا سنگھ تھا۔ کثرہ میاں سنگھ، چائی دند اور گھی منڈی کے مسلمان مخلوں پر فائرنگ کرتے رہتے تھے۔ گرمیوں کے دھواں آلود فساد زدہ گرم دن تھے۔ ہمارے محلے میں لال حویلی والے مکان کی چیت پر خواجہ فیض اپنے ایک دوست کے ساتھ بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ وہ اونچا لمبا بھرپور کشمیری جوان تھا۔ اُس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی۔ پہرہ دیتے دیتے خدا جانے کس لئے وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ بُرج پھولا سنگھ کی جانب سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی اور سیدھی فیض کی چھاتی میں جا کر لگی۔ وہ خون میں لت پت گرا اور وہیں شہید ہو گیا۔ اُسکی لاش نیچے لا کر جیب اُس کے باپ کو دکھائی تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ بوڑھا باپ اس صدمے سے حواس کھو بیٹھا بار بار کہتا۔

”میں نے کہا تھا فیض قمعین پہن کر اوپر جا۔ قمعین پہن کر جا۔۔۔۔۔“

ایسے کئی ماؤں کے شیر پاکستان پر قربان ہو گئے اور آج اُن کے نام سے بھی کوئی واقع نہیں۔ لیکن اُن کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اُن کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا۔ شریف پورے سے لے کر مسلم بانی سکول تک جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ دن رات پہرہ دیا کرتے دروازہ میاں سنگھ کی جانب سے ”برقعہ پوش عورتیں تحصیل پورے کی طرف جا رہی تھیں۔ جیب وہ آدھے راستے میں پہنچیں تو بُرج پھولا سنگھ کی جانب سے کچھ اکالی سکھوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اور انہیں اٹھا کر لے گئے۔ پھرے ہوئے شیروں کی طرح شریف پورے کے نوجوان ہاکیاں وغیرہ لے کر نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے لپکے اور آدھے راستے میں ہی اکالی سکھوں کو لیا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ ایک اراٹھی دلیر نوجوان رفیق پونگی کو گولی لگی۔ مسلمان عورتوں کو چھڑا لیا گیا۔ رفیق پونگی کو اُس کے گھر تحصیل پورے لے جایا گیا۔ خون بہت بہہ رہا تھا۔ وہ جوش میں نعرے لگا رہا تھا۔ رات کے پہلے حصے میں اس شہید نے بھی دم توڑ دیا۔ بقول محمد اکرم بٹ آف ریڈیو پاکستان ملی آنکھوں والا یہ اراٹھی نوجوان

امرتسر کا پہلا شہید تھا۔

دروازہ رام باغ کے باہر اگے اور تانگے رولاں، اجٹالہ، فتح گڑھ چڑیاں، جیٹھہ اور چیماری جایا کرتے تھے۔ چیماری اپنے میٹھے فروزوں اور پورن بھگت کی سوتیلی ماں مائی لوٹاں کی جنم بھومی کی وجہ سے مشہور تھا اور جیٹھہ پنجاب کے سرکردہ اور امیر ترین سکھوں کا گڑھ تھا۔ جیٹھہ کے تمام مسلمان خاندانوں کو سکھوں نے بے دردی سے شہید کر دیا۔ مشہور افسانہ نگار اور پروفیسر غلام علی چوہدری کے گھر کے انیس بیس افراد شہید کر دیئے گئے۔ فساد زدہ امرتسر کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی کہ بُرج پھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے ہمارے محلے پر حملہ کر دیا۔ چوٹی بد معاش نے لگی میں اکر نعرہ مارا۔

”اوئے کافر آگئے جے۔ نکل آؤ بار مسلمانو“

اس کے ساتھ ہی محلے میں ہیجان پھیل گیا جس کے باعث میں جو آیا لے کر دروازہ میاں سنگھ کی طرف اٹھ دوڑا۔ جان بد معاش نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر میٹھ مالٹا کی چسکی لگائی، دھنل سنبھالی اور چنگھاڑتا ہوا اکالیوں سے لڑنے کے لئے لپکا۔ اتفاق کہ بات ہے کہ میں نے بھی جوش میں آکر ہاکی پکڑی اور دوسرے محلے داروں کے ساتھ اٹھ دوڑا۔ میں لگی میں بھاگتا بھی جا رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے لڑائی ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مکانوں کی کھڑکیوں میں عورتیں چھتیں اٹھاٹھے سہی کھڑی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر مجھے بہت جوش آیا اور میں اور تیز دوڑنے لگا۔ میدان کارزار میں جا کر معلوم ہوا کہ اکالیوں کے محلے کو دروازے کے مسلمانوں نے نہ صرف بہادری سے روک لیا بلکہ انہیں پسپا کر کے بُرج پھولا سنگھ کی طرف بھاگ دیا۔ ایک اکالی سکھ کی موٹی تازی کٹی ہوئی پٹلی دروازے کے باہر جی ٹی روڈ پر پڑی ابھی تک پھڑک رہی تھی۔ ہمارے محلے کے دو چار نوجوان زخمی ہوئے۔ شدید زخمی ہونے والوں میں غلام قادر آف قادر شوز بھی تھے۔

امرتسر میں فساد کے شعلے وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہو رہے تھے فضا میں ہر وقت مٹی کا تیل جل ہونی لکڑی اور گندے بیروزے کی بو پھیلی رہتی تھی۔ شہر کی مجلسی، ثقافتی اور کچل زندگی ختم ہو گئی تھی۔ باغ اُجڑ گئے تھے۔ کہنی باغ، سکتری باغ اور

گول بارغ میں خاک اڑتی تھی۔ پھلوں کے بارغ ویران ہو گئے تھے۔ ہواؤں میں ایک دہشت اور خوف کی فضا چلی تھی۔ اب یہ بات بھی کھل چکی تھی کہ امرتسر پاکستان میں نہیں آئے گا۔ ریڈ کلف کی اندھی کیر نے گورڈ سپر ہو سٹیا رپور اور جموں پٹھانکوٹ کے مسلمانوں پر بھی ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل والی ساری کی ساری مارکیٹ نذر آتش کر دی گئی تھی۔ ان ہوٹلوں بیٹھنے والے ادیب، شاعر، نقاد، موسیقار، دانشور اور سیاستدان اپنے محلوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جالندھر اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے آفت زدہ مسلم مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف چل پڑے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں نے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن اب وہ بھی پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے تھے مسلمان پولیس سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ شہر میں گورکھا جاٹ اور سکھ فوج آ گئی تھی۔ شریف پور سے کو مسلم مہاجر کمیپ قرار دے دیا گیا اور اس کے باہر بلوچ رجمنٹ کے سپاہی بیٹھ گئے کوچہ رنگریزاں میں بارغ رامند کے ہندو سکھوں نے فوج کے ساتھ مل کر اچانک حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ باقی لوگ بڑی مشکل سے جان بچا کر ہمارے محلے گلی ڈبگراں میں آ گئے۔ سوائے ہمارے محلے اور شریف پور سے کے سارا امرتسر ہندو سکھ فوج کی بربریت کی زد میں تھا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گھروں کو ٹوٹ ٹوٹ کر اور آگ لگا کر تھک گئے تھے۔ اب وہ ہمارے محلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خبر آئی کہ مسلم لیگ کے ٹرک لاہور سے مسلمانوں کو لینے کے لئے آئے ہیں۔ ایک روز دو فوجی ٹرک گلی کے باہر آ کر رک گئے ان میں گلی کے ایک سرمایہ دار نے گھر کا سارا سامان لاوا اور غریب مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان کو روانہ ہو گیا۔ جائے بد معاش کی ساری بوتلیں ختم ہو چکی تھیں اور وہ سر جھکائے ایک دکان کے پھٹے پردا سے بیٹھا تھا۔

اور پھر ایک روز گورکھا فوجیوں نے گلی کے دروازے پر دستی بم پھینک دیا۔ ایک بیہوشانک دھماکہ ہوا اور گلی میں بھگدڑ مچ گئی اور سب لوگ اپنا سامان وہیں چھوڑ لال جوتی اور گوجروں کی گلی میں سے ہو کر شریف پور سے کی طرف بھاگنے لگے جی روڈ پر سے گزرتے

ہوئے ایک سکھ ملٹری ٹرک نے ان پر فائرنگ کی جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ غلام محمد پشینے والے کا جوان بیٹا موسیٰ اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھائے بد رو پار کر رہا تھا کہ گولی لگنے سے دونوں باپ بیٹا شہید ہو گئے۔ پٹھان خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ ریلوے سٹیشن سے ہو کر پیدل ہی لاہور کی طرف چل پڑا تھا۔ اُس قافلے کے تمام افراد کو چھبرٹ کے پاس سکھوں نے شہید کر دیا۔ ریل گاڑی کی گھر کی تھوڑی سی اوپر اٹھا کر میں نے اپنی آنکھوں سے ان افراد کی لاشیں خود رو جھاڑیوں اور درختوں کے پاس بکھری ہوئی دیکھیں۔

امرتسر کے مسلمان اپنے آبا و اجداد کے مکانوں، گلی محلوں، باغوں اور مسجدوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اُن کے چہرے ویران تھے۔ بالوں میں خاک پڑی تھی اور پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ امرتسر کے آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا۔ جلے ہوئے مکانوں، گلی محلوں اور مسجدوں کا دھواں — قرطبہ کی عبادت گاہیں ایک بار پھر ویران ہو رہی تھیں۔ غرناطہ کے باغات ایک بار پھر اجڑا رہے تھے۔ ہسپانیہ کے گلی کوچے ایک بار پھر خونِ مسلم سے لالہ زار بن گئے تھے۔ اندلس کی وادیاں تیرہ و تار ہو گئیں۔ انگور کی بیلوں سے چھتی ہوئی گلیاں مسلمانوں کے خون کی پیاس بن گئیں۔ امرتسر! — تیرے پسینے میں ہماری خوشبو تھی۔ تیری مائوسوں میں ہماری مہک تھی۔ تیری صبحوں میں ہماری مافوں کی تلاوت کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ تیری مسجدوں کے ٹھنڈے فرشوں پر ہم نے سجدے کئے۔ تیرے بلند و بالا مناظر پر ہم نے صبح و شام خدا کی عظمت و جلال کی صدا بلند کی۔ ہم نے تجھے اپنا خون دے کر پالا۔ مگر تو نے سنگدل دشمن بن کر اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہمارا خون بہایا۔ ہم تجھ سے اپنے خون کا بدلہ لیں گے۔ ہم اُن بہنوں کو نہیں بھولیں گے جن کا سہاگ تیری گلیوں کی خاک میں دفن ہو گیا۔ ہم اپنی اُن مافوں کو فراموش نہیں کریں گے جن کے جگر گوشوں کا خون تیرے بازاروں کو لالہ زار کر گیا۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلمان کا امیں ہے
مانند حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تبری خاک میں سجدوں کے نشان ہیں

خاموش افانیں ہیں تیری بادِ سحر میں

امر نسر! ہم تباہ حال مہاجرینِ کرتیرے شہر کے جلتے ہوئے دروازوں سے نکلے
تھے۔ اب پُر شکوہ فاتح بنِ کرتیرے شہر میں داخل ہوں گے۔ اپنے طلوع ہوتے سورج
میں ہماری فح کی روشنی دیکھو! اپنی بے اذال خاموشی میں ہمارے فاتح گھوڑوں کی یلغار سن!

آگ اور خون کے گلاب

مارچ ۱۹۴۷ء کی تیسری تاریخ تھی۔ میں لاہور سے آنے والی ٹرین پر امرتسر ریلوے اسٹیشن کے ایک
نمبر پیٹ فارم پر اترا تو وہاں کی فضا کچھ ویران ویران محسوس ہوئی۔ حسبِ عادت میں نسا امرتسر کالکٹ
نہیں خریدتا تھا اور اب لائینوں لائن شریف پورے والے پھانگ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔
ٹرین کے انجن کے پاس دو چار آدمی کھڑے کھسکھس کر رہے تھے۔ مجھے ان کے قریب سے ہو کر
پیٹ فارم کی ڈھلان اتر کر آگے ریلوے یارڈ میں جانا تھا اور پھر میٹروں والے پکی کے نیچے سے
گزر کر شریف پورے والے پھانگ تک پہنچنا تھا۔ ان میں ایک سیکھ بھی تھا۔ ان کی باتوں سے پتہ
چلا کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔

میں نے کوئی خیال نہ کیا کیونکہ امرتسر میں ہر محرم شبِ برات پر ہندو مسلم تصادم ہوتا ہی
رہتا تھا۔ محرم کے تحریشے ہندو سیکھ اکثریت کے گورو بازار، ورشٹی ڈیورھی، کر موڈیورھی اور بازارائی
سیروں سے گزرتے تھے اور ہندو اوپر سے ایشیں پھینکتے تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے پاؤں چھڑے نکل
آتے۔ لیکن امرتسر ریلوے یارڈ میں سے گزرتے ہوئے میں نے دائیں جانب دیکھا تو دور لیک
بگڑ دھواں اٹھتا نظر آیا۔ کہیں آگ لگی تھی۔

پھانگ پر پہنچا تو کچھ لوگ چار پائی اٹھائے بڑے ہسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ ہمارے
محلے کے لوگ تھے۔ چار پائی پر ہمارے ہی محلے کا ایک گاڑی بان نوجوان خون میں لست پت پڑا تھا۔
پتہ چلا کہ بریج پھول سنگھ کے نہنگوں اور اکالیوں نے ہمارے کھڑے پر حملہ کر دیا تھا۔ جب رڑائی ہوئی۔
ہم کھڑا مہان سنگ میں رہتے تھے اور دروازہ مہان سنگ سے گزر کر اپنے محلے میں جاتے
دروازہ مہان سنگ کے سامنے دائیں جانب کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر سکھوں نے ایک چھوٹا سا

قلعہ بنا رکھا تھا جس کا نام بُرج بھلا سنگھ تھا۔ اس پر امرتسر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا مگر کہتے ہیں کہ سرسکندر نے سکھوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ وہاں قلعے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس قلعے سے نکل کر سکھوں نے ہمارے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اس سے ایک روز پہلے یا اسی روز لاہور میں پنجاب اسمبلی کی سیرمیں پر سکھوں کے لیڈر تارا سنگھ نے تلوار لہرا کر اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا قبرستان بنادیں گے مگر پاکستان نہیں بنے دیں گے۔ اس سے مشتعل ہو کر نہنگوں کی ایک ٹولی تلواریں لے کر ہمارے محلے پر ٹوٹ پڑی۔

مسلمانوں کے پاس کبھی کچھ نہیں ہوا کرتا بس خدا کے بھروسے پر ہی لڑا کرتے ہیں۔ اس روز بھی سکھوں کی تلواروں کا مقابلہ ہمارے محلے کے نوجوانوں نے چار پائیوں کے پایوں سے کیا۔ ہمارے نوجوان زخمی ہوئے۔ پھر اس سے نہنگ والیں اپنے قلعے کی طرف بھاگ گئے۔

کھڑے کے دروازے پر دیرانی تھی۔ پولیس آگئی تھی۔ محلے میں پہنچا تو بڑا جوش و خروش تھا تیسرے پہر میں مال بازار میں آتا تو ایک تانگہ گول ہٹی کے آگے آکر رکا۔ اس میں زرد کپڑوں والے سکھ نہنگ بیٹھے تھے۔ پیچھے زبیت رکھی تھی۔ نوبت بجا کر لوگوں کو اکٹھا کیا گیا۔ پھر اگلی نشست پر اٹھ کر ایک سکھ نے مسلمانوں کے خلاف ایک تقریر کی اور مارٹر تارا سنگھ کا حوالہ دے کر کہا۔

”ہم مسلمانوں کا قبرستان بنادیں گے۔ پاکستان کبھی نہیں بنے دیں گے یہ گول ہٹی سکھوں کی جنرل مرچنٹ کی دکان تھی اور وہاں تلواریں بھی فروخت ہوتی تھیں میں گول ہٹی کے ایک طرف کھڑا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے گول ہٹی کے سکھ نے تلواریں تانگے میں بیٹھے نہنگوں کی طرف اچھال دیں کہ مسلمانوں کا قتل شروع کریں۔“

چوک میں جگہ ڈرچ گز نہنگوں نے تلواریں لہرا کر تانگے سے چھلانگیں لگائیں اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان نہبتے تھے۔ اینٹ، پتھر اور سوڑے کی بوتلوں سے مقابلہ کیا۔ پولیس آگئی۔ بازار بند ہو گیا۔ اُدھی رات کو مسلمانوں نے گول ہٹی کو آگ لگا دی۔ امرتسر کی یہ سب سے پہلی بھیانک آگ تھی جس نے گول ہٹی کی تینوں دکانوں کو جلا کر رکھ دیا۔

اب شہر میں فسادات کی آگ جگہ جگہ بھڑک اٹھی دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں گیوں پر روہے کے دروازے چڑھوا دیئے گئے۔ ہندو سکھ محلوں میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

اور ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح مسلم محلوں میں ہندو سکھوں کے مکان لوٹ کر تندر آتش زد ہوئے گئے۔ اور پھر ۶۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو امرتسر شہر پر ایک چھوٹے سے جہاز نے پرواز کی اور اشتہار گراٹے۔ ان پر لکھا تھا کہ شہر میں ۱۷ مارچ دو بجے دن سے دو دن تک کے لیے ۲۲ گھنٹے کا کر فیوگ دیا گیا ہے اس کے بعد آئندہ پانچ دن کے لئے ۲۰ گھنٹے کا کر فیوگ ہوگا جس میں دس بجے دن سے دو بجے دن چار گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ خدا جانے کس طرح یہ اشتہار میرے ساتھ ہجرت کے بعد لاہور آگیا جواب بھی میرے پاس ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہا۔

پھر چوک پر آگ داس کا سانحہ ہوا۔ اس چوک میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ وہاں مسلمانوں کے چند ایک گھر تھے۔ سکھوں نے ان سب کو شہید کر کے ان کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ اگلے روز جمعہ تھا مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ وہ جمعہ کی نماز چوک پر گلاس والی مسجد میں پڑھیں گے۔ ہر مسلمان اپنے ساتھ ایک ایک لوٹا لیتا گیا۔ نماز کے دوران سکھوں نے حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے لوٹے مار مار کر سکھوں کو بھاگ دیا۔ یہاں سے لوٹا ہم مشہور ہو گیا۔ مسجد میں کئی مسلمان شہید ہوئے۔ میں نے حماقت یہ کی کہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے ٹکے کے بت سے آگے جلیانوالہ باغ سے ہو کر بازار بھنگیاں کی جانب نکل گیا جو قافلہ سکھ آبادی تھی۔ اصل میں ہم امرتسر ہی بڑے دلیر تھے۔ اور اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا تھا کہ سکھ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے یہی وجہ ہے کہ جب تک سارے شہر پر گورکھا اور ہندو سکھ فوج نے قبضہ نہیں کر لیا امرتسر مسلمان ڈٹ کر جگہ جگہ ہندو سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

بازار بھنگیاں سے ذرا آگے گیا تو سامنے گورو رام داس کی سرائے تھی اور اس کے پیچھے سیاہ گارڈھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک جگہ ہندو سکھ جمع تھے اور اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ شہر میں کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ مجھے بھی انہوں نے ہندو سمجھا کیونکہ ان دنوں میں کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ گورو رام داس کی سرائے سے سکھوں کی ایک ٹولی تلواریں لہراتی، نعرے لگاتی آئی۔ اب مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ پھر بھی میں لوگوں میں کھڑا رہا۔ کیونکہ بھاگنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ مشتعل سکھوں کی ٹولی مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتی باغ راماوند کی طرف نکل گئی۔ میں بظاہر بڑے آرام سے ٹہلتا ٹہلتا وہاں سے نکل کر کسیری باغ میں آیا اور پھر بھاگ کر کوچہ

لگ رہے تھے۔ کوئی راکھاواں نظر نہ آیا۔ امرتسر میں شیش پرانے ہی معلوم ہوا کہ شہر میں اگلے روز صبح بجے تک کارفیو لگا ہوا ہے۔ پلیٹ فارم پر مجھے اپنا دوست قیوم شیش مل گیا اس نے کہا کہ فیو ابھی ابھی لگا ہے۔ میرا خیال ہے ہم کوشش کر کے محلے میں پہنچ سکتے ہیں۔

قیوم شیش کا محلہ میرٹھیوں والے پل کے پار تھا۔ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ پھر بھی کارفیو لگ چکا تھا لیکن ہم لوگ امرتسر کو اب بھی اپنا گھر ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہم شیش کے یارڈ سے گزر کر دیوار بھاند میرٹھیوں والے پل کی دوسری جانب سڑک پر آگئے۔ شہر سنان تھا اوپر سے ایک آدمی نے کھڑکی، کھول کر آواز دی۔ ”اوتے منڈیو اکیوں مرن نوں تھاں لہجہ دے او“

قیوم شیش کا محلہ بالکل سامنے تھا۔ ہم بھاگ کر اس کے محلے میں آگئے۔ ساری رات میں نے قیوم شیش کے گھر پر سبر کی۔ حالات واقعی بہت خراب ہو چکے تھے قیوم کے گھر کے پیچھے ہندوؤں کا محلہ تھا۔ وہاں سے دو مسلمانوں کی لاشیں آئیں۔ ایک عورت شدید زخمی حالت میں تھی۔ چھت پر مسلمان نوجوان بیٹھے اکا دکا فائر کر دیتے تھے۔ شہر میں صرف ہندو سکھ فوجی پھر رہے تھے۔ صبح کارفیو اٹھا تو میں بھاگ کر اپنے گھر پہنچا۔ گھر والے مجھے دیکھ کر خوش ہوئے اور حیران بھی ہوئے کہ میں نے اتنا لمبا سفر کیسے طے کر لیا۔ میں نے انہیں الٹی میٹم دے دیا کہ پانچ منٹ کے اندر راند جس نے میرے ساتھ لاہور چلنا ہے تیار ہو جائے۔ بزرگ میرا مذاق اڑانے لگے۔

”پاگل ہو گئے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

لیکن میں والدہ، آپو جی اور دو چھوٹی بہنوں کو ساتھ لے کر گئی میں آگیا۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا محلے والوں نے ہمیں تاپ بندیدہ نکلوں سے دیکھا۔ میدان ملی موریا شکاری بڑی پہنے کدے پر سو بھا سنگھ کے مکان سے ٹوٹی ہوئی بندوق رکھے آگیا۔

”لو جی! خیفے کا گھر بھی لاہور جا رہا ہے۔“

مگی والے اسی جگہ رہنے کی قسم کھائے ہوئے تھے لیکن میں دہلی سے امرتسر تک کے حالات دیکھ آیا تھا۔ میں نے دروازہ وہاں سنگھ میں اگر ایک مسلمان تانگے والے کو دس روپے پر راضی کیا اور ریوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا، میں نے شریف پورے کی طرف دیکھا، سرکر بند ڈالے یو کپش اسٹیشن کے درخت قاموش کھڑے تھے اور دور آسمان پر دھواں اٹھ رہا تھا۔ نویں

رنگریزاں میں گھس گیا جو ہمارے ہی محلے میں تھا۔

اب امرتسر میں ہر طرف آگ اور لاشیں تھیں۔ انہیں کیا بیان کروں۔ مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہی یہی فونی کھیل کھیل گیا۔ لوگ ابھی تک اس آگ کی تپش اور خون کی بو کو بھولے نہیں ہوں گے۔ بازاروں کے بازار جل کر راکھ ہو گئے۔ کارفیو کے ساتھ جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ کارفیو کھتا تو خنجر زنی کی وارداتیں شروع ہو جاتیں۔ میں فروری، ۱۹۴۷ء کے اخیر میں کولمبو سے امرتسر آیا تھا۔ وہاں میں بھائی جان۔ کپٹن ممتاز ملک کے ساتھ کام کرتا تھا اور مجھے پھر واپس جانا تھا۔ لیکن فسادات نے مجھے امرتسر میں ہی روک دیا۔ آخر جولائی کے پہلے ہفتے میں کسی نہ کسی طرح فرنٹیر میل پر سوار ہو کر دہلی پہنچ گیا۔ وہاں سے مدراس ایکسپریز پکڑی اور مدراس آگیا۔ یہاں کی فضا بڑی پرسکون تھی۔ مدراس سے ریل میں بیٹھا تو دھنش کو ڈی پہنچ کر سٹیر میں آدھ گھنٹے کے سمندری سفر کے بعد سیلون کی بندرگاہ ٹالی منارا تھرا۔ یہاں سے کولمبو میل میں سوار ہو کر ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد کولمبو پہنچ گیا۔

جولائی کے اخیر میں امرتسر سے بڑی بھیانک خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ پاکستان بن چکا تھا اور امرتسر پاکستان میں نہیں آیا تھا۔ اگست کے پہلے ہفتے میں کولمبو سے واپس امرتسر کے لئے روانہ ہو گیا۔ دہلی تک تو حالات قدرے ٹھیک ٹھاک تھے۔ دہلی سے آگے آیا تو انبالے کے سٹیشن پر مسلمان برقع پوش عورتوں کو بے سرو سامانی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ہجوم در ہجوم جمع دیکھا جو اپنے بچوں کو سینے سے لگائے لاہور والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھیں۔ سکھ فوجی اور پولیس والے انہیں ہماری گاڑی سے دور رکھے ہوئے تھے۔ لدھیانے کے سٹیشن پر بھی مسلمان مہاجرین کے ہجوم دیکھے جو پریشان حال تھے اور شہر چھوڑ کر وہاں آن بیٹھے تھے۔ یہی وہ مسلمان تھے جو سیشل ٹرینوں میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور جنہیں راستے میں ہی ہندو سکھوں نے کاٹ کر پھینک دیا۔ بالآخر ریوے اسٹیشن پر سکھ کرپانی اور تنواریں لئے پھر رہے تھے۔ یہاں کوئی مسلمان دکھائی نہ دیا۔ یہاں سے گاڑی چلی تو دہلی بائیں کھیت ویران تھے۔ دور کہیں کہیں دیہات میں دھواں اٹھ رہا تھا۔ کرتار پور کے قریب ریوے لائن کے ساتھ ایک چھوٹا سا گاؤں گزرا۔ اس کے مکانوں میں آگ لگی تھی۔ کھال کے پاس دو لاشیں اوندر سی پڑی تھیں۔ گاڑی مانا نوالہ سے گزر کر امرتسر شہر کی حدود میں آگئی۔ یہاں بھی وہی مرگ آلود فضا تھی۔ شریف پور کے سامنے والے امرودوں کے باغ اُجڑے اُجڑے

خانقاہ کے باہر بد رو کے کنارے ایک لاش پڑی تھی، شیشی پر مسلمان مہاجرین کے ٹھٹھ لگے تھے، یہ لوگ زیادہ تر لوہا بکڑھاتے تھے دروازہ اور دائم گنج سے آئے تھے، چھت پر بلوچ رجمنٹ کے جوان بچے لگائے بیٹھے تھے کیونکہ سیلا مندر کی جانب سے ہندو فائرنگ کرتے تھے، بوڑھے ایکسپریس اگرز کی بڑی مشکل سے ایک ڈبے میں گھس کر کھڑے ہو گئے، ٹرین چلی، فائرنگ شروع ہو گئی، ٹرین رک گئی، بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے فائرنگ کا ڈٹ کر جواب دیا، ہندوؤں نے فائرنگ بند کر دی، ٹرین پھر روانہ ہوئی، چھ ہرٹھ کے پاس میں نے جھاڑیوں میں جگہ جگہ پٹھانوں کی لاشیں دیکھیں، بعد میں پتہ چلا کہ یہ مسلمان پٹھان اپنے گدے لے کر پیدل ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گئے تھے، لوگوں نے انہیں منع بھی کیا مگر وہ نہ رکے اور چھ ہرٹھ کے پاس سکھوں نے حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ گاڑی بڑی ہلکی رفتار سے چار ہی تھی، خاصہ ریوے سٹیشن پر سکھ کھڑے تھواریں لہرا لہرا کر مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ اٹاری تک سکھوں کی گالیوں نے ہمارا پیچھا کیا، واگہ آیا تو ایک جگہ بانس کے ساتھ پاکستان کا پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا لوگوں نے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ گاڑی لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ۶ پر آکر کھڑی ہو گئی، مسلم لیگ کے رضا کار بچنے ہوئے چلے، روٹیاں اور اچارے کرا گئے۔ وہ ایک ایک سے خیریت پوچھ رہے تھے، لاہور کے لوگ بازو کھول کر مہاجرین کو گے لگا رہے تھے۔ ہمیں ریوے سٹیشن کے پوسٹ اینڈ پارسل آفس کی طرف سے باہر نکالا گیا، معلوم ہوا کہ سٹیشن کے سامنے گوروارہ شہید گنج سے سکھ مسلمانوں پر فائرنگ کر رہے ہیں، سٹیشن کے باہر چھوٹے سے باغ میں تمبوگ تھا یہاں مہاجرین کو مار مٹی طور پر ٹھہرایا جاتا اور پھر والٹن کے مہاجر کیمپ کی طرف روانہ کر دیا جاتا، ہم اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں آگئے جو لاہور میں ہی آباد تھی۔ باقی چھوٹے بھائی، والد صاحب اور دادا جان اور دو بڑی بہنیں امرتسر میں ہی تھیں، یہ لوگ محض صندیا ضرورت سے زیادہ احتیاط کی وجہ سے وہاں سے نہیں بلے تھے، لیکن اب حالات بالکل پٹا کھا چکے تھے، مشرقی پنجاب سے کٹی ہوئی ریلیں آنا شروع ہو گئی تھیں، میں روز ریوے سٹیشن پر آکر باقی گھر والوں کا پتہ کرتا، مشرقی پنجاب سے آنے والی ہر گاڑی دیکھتا، جو بھی ریل آتی اس میں سے مسلمانوں کی لاشیں نکلتیں۔ ڈبوں میں خون ہی خون ہوتا، فیروز پور سے ایک ٹرین آئی تو میں ایک خالی ڈبے میں چڑھ گیا، سیٹ کے نیچے کوئی شے پڑی تھی، میں نے اسے اٹھایا تو وہ کسی عورت کا کتا ہوتا

شہادت کی انگلی اور انگوٹھا غائب تھا ایک انگلی میں چاندی کی انگوٹھی تھی، ٹالیاں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر بھر کر شیشی سے باہر لے جائی جاتیں۔

میرے بعد ہمارے محلے پر کیا گوری وہ بھی سن لیجئے۔ تیرہ اگست کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں نے بے پناہ گولیاں چلائیں، اندر گد کی ساری گلیوں کے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں آگئے تھے، ہمارے بازار میں میرے ہم جماعت حامد بیٹ کا مکان تھا جو ہمارے مشہور یا کسر اور آرٹسٹ محمود بیٹ کے بڑے بھائی تھے۔ حامد بیٹ اونچا لمبا سرخ و سپید خوبصورت کشمیری نوجوان تھا، کرفیو لگا تھا۔ بس چک اٹھا کر بازار میں جھانکا ہی تھا گورکھ نے گولی چلا دی، گھر میں کیا کہرام مچا ہوگا، اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد کر سکتا تھا۔ حامد بیٹ شہید ہو گیا، ہمارے محلے کا ایک اور کڑیل جوان چھت پر گیا، وہ ننگے بدن تھا۔ صوفی دعوتی پہن رکھی تھی، برج پھولا سنگھ سے تقری ناٹ تقری کی گولی آئی اور اس کے سینے سے پار ہو گئی، وہ بھی شہید ہو گیا۔ حالانکہ صوفی مسلمانوں کی مہاجر ٹرین امرتسر کے سٹیشن پر آکر رکی۔ ایک نوجوان پیاس بجھانے سامنے پلیٹ فارم کے ٹل پر جاتے لگا، اس کی ماں اور بہنوں نے ہاتھ جوڑے، واسطے ڈالے کہ خدا کے لئے نہ جاؤ، مگر دلیر نوجوان نہ رکا۔

”ایسا بھی کیا ہے، وہ سامنے تو پانی کا ٹل ہے پانی پی کر ابھی آجاتا ہوں“

اس نے نکلے پر جا کر پانی کا ایک گھونٹ ہی پیا تھا کہ کسی ہندو یا سکھ کی رائفل سے ٹکلی ہوئی گولی سناتی ہوئی آئی اور اس کی کھوپڑی کو توڑ کر نکل گئی، وہ اسی جگہ شہید ہو گیا۔ ماں اور بہنوں کے مین سے ریوے سٹیشن کے درو دیوار مل گئے، وہ بین کرتی رہیں، ان کے بھائی کی ان کے بیٹے کی لاشیں سامنے پلیٹ فارم کے نکلے پر پڑی رہی اور گاڑی لاہور کی طرف چل دی۔

تیرہ اگست کی رات کی قیامت خیز فائرنگ نے ہمارے محلے والوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے سوائے ہماری گلی کے سوائے امرتسر شہر پر ہندو سکھ فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چودہ کی صبح گلی کے دروازے کو توڑ رہے تھے، لوگ گلی کی مشرقی جانب سے گوجروں کے وارے سے ہو کر سر کر روڈ پر آگئے، یہاں ان پر برج پھولا سنگھ کی طرف سے گولیاں چلنے لگیں، غلام محمد رفوگر کا لڑکا موسیٰ اپنے در سال کے بیٹے کو سینے سے لگائے بد رو ہار کر رہا تھا کہ گولی کھا کر بد رو میں نیچے کے ساتھ گرا اور پھر دونوں میں سے کوئی باہر نہ آسکا، ہماری گلی کے لوگ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ پاتھی گراؤنڈ میں سے شریف

کی طرف بھاگے جا رہے تھے، سکھ ان پر گولیاں برس رہے تھے، وہ گر رہے تھے، شبید ہو رہے تھے جو بچ گئے وہ شریف پور سے پہنچ کر بے دم ہو کر گر پڑے شریف پورہ مہاجر کیمپ قرار دے دیا گیا تھا اور وہاں بوجرجنٹ کا پہرہ تھا، بوجرجوان ان لوگوں کو فائرنگ کا کورسے رہے تھے مگر بہت دور تھے، کسی نہ کسی طرح ہمارے گھر والے بھی بچ کر شریف پور سے پہنچ گئے۔

پورے شہر پر سوائے شریف پور سے کے ہندو سکھوں کا قبضہ تھا۔ شہر میں اگر کہیں کوئی اکاؤنٹا مسلمان رہ گیا تھا تو وہ کیمپ میں آکر اپنے فرار کی حیرت انگیز کہانی سناتا، ایک نوجوان اتھی دواڑ سے بدرو میں داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا، بدرو کے اندر سے گزرتا شریف پور سے پہنچ گیا، وہ کچھ دیر میں لت پت تھا، اور سر اور منہ پر جالے لگے تھے، دروازہ وہاں سنگھ سے شاید آخری تانگہ کچھ مسلمان عورتوں کو لے کر شریف پور کی طرف آ رہا تھا کہ برج پھولا سنگھ سے سکھوں نے حملہ کر دیا اور وہ عورتیں اٹھا کر لے گئے۔ شریف پور سے اسی وقت مسلمان جوان غضب ناک ہو کر باعلیٰ کے نعرے لگاتے نکلے اور دیوار پھاند کر دشمن کے قلعے میں داخل ہو گئے، کہتے ہیں تنگ سنگھ ان کی جرأت دیکھ کر ہی ششدر رہ گئے۔ یہ جیلے جوان دونوں خواتین کو واپس لے آئے لیکن خود سخت زخمی حالت میں تھے۔ یہ آتش نمرود میں نہتے ہی کود پڑے تھے۔ گران کے جذبے کی سپائی انہیں سرخرو کر کے واپس کیمپ میں لے آئی۔ شریف پور سے مہاجرین کو لے کر ٹرینیں پاکستان کی طرف روانہ ہونے لگیں ایک ریل میں بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح ہمارے باقی گھر والے بھی لاہور پہنچ گئے۔

یہاں اگر ایک نئی زندگی، ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے، پاکستان کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ یہ کن سیاسی حوال کا نتیجہ ہے؟ امرتسر ہم سے کیوں چین گیا؟ اس پر بہت کچھ لوگوں نے لکھا ہے جو مجھ سے زیادہ سیاسی اور دینی بصیرت رکھتے ہیں اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ میں تو ایک افسانہ نگار ہوں، میں تو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ امرتسر کی ٹھنڈی کھوئی پر بیٹھا ہوا ہندو کنوئیں کا ٹھنڈا پانی مسلمانوں کو اوک میں پلاتا تھا اور ہندو سکھوں کو شیشے کے گلاسوں میں پلاتا تھا، شانتی سروپ میرا گہرا دوست تھا لیکن میں اس کے گھر کے باورچی خانے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ درشنی ڈیوڑھی والا سکھ غیر مسلموں کو تانبے کے گلاسوں میں اور مسلمانوں کو بانس کی ٹنگی سے پانی پلاتا تھا جس طرح جانوروں کو دوا پلائی جاتی ہے۔ شانتی سروپ نے مجھے بتایا تھا کہ اگر کبھی میں اس کے گھر میں چائے پی لوں تو

اس کی برہمن ماں میرے جوتے کپ کو توڑ دیا کرتی ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں، پاکستان تو امرتسر کے محلے محلے میں بنا ہوا تھا، اس کے لئے کہاں کی سیاسی بصیرت اور کہاں کا تاریخی پس منظر؟ آپ آج کسی ہندو کے ساتھ اس کے گھر میں چوبیس گھنٹے بسر کریں، پچیسویں گھنٹے میں آپ اپنے آپ ایک پاکستان کی ضرورت محسوس کرنے لگیں گے۔ شانتی سروپ میرا بچپن کا دوست تھا، اس کی ماما مجھ سے بہت زیادہ کرتی تھی لیکن ہمیشہ مجھ سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر، منہ پر کپڑا رکھ کر بات کیا کرتی تھی، کیونکہ میں مسلمان تھا۔ پاکستان بننے میں تو شانتی سروپ کی ماں کا بڑا گہرا ہاتھ ہے، اور اس سکھ کا بھی جو درشنی ڈیوڑھی میں مسلمانوں کو بانس کی ٹنگی سے پانی پلا یا کرتا تھا یہ لوگ آج بھی ویسے ہی ہیں، آج بھی پاکستان سے کوئی مسلمان ان کے پاس چلا جائے تو پرانے صندوق میں سے بانس کی ٹنگی نکال لیتے ہیں، آج بھی شانتی سروپ کی ماما آپ سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو کر بات کرے گی۔ اس نے منہ پر کپڑا رکھا ہو گا جیسے آپ اچھوت ہوں۔

ان باتوں کو کہاں تک دہرایا جائے، پھر بھی اگست کے مہینے میں جب تیز دھوپ لگتی ہے اور تاریک بجلی ہوئی راتیں سنان ہو جاتی ہیں تو مجھے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، آگ میں جلتی لاشوں کی بو آتی ہے۔ میں ان عورتوں کی چیخیں سنتا ہوں جنہیں جالندھر سے لاہور آتے قلعے میں سے اغوا کیا جا رہا ہے، میں اس عورت کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا ہوں جو فیروز پور سے لاہور آنیوالی ریل کے ڈبے میں پڑا تھا، اور جیسے میں نے اٹھا کر پھینک دیا تھا، کبھی اس ہاتھ نے کسی کا ہاتھ مقام کر ہمیشہ ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہو گا کبھی اس ہاتھ نے اپنے معصوم بچے کا یا سبائی کا منہ دھلایا ہو گا، کبھی اس ہاتھ نے قرآن شریف جزدان میں لپیٹ کر چھپتی پر رکھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ دعا کے لئے بھی اٹھا ہو گا، کبھی یہ ہاتھ باپ کی انگلی پکڑ کر گھر سے باہر نکلا ہو گا، کبھی اس ہاتھ پر مہندی بھی لگی ہو گی۔ لیکن اب خون آلود خالی ڈبے کی سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ کوئی اس ہاتھ کو پکڑنے والا نہیں، کوئی ہاتھ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینے والا نہیں۔

الوداع امیر سے خوبصورت اداس لوگو!

ایک بار پھر الوداع! ہزار بار الوداع!

کتنے حسین اور خوشبودار تھے تمہارے گلاب کے پھول!

امرتسریں ۱۲ اگست

ایک نیم سرکاری ثقافتی ادارے میں چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریب منائی جا رہی تھی۔ چودہ اگست کی یادیں کو تازہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لاہور شہر کی سب سے جنگی، سب سے ہموار اور سب سے خوبصورت سڑک کی اٹھ منزلہ عمارت کی چھٹی منزل کے ایگزیکٹو فلور میں قوم کے گدوں والی آرام کرسیاں سجی تھیں۔ ڈائس پر میز رکھی تھی جس پر شیشے کے چھیلے جگ میں ٹھنڈا پانی تھا اور گلدان میں کاریشن کے زرد پھول سجے تھے۔ بیل باٹم پاہموں، آدم جی کی ٹوٹوں، سمارٹل کے پرنٹوں، کوپیر کا جمل اور جیولری کے چمکتے ہیرن اور ٹیڑھوں کے سوٹوں، امریکی کونوٹوں، اطالوی سینٹوں اور فرنیچر پر فیومز کا ہجوم تھا۔ ٹائیٹوں کی کسی ہوئی گزریں ہارڈ کالروں میں پھنسی ہوئی گزریں، جبروں تک آئی ہوئی بالوں کی قلمیں، انگلش پونڈز کے دھکتے ہوئے گفٹ بکس اور ہال میں رچی ہوئی فریش ایر کی رومنگ مہک — دبی دبی سرگوشیاں، پروٹوکول کے تفکعات، دی آئی بیز کے ٹھنڈے بے جس چہرے اور پی آئی اے کے نم دار ٹھنڈے کانڈول سے پیشانیاں پونچھتی بیگمات اور ان کی حائرہ لیتی بے باک نگاہیں — اب گیسٹ آف آنر تشریف لا رہے تھے۔

میں جس کرسی پر بیٹھا تھا وہ میرے قریب سے گزرے — ان کے امریکی ٹیڑھوں کے سوٹ سے یوڈی کھون کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوئے۔ تالیاں سیکرٹری صاحب نے تقریب کی مختصر عرض و غایت بتائی۔ چودہ اگست کو دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ ایک بیل باٹم نے بالوں کو جھٹک کر سات سو روپے کی ساڑھی سے پوچھا، "مئی، چودہ اگست کو یہی کہاں تھی؟"

ساڑھی نے لگے کانیکس درست کرتے ہوئے کہا: "بے بی اتم تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔"

بیل باٹم نے جیونگ گم دوسرے جہڑے میں گھا کر پوچھا: "مئی، تم کہاں تھیں؟"

ساڑھی نے ہونٹوں کے ریڈائنڈین کر پرایا ہوا پسینہ ٹھنڈے نشوونیر سے پونچھتے ہوئے کہا: "ویل بے بی، آئی تھینک، میں ان دونوں یو کے میں تھی۔"

خواتین و حضرات! آج چودہ اگست ہے۔ اس روز ہم نے ہندو سامراج کو شکست دیکر اپنے قائد اعظم کی قیادت میں پاکستان حاصل کیا تھا آج کا دن ہماری بہتری کا بڑا اہم دن ہے۔ خواتین و حضرات!..... مقرر تے ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ پیے۔ ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خوشبو سفید رومال سے پونچھا۔ سیاہ چشمہ درست کیا اور ذرا کھٹکار کر دوبارہ تقریر شروع کر دی — ایک سیولیس لڑکی نے اپنا گلوگو چشمہ اتارتے ہوئے دوسری لڑکی سے پوچھا۔

دوسری لڑکی نے کمر کے گرد کسی ہوئی سنہری زنجیر کو اور کستے ہوئے پوچھا۔

(تمہارا مطلب کیا ہے؟)

پہلی لڑکی نے ہونٹ بھینچے۔ ہنسی اوپر اٹھائیں اور گردن کو جھٹک کر کہا۔

(میرا مطلب ہے، موسیقی اور قص)

خواتین و حضرات! چودہ اگست ہمیں ہمیشہ یاد دلانا رہے گا کہ ہم نے پاکستان لاکھوں مسلمان بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ ہم آگ اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں آئے تھے۔

مقرر نے جھٹک کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہا۔ سیکرٹری صاحب نے دوسرے کے کان میں کھسکھسکی۔ دوسرے کے ہونٹ تیسرے کے کان کے پاس گئے اور اسی نے فوراً جیب سے ڈائری نکال کر مقرر کی تقریر کے اقتباس لینے شروع کر دیے۔ اب صاحب صدر کی بائیں تھی۔ سیکرٹری صاحب دس منٹ تک صاحب صدر کی سوشل حیثیت، ان کی علمی قابلیت، ان کے تمغائے امتیاز، ان کے ورلڈ ٹور اور ان کی خوش خلقی کے بارے میں رطب اللسان رہے۔ صاحب صدر تالیوں کی گونج میں اٹھے۔ ٹائی کر گرہ بھیک کی۔ مائیک کا متہ اپنی طرف کیا۔ ذرا کھٹکارے۔ ذرا مسکرائے اور پھر سنجیدہ ہو کر فرمایا: "خواتین و حضرات....." اسی کے ساتھ ہی پریس فوٹو گراف

کے فلیش چمک اُٹھے۔ ٹیلی ویژن کی تیز روشنیاں اور انفارمیشن کے کیمرے اُن ہو گئے۔ بیل بائوں نے سانس روک کر پوز بنالیا۔ ساڑھیوں نے منہ مٹی ہوئی بھوس ترچی کر لیں۔ فوٹو گرافر گھوم گھوم کر صاحب صدر اور خواتین و حضرات کی مختلف تصویریں لینے لگے اور ریڈیو کا نمائندہ ریکارڈر کی ٹیپ اُن کر کے ہمد تن گوش ہو گیا۔

اور پھر میں نے چودہ اگست کے یوم کو دیکھا۔ اس کے بالوں میں خاک پڑی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں، زخمی پیر سو جے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ چکی تھیں اور نصف کٹی گردن سے خون کے فوارے اُبل رہے تھے۔ اس نے شیخ پر کھڑے ہو کر خواتین و حضرات کو دہشت زدہ، پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا اور پھر شیخ سے نیچے گر کر شہید ہو گیا۔ اس کی ویران آنکھوں میں پاکستاں سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا اور اس کی بچی اس کی لاش پر بیٹھی اپنے ابو کو رو کر آوازیں دے رہی تھی اور پھر ایک سکھ کی تلوار نے اس بچی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ موت اور دہشت کا سناٹا۔ فلش بلب جلتے رہے۔ ٹی وی کی روشنیاں چمکتی رہیں صاحب صدر ٹائی کی ناٹ بار بار درست کر کے تقریر کرتے رہے۔ پریس والے نوٹس لیتے رہے۔ خواتین و حضرات ایر کنڈیشنڈ ہال کی خوشبودار فضا میں بیٹھے دیواروں پر بنی ہوئی ریپٹر ایکٹ تصویروں کو دیکھ دیکھ کر بدھوتے رہے۔ کسی نے چودہ اگست کی خون آلود لاش کو شیخ سے گر کر شہید ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی معصوم بچی کے پھول جیسے جسم کو سکھ کی تلوار سے دو ٹکڑے ہوتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس کی پُر اذیت آخری چیخ نہ سنی۔ کسی نے اس کی چیخ کے بعد کا سناٹا محسوس نہ کیا۔

”خواتین و حضرات! خواتین و حضرات!“

میں نے چودہ اگست کو آج بائیس سال کے بعد بھی دیکھا ہے اور کی بائیس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔ گل ہم نے اسے بے کسی کے عالم میں بے کفن، لحد میں اتاٹا تھا اور آج ہم نے اس کی قبر پر دس دس منزلہ عشرت گاہیں تعمیر کی ہیں جن کی نیم تاریک رقص گاہوں میں یورپی موسیقی کی دھن پر عریاں بدن تھرکتے ہیں اور ایر کنڈیشنڈ باروں میں بادۂ تاب کے جام چھلکتے ہیں۔ چودہ اگست شہید ہو گیا۔ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر شہید ہو گیا اور ہم نے اس شہید کی مقدس قبر کو فروخت کر دیا۔ اپنی رقص گاہوں اور عشرت کدوں کے عوامی فروخت کر دیا۔ ہم نے اس کی یاد

میں قطب مینار سے بھی اونچے یادگار مینار بنائے اور خود اس کی سر ڈھیوں میں انیم کی پینک میں گر کر دم توڑ دیا۔ ہم نے چودہ اگست کی بڈیوں کو اٹھارے کنڈیشنڈ ثقافتی اداروں کے سپرد کر دیا۔ جہاں انہیں ڈیکوریشن میس بنا کر دیواروں پر سجا دیا گیا۔۔۔۔۔

چودہ اگست نے کفر کی اندھیری رات میں برہمنی سمندر کے فونیں طوفان سے نکال کر برصغیر کے مسلمانوں کو ساحل پاکستان تک پہنچایا، لیکن ہم نے ساحل مراد پر پہنچنے کے بعد اس لاسٹ ہاؤس کی روشنیاں گل کر دیں۔ ہم نے اپنے جہازوں میں آگ تو لگا دی، لیکن ہسپانیا فتح نہ کر سکے۔ ہم چودہ اگست کی لاش سے گورڈر آرہے ہیں اور اس کی بے گور و کفن لاش کے پاس اس کی بچی کی لاش کے ٹکڑے بھی بکھرے پڑے ہیں اور آسمان پر ابھی تک گدھیں منڈلا رہی ہیں۔۔۔۔۔

چودہ اگست کے مقدس شہید کے گل رنگ خون کی لکیر میرے قریب سے ہو کر گزرنے لگی ہے اور میں اس ثقافتی ادارے کے ہال میں بیٹھا اس خون کی لکیر کے ساتھ ساتھ ماضی کے دھندلے جنگوں میں نکل آیا ہوں۔ اس جنگ میں کوئی درخت نہیں، درختوں پر کوئی شاخ نہیں، شاخوں پر کوئی پھول نہیں۔۔۔۔۔ یہ کیسا جنگل ہے! خواتین و حضرات! یہ کیسا جنگل ہے۔۔۔۔۔

اس جنگ میں ایک دریا بہتا تھا۔ اس دریا کے کنارے اگست کی بارشوں میں مسلمان حجاجین کا ایک قافلہ آکر رکتا ہے۔ یہ لوگ دیارِ ظلم سے دیارِ امن کی جانب ہجرت کر رہے ہیں۔ تنگے مارے بے کس و بے بس، دہشت زدہ، حیرت زدہ، پاکستان چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ چالیس میل چالیس ہزار میل ہو گئے ہیں۔ دریا کا نام بیاس ہے۔ برسات میں دریا میں سیلاب آیا ہوا ہے۔ مشرقی پنجاب کے صین شہروں، قصبوں، دیہاتوں، شہروں کے گلی کوچوں، گلیوں کے پرانے مکانوں کی پر اسرار نیم روشنی ڈیوڑھیوں اور ڈیوڑھیوں کی صدیوں پرانی دھبڑوں سے نکالے ہوئے مسلمان بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہے۔

اچانک ایک طرف سے حملہ ہوتا ہے۔ گولیاں، برچھے، گریباں، اسکیم، دیباقی برکھ، کالی کھ ہند، مسلمانوں کے ازل دشمن ہندو۔ ہر طرف شور غل مچنے لگا ہے۔ جہا جہاں شہید ہو رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، زخمی ہو کر تڑپ رہے ہیں، جو مقابلہ کرتا ہے وہ بھی شہید ہو جاتا ہے جو مقابلہ نہیں کرتا وہ بھی شہید ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو پکار رہا ہے۔ ماں بیٹی کو آوازیں دے رہی ہے

خاوند بیوی کو بچاتے ہوئے قتل ہو رہا ہے۔ بیوی خاوند کی اکبر پر قربان ہو رہی ہے۔ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر کھیتوں کی طرف بھاگتی ہے۔ دو سکھ تواری لہراتے اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ بچہ ماں کی گود سے چین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ ماں بے ہوش ہو جاتی ہے اور سکھ بے ہوش ماں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اب وہ مر جائے گی۔ رضیہ، ثریا اور تاج لہابی کی حیثیت سے مر جائے گی۔ اب وہ کسی معراج دین، کرم داد اور جمال خان کو جہنم نہیں دے گی۔ اب اس کا نام ہر گوبند کور ہو گا اور اس کے بچوں کا نام درشن سنگھ اور پریتم کور۔۔۔۔۔

خواتین و حضرات۔۔۔ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ قوم کی خدمت کو میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے اور میں اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ مثلاً میں آج رات کوٹلی ویشن پر اپنی آج کی صدارتی تقریب کا پروگرام بڑے شوق سے دیکھوں گا اور۔۔۔ اور رات کو ریڈیو نیوز ریل پر اپنی آواز بھی سنوں گا اور صبح اخباروں میں اپنی تصویریں بھی ضرور دیکھوں گا۔ خواتین و حضرات! چودہ اگست کا دن ہمیں یہی سبق سکھانا ہے کہ۔۔۔۔۔

کہ۔۔۔۔۔ صاحب صدر جھگ کر سیکرٹری کے کان میں کچھ کہتا ہے سیکرٹری دوسرے آدمی کے کان میں کچھ کہتا ہے اور وہ فوراً ٹھنڈے پانی کا نیا بلورس جگ لاکر میز پر رکھ دیتا ہے۔ چمکے جگ میں ریفریجریٹر کی بوتلوں سے نکالا ہوا شفاف پانی چمک رہا ہے۔ اور گلدان کے زرد کارٹیشن پھولوں پر اُس کا عکس بھر بھر رہا ہے اور میں دریائے بیاس کے گدے، مٹیالے خونی، سیلابی بٹھائیں مارتے پانیوں کی طرف ایک کنواری مسلمان مہاجر لڑکی گونگے سر، تنگے پاؤں بھاگتے دیکھ رہا ہوں ایک ہندو تلوار لیے اس کے پیچھے دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ زندگی ہے۔ بربریت ہے۔ مسلمان لڑکی کے کپڑے تار تار ہیں۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے دریا کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ پاکستان کی طرف بھاگی جا رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ ایک بھنور ابھرتا ہے اور پھر دریا کی کف اڑاتی لہریں اس پاکباز مسلمان لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی گہرائیوں میں گم کر لیتی ہیں۔ پہنچ گئی اپنے پاکستان۔۔۔ ہندو نفرت سے قہقہہ لگا کر چیختا ہے۔۔۔۔۔

دریا کی لحد نے سید بن کر مسلمان مہاجر لڑکی کے ناموس کا موتی کو اپنے سینے میں چھپالیا ہے۔ ۱۳۔ اگست، ۱۹۴۷ کو میں پنجاب میل میں سوار دلی سے امرتسر آ رہا ہوں، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر وحشت و دیرانی کی مہریں لگی ہیں۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے شہروں کے ریلوے پلوں اور پھاٹکوں سے گزرتی ہے تو ٹیڑھی میڑھی سرنگیں سنان نظر آتی ہیں۔ مکانوں کی منڈیروں پر گدھیں بیٹھی ہیں۔ گاڑی پنجاب میں داخل ہوتی ہے تو اس دیرانی اور وحشت زدگی کی فضا میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کسی کھیت میں بل نہیں چل رہا۔ کچے مکانوں پر موت کے بھیانک سائے منڈلا رہے ہیں۔ لدھیانہ، اچھواڑہ اور جالندھر کے پلیٹ فارموں پر سفید برقع پوش مسلمان عورتوں اور بچوں اور پریشان حال مردوں کے ہجوم سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہندو اور سکھ تنگی تواریں لیے دندنا تے پھر رہے ہیں۔۔۔۔۔

گاڑی امرتسر شہر کے مضافات میں داخل ہو رہی ہے مانا نوالہ سٹیشن گزر گیا ہے۔ اب دائیں جانب چالیس کھوکھور رہے ہیں۔ بڑی نہر قیم سرخ برساتی پانی سے لبالب بھری ہے، مگر وہاں مسلمان امرتسر کی نوجوان قورن کے دیگے چڑھاٹے، آموں کے ٹوکے نہر میں لٹکائے، نہر میں چھلانگیں لگا کہیں نظر نہیں آ رہے۔ اب بنالہ اور پٹھانکوٹ کو جاتی ریلوے لائن میں لائن سے اکن ملی ہے۔ شریف پورے کے سرودوں، ناشپاتیوں، لوکاٹوں اور آلوچوں کے باغ اُڑے ہوئے ہیں۔ شریف پورے کے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے مسلمان، پاکستان زندہ باد کے فلک شکاف نعے لگا رہے ہیں۔ مسلم ہائی سکول اور بھائیوں والے باغ کاریلوے پھاٹک بھی دیران ہے۔ دور بھائیوں والی نہر کی سرخ اینٹوں والی پکیا لک پک کے لیے دکھائی دے کر پیچھے گزر جاتی ہے۔ گرمیوں کی مدھروں میں ہم سکول سے بھاگ کر اس نہر پر نہانے آیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر پلایا پر سے مٹھیاں چم چم کر نہر میں چھلانگیں لگاتے گزر جاتی۔ پھر ہم سرودوں کے باغوں میں گھس جاتے اور کچے کچے سرود توڑ توڑ کر کھاتے۔۔۔۔۔

نہر گزر گئی۔ یہ اس نہر کی آخری جھلک تھی۔ اس کے بعد پھر اس نہر میں نہانا نصیب نہ ہوا کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی تیز صوب والی دوپہر کو، نفل میں کتابوں کا چھوٹا سا لٹک لٹکا کر لاہور سے نکلوں اور سیدھا اس نہر کی پلایا پر جا کر مٹھیاں چم کر چھلانگ لگا دوں اور پھر کبھی سر باہر نہ نکالوں۔ مگر یہ جیت پسند خیال ہے۔ شکست خوردگی کے احساس کا پر تو ہے۔ یہی نوزندگی کی دوڑ میں آگے ہی آگے

بڑھتا ہے۔ پرانی نہر ہم سے چٹ گئی ہے تو نئی نہریں پہاڑوں سے کاٹ کر لائی ہیں۔ خسرو پوریز کے لیے نہیں اپنی شیریں کے لیے مستقبل کی درختانی کے لیے۔۔۔۔۔

پنجاب میل کمپنی باغ والے پھانگ سے گزرتی ہے! اُنیں جانب عید گاہ کا تالاب نظر آتا ہے۔ جامن کے درخت کالی کالی موٹی جامنوں سے لدے ہوئے ہیں، لیکن لڑکیوں کی ٹولیاں غائب ہیں۔ پنجاب میل امرتسر کے شیش میں داخل ہوتی ہے۔ تینویلیٹ فارمیں پر مسلمان عورتوں اور بچوں کے ہجوم ہیں۔ یہ لوگ دائم گچ اور تکی گھر کی مسلمان آبادی ہے، جو کسی طرح یہاں تک پہنچ گئی ہے اچانک ستیلا مندر کی جانب سے ان مسلمانوں پر فائرنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ایک عورت کی پیٹ باندھتی ہے۔ عورتوں کی آہ دہکا اور بچوں کی چیخ پکار سے وہاں کھرام مچ جاتا ہے۔ امرتسر شہر میں کرفیو لگنے میں صرف بیس منٹ باقی ہیں۔ شیش پر مجھے میرا ایک دوست مل جاتا ہے۔ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ساری رات پلیٹ فارم پر گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے گھروں میں جانے کا خطرہ مول لے لیں۔ ہم شیش سے باہر نکلتے ہیں۔ جاٹ اور گورکھا سپاہی دران سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ ہم بیڑھیوں والے پل سے اترتے ہیں تو ایک مکان کی کھڑکی کھلتی ہے ایک گردن نمودار ہو کر کہتی ہے: اوٹے منڈیو! جیتی کرو اوٹے۔ کرفیو لگن والا ہے۔۔۔۔۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے، گول باغ کے پہلو سے ہو کر ایم اے او کالج کے عقب میں آتے ہیں تو کرفیو کا ہڑمڑ چینے لگتا ہے۔ میرے دوست کا مکان اسی محلے میں تھا۔ میں بھاگ کر اپنے دوست کے مکان میں گھس جاتا ہوں۔ امرتسر میں ہر طرف آگ لگی ہے۔ ہندو سکھوں کے گھروں سے مسلم گھروں پر مسلسل فائرنگ کی جا رہی ہے۔ امرتسر کے مسلمان سپاہیوں سے اسلحہ لے لیا گیا ہے۔ شہر میں بہت تھوڑی گورافوج ہے باقی ساری فوج ہندو ڈوگرہ اور گورکھا سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ صرف ریلوے شیش اور شریف پور سے میں بلوچ رجمنٹ کے جوان امرتسر کے نہتے اور دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔۔۔۔۔

میرے دوست کے مکان کے آگے ہندوؤں کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ ادھر سے مسلسل فائرنگ ہو رہی ہے، ہم چل رہے ہیں۔ اس کشمکان میں محلے کی ساری عورتیں اور بچے جمع ہیں۔ عورتوں کے رنگ زرد ہیں اور بچے دہشت سے کھلا گئے ہیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں

کہ اگلے لمحے کیا ہوگا۔ ایک فوجی لڑکی کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے۔ ساتھ والی گلی میں گوجر کے مکان میں ایک بوڑھے مسلمان کی لاش پڑی ہے مگر وہاں کون جائے!

زندوں کا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے مردوں کو کون سنبھالے!

رات کے نو بجے اچانک بجلی فیل ہو جاتی ہے۔ ہر طرف گھٹپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ گلیوں اور گھروں کے دھماکے بڑھ جاتے ہیں۔ مکان میں عورتیں اور بچے اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتے ہیں۔ ”چپ رہو۔ جب تک ہم زندہ ہیں۔ تمہاری ہوا بھی کوئی کافر نہیں دیکھ سکتا۔۔۔“

اگلے روز صبح نو بجے کرفیو کھلتا ہے۔ میں اپنے محلے کی طرف بھاگتا ہوں۔ امرتسر کی فضا یکسر بدل گئی ہے۔ مسلم آبادی اپنے اپنے گلی کوچوں میں قید ہو کر رہ گئی ہے اور شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہال بازار ویران ہے مسلمانوں کی دکانیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ میں گلیوں گلیوں ہوتا بجلی والے چوک میں جا نکلتا ہوں۔ دھور سے ایک گورکھا فوجی مجھے دیکھ کر آگے بڑھتا ہے۔ میں لپک کر دوسری گلی میں گھس جاتا ہوں۔ اگرچہ کرفیو کھلا ہے لیکن جو بھی مسلمان اپنے محلے سے باہر نکلتا ہے۔ اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ میں چھپتا چھپاتا اپنی گلی میں جا نکلتا ہوں۔ پکتا گلی کی دھڑکن اور گلی غزنی کے سارے مسلمان اٹھ کر ہماری گلی میں آگئے ہیں۔ گلی رنگریزاں کی مسجد میں مسلمان عورتوں کو بے دریغ شہید کر دیا گیا اور بچوں کو پھپھو پر سے بجلی کے تاروں پر اچھال دیا گیا۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے جانیں بچا کر پہنچے ہیں۔

”بازار بکرواناں میں مسلمانوں کو قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور سکھیوں نے ہندو فوجیوں کی زیر نگرانی ایک ایک کر کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جو لڑکا سب سے اخیر میں کھڑا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو گردنیں کٹتے دیکھیں تو چپکے سے کھسک کر جناب ماسٹر اٹھ بنش مرحوم کے مکان والے کنوئیں میں کسی مذہبی طرح لٹھا رہا۔ اگلے روز بلوچ رجمنٹ کا ایک ٹرک مسلمانوں کو وہاں سے نکالنے آیا تو اس نے کنوئیں میں چلنا شروع کر دیا۔ اس لیے نیم جاں حالت میں ٹرک میں ڈال کر شریف پورہ کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

گھر والے میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھا تو جان میں جان آئی، لیکن سوال

یہ تھا کہ گلی میں سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کیسے پہنچا جائے؟ چودہ اگست کی رات آگئی۔ اس رات امرتسر میں جتنی گولی چلی، کہتے ہیں سارے فسادات میں اتنی گولی نہیں چلی تھی۔ ایک ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد تھری ناٹ تھری کا فائر ہوتا تھا۔ دستی بموں کے دھماکوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مسلمانوں کی لاشیں ہندو سکھوں کے گلی کوچوں میں بے گور و کفن بکھری پڑی تھیں۔ فضا میں بارود، جلی ہوئی لاشوں مٹی اور تارپین کے تیل کی تیز بوڑھی ہوئی تھی۔ بوڑھے رمزی سار کا جوان بیٹا سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔ وہ چوک پر اگلاس کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے گیا اور وہیں مسجد کے صحن میں شہید ہو گیا۔ بڈھا باپ اپنے بیٹے کی لاش بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ گلی والے نلکے کے پاس چارپائی پر بیٹھا اپنے جوان بیٹے کے غم کو سیتے سے لگائے روتا رہا۔ چودہ اگست کی رات کو گولیوں، بموں اور عورتوں بچوں کی چیخ پکار میں وہ بار بار روتے ہوئے یہی کہتا: جو مر گئے وہ اچھے رہے میرے مولا!

رات کے تین بجے فائرنگ کی آوازیں تیز ہو گئیں اور ہندو سکھوں کے نعرے زیادہ قریب سنائی دینے لگے۔ پو پھٹے گولیاں ہمارے مکانوں کی چیتوں اور مٹیوں سے ٹکرانے لگیں۔ لوگ پریشان ہو گئے۔ دن چڑھتے ہی گورکھا اور سکھ فوجیوں نے ہماری گلی کے آہنی دروازے پر بم مارا۔ ایک زور دار دھماکا ہوا اور دروازہ ایک طرف کی پچک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں ہودے بچے اور بوڑھے سبھی گلی کے دوسرے تنگ دروازے میں سے نکل کر شریف پورے کی طرف بھاگنے لگے۔ اب گلی کے سرے پر مکانوں آگ لگا دی گئی اور سکھوں کے نعرے بلند ہوئے۔ سکھ اور ہندو غنڈے فوج کی مدد سے گلی میں داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے مکمل عام اور لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ میں نے گلی میں بھاگتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ دو سکھ تعاروں سے بوڑھے رمزی پر وار کر رہے تھے اور وہ دونوں کمزور ہاتھ اٹھا اٹھا کر ان کے واروں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ میری والدہ، بہنیں، بھائی، سب کی والدائیں، بہنیں اور بھائی بے بسی کے عالم میں شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں جی ٹی روڈ پر تھی۔ یہاں سے ان مسلمانوں پر ایک سکھ فوجی ٹرک سے فائرنگ ہوئی۔ موسیٰ، شال مرچنٹ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے بھاگا جا رہا تھا کہ گولیوں کی بوچھاڑ اس پر پڑی۔ وہ اپنے معصوم بچے سمیت شہید ہو کر سڑک پر گرا اور پھر نہ اٹھ سکا۔

شریف پورے کی جانب سے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی اگر بلوچ جوان سکھ فوجیوں کے ٹرک پر فائرنگ نہ کھولتے تو شاید یہی ہماری گلی کا کوئی مسلمان زندہ بچتا شریف پورے نے کیمپ کی شکل اختیار کر لی۔ چونکہ یہ مسلم آبادی تھی۔ اس لیے اسے کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا اور باہر جی ٹی روڈ کی طرف بلوچ رجمنٹ نے پوزیشن سنبھال لی۔ اس رجمنٹ کے جوانوں کو اب امرتسر شہر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ شہر پر ہندو سکھوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ امرتسر شہر کے گلی کوچوں، حویلیوں اور مکانوں میں سوائے مسلمانوں کی لاشوں اور بکھرے ہوئے سامان کے اور کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ امرتسر کے بہادر جیالوں کی لاشوں کو خاک خون میں تڑپانے کے بعد یہ شہر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔۔۔۔

مسلمان امرتسر جل رہا تھا۔۔۔۔

مسجدوں، مکانوں کے دیوان خانوں، چیتوں، مٹیوں، سیرٹھیوں اور آنگنوں میں مسلمان عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی خاک و خون میں آٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ جل رہا تھا۔ ان میں حامد برٹ بھی تھا۔ اونچا لمبا، گورا چٹا کشمیری نوجوان اور ہاکی کا بہترین کھلاڑی۔ اپنے جانثار چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کا لاڈلا بھائی اور میرا دوست۔ بہترین دوست۔ ان میں مولوی طاہر شاہ بھی تھا۔ پابند صوم و صلوة، نیکدل، اسلام کے نام پر ہی شہید ہو گیا۔ ان میں اس ایف اے پاس لڑکی کی لاش بھی تھی، جس کو سکھ اور ہندو غنڈے اٹھا کر رام تلانی کے مندر میں لے گئے تھے اور جہاں اس نے مندر کی سب سے اونچی چھت پر سے چھلانگ لگا کر اپنی جان اور پاکستان کی عزت و آبرو پر قربان کر دی تھی۔۔۔۔۔

ان میں کئی حامد برٹ، کئی طاہر شاہ، کئی بوڑھے رمزی اور کئی عفت مآب بہنیں، بیٹیاں اور مائیں تھیں، ان کی خون آلود نعشیں تھیں۔ ان کے معصوم بچوں، بھائیوں، بہنوں اور بیٹوں کی نعشیں تھیں۔ اپنے دامن میں ہمارے یہ گویا بچے گراں مایہ لیے امرتسر جل رہا تھا۔ مسلمان امرتسر مسلمان بالندہ اور مسلمان لدھیانہ، فیروز پور، ہوشیار پور اور روہتک و حصار، جوں و کشمیر جل رہا تھا اور ہجرت کرتے والے بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلے لٹتے، کھٹتے ہگاڑیوں میں، ٹرکوں میں ٹرینوں میں، پاپیادہ پاکستان کی طرف، دیارِ اسلام کی طرف، دیارِ امن و انصاف کی طرف بڑھتے

چلے آ رہے تھے۔۔۔

شریف پور سے ریفیو جی ٹرینیں پاکستان کی طرف چلنے لگیں۔ چھتوں تک بھری ہوئی ٹرینیں،
لٹے پٹے زخمی، غم زدہ، پریشان حال، خستہ جاں مسلمان مہاجرین سے لدی ہوئی ٹرینیں جنہوں نے اپنی مائیں
بہنیں، بچے، بیٹے، باپ جان اور مال۔ سبھی کچھ پاکستان کے نام پر، اسلام کے نام پر قربان کر
دیا تھا۔ جن کے گریبان تار تار تھے۔ مگر خون خون تھے، مگر دل پاکستان کی محبت سے بھر پور تھے۔
چھ برٹش سٹیشن پر سکھ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کر دی۔ گردوارے کی طرف سے اکالی سکھوں نے
گاڑی پر حملہ کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔ طاہر ہے حملہ آور سکھوں
کو بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاڑی ایک بار پھر پاکستان کی طرف رینگنے لگی۔ خاصہ سٹیشن گزر گیا
تو یہی نے کھڑکی کا ذرا سا پٹ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ جھاڑیوں میں ادھر ادھر جا بجا ان مسلمان پٹھانوں
کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جو ایک روز پہلے شریف پور سے اپنے گدھے لے کر پیدل ہی چل پڑے
تھے اور لوگوں کے منہ کرنے کے باوجود نہیں رُکے تھے۔ ان بہادر اور غیور پٹھانوں نے پاکستان
سے بیس میل دور شہادت پائی۔۔۔۔۔

والگہ سٹیشن پر دور ہی سے پاکستان کا سبز ہلالی پرچم دھوپ میں لہراتا نظر آیا تو ٹرین میں زندگی باہر
دور لگتی۔ فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔۔۔۔۔
”ہمارے ڈبے میں ایک زخمی بوڑھے کسان نے منہ اٹھا کر پوچھا کیا پاکستان آگیا؟ کسی نے کہا۔
ہاں بابا جی پاکستان آگیا۔ وہ دیکھو پاکستان کا جھنڈا۔“

”بوڑھے کسان نے گردن ذرا سی اٹھا کر کھڑکی میں سے باہر سبز ہلالی پرچم دیکھا۔ اس کے خستہ حال
نیم مرزہ چہرے پر ایک چمک سی آئی، اس نے کمرے پرٹھا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ شہید ہو گیا۔ پاکستان زندہ باد
بوڑھا کسان زندہ باد، حامد بیٹ زندہ باد، بوڑھا مزی زندہ باد، طاہر شاہ زندہ باد مسلمانوں کا امرتسر زندہ باد چوک
فرید زندہ باد، چوک پر اگداس کی مسجد زندہ باد دریائے بیاس کی لہروں میں سوئی ہوئی بہن زندہ باد رام تللی کے
مندر سے پھلانگ لگا کر شہید ہونے والی بیٹی زندہ باد! چودہ اگست زندہ باد!

خواتین و حضرات! خواتین و حضرات!۔۔۔

امرتسر کا جلیا نوالہ باغ

سماوار میں سبز چائے جوش کھانے لگی۔

کشمیری چائے کی لطیف بھاپ نے کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کی خوشبو
سے مل کر کمرے کو مہکا دیا۔ ریکمانہ ٹیلی پتی دار جا پانی پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی اور میں
نے پائپ سلگایا۔ اب کمرے کی فضا میں ایک تیسری خوشبو نے جنم لیا۔ کشمیری چائے گلاب
کے پھول اور ایرن مور تمباکو کے فلیور کا ملاپ۔ یہ تھی تیسری خوشبو۔ امرتسر کی خوشبو۔ کہنی باغ
کے بارش میں بھیکتے اور گرم دوپروں میں بڑی نہر کے کنارے اُگے ہوئے مرطوب گھاس
اور رات کے پچھلے پیر امرتسر کی کسی لگی سے ڈول میں سوار ہو کر رخصت ہوتی دلہن کی خوشبو
امرتسر اس وقت میری سبز چائے کی پیالی میں تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں میں تھا اور میرے
پائپ کے فلیور میں تھا اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے والد صاحب کی سمٹی ہوئی آنکھوں
میں تھا۔

ابا جی چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ آج میں اُن سے امرتسر کے جلیا نوالہ باغ
کے بارے میں کچھ باتیں کرنے والا تھا۔ جب کبھی وہ مجھے میز پر بیٹھے کچھ نہ کچھ لکھتا دیکھتے
تو کہا کرتے۔ ”حمید یار کبھی ہماری ڈائری بھی نوٹ کر لو۔ عمر کا کیا بھروسہ!“

ڈائری سے اُن کی مراد جلیا نوالہ باغ کے واقعات تھے۔ جس وقت جلیا نوالہ باغ میں
جنرل ڈائرنے گوتی چلانے کا آرڈر دیا، ابا جی دوسرے لوگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں موجود
تھے۔ میں ہنس گر ٹال جاتا۔ لیکن اُس روز میں نے والد صاحب کی جوانی کی یادوں کے سمندر
میں غوطہ رگنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بحر بند کا تاریک سمندر تھا۔ ہیبت ناک کا سہ پانی کا سمندر

تھا جس کی مہیب شوریدہ سر موجوں کو چیرتے کبھی امرتسری محب وطن قیدیوں سے بھرے ہوئے جہاز گزرے تھے۔ ان جلاوطن عمر قیدیوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس لئے کہ امرتسر کا مسلمان سیاسی اعتبار سے زیادہ بیدار تھا اور اُس میں ہندو اور سکھوں کے مقابلے میں آزادی کی زیادہ ترپ اور زیادہ دلولہ تھا۔ بقول اباجی، جلیانوالہ باغ کی تاریخ امرتسری مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہے۔

جلیانوالہ باغ پر خونیں حادثے کو گزرے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے تھے میں امرتسر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں نویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ اور جلیانوالہ باغ میں دوستوں کے ساتھ دن میں ایک آدھ بار لگی ڈنڈا کھینچنے ضرور جایا کرتا۔ یہ باغ ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ کہنے کو تو یہ باغ تھا لیکن اس میں باغ کہیں نہیں تھا۔ بس ایک گول میدان سا تھا جس کے چاروں طرف اونچے اونچے مکانوں کے پچھوڑے لگتے تھے۔ میدان میں ایک پرانی سجادہ تھی۔ ایک چھتری نما زنگ خوردہ چھت والا اندھا کنواں تھا۔ (جب گولی پٹی تو یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا تھا) باقی میدان میں ادھر ادھر کچھ درخت تھے۔ کہیں کہیں گھاس اگی تھی ایک جانب ڈھکی ہوئی ہنسلی تھی جس میں دو موٹی نہر کا پانی بہہ کر دربار صاحب کے تالاب کو جاتا تھا۔ ایک بار ہماری لگی باغ کے اندھے کنوئیں میں گر گئی۔ ہم اُسے نکالنے کے جتن کر رہے تھے کہ ایک فقیر نے ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”بچو! اس کنوئیں میں سینکڑوں ماؤں کے لال دفن ہو گئے۔ تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“

ہمارا گھر کوتوالی کے عقب میں تھا۔ کوتوالی سے ہو کر جب آپ کیسری باغ کے سامنے ملکہ کے بت والے چوک سے گوریں تو سامنے دتے پٹھان کی بیٹھک کے پہلو والے بازار میں اونچے چوڑے مکانوں میں بھنپا ہوا جلیانوالہ باغ کا آہنی سلاح دار دروازہ آجائے گا۔ یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ آگے ایک چار فٹ چوڑی کچی راہداری ہے جو بتدریج فرامند ہو ہو کر دھلان کی شکل میں باغ میں اتر گئی ہے اسی اونچان پر ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائمر کے گورکھا سپاہیوں نے مورچے سنبھالے تھے۔ چاروں طرف مکانوں کے پچھوڑے ہیں جن کی کھڑکیاں میں اکثر کھلی دیکھتا۔ ہندو سکھ اپنے مکانوں پر مسلمانوں کی طرح چھتیں

نہیں ڈالا کرتے۔ ان کھلی بے پردہ کھڑکیوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اُن آنکھوں کا خیال آتا جن کی ٹیکس غائب ہوں۔ کہیں کہیں مکانوں کی دیواروں پر لکڑی کے جالی دار چوگھٹے لگے ہیں جن کے نیچے لکھا ہے ”گولی کا نشان“۔ جالیوں کے پیچھے ابھی تک اینٹوں میں سوراخ دیے ہی تھے۔ یہاں بے رحم گولیوں کے نشان تھے جو انگریز بریگیڈ نے جنرل آر۔ اکر۔ ایچ ڈائمر کے حکم سے اس تاریخی باغ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی ایک سہ پہر کو نہتے امرتسریوں پر برساتی لگیں۔ میرے والد صاحب کی عمر اُس وقت ۳۰ برس کے قریب تھی اور وہ اُس جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

سبز چائے کی دوسری پیالی اباجی کے ہاتھ میں تھی اور اُس کی خوشبودار بھاپ اُن کے بوڑھے چہرے کی جھریوں کو دھندلاتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔ وہ آنکھیں نیم دائے گہری سوچ میں تھے اور انچاس سال پہلے کی یادوں کے گہرے سمندروں میں غوطہ زن تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ان تاریخی یادوں کی غواچی کروں اور کچھ انمول اور گمنام موتی چن کر لاؤں میں جلیانوالہ باغ کے پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور انگریزی حکومت نے ہندوستانی لیڈروں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کو ہوم رول دے دیں گے۔ لیکن فتح کے بعد نہ صرف یہ کہ انگریز اپنے وعدے سے پھر گئے بلکہ رولٹ ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ انگریز ہندوستان پر ۱۹۱۹ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سے راج کرتے چلے آئے تھے۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہندوستانی بانی کورٹ کے جج سر سرنی رولٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بیٹھی جس نے رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے ذریعے ہندوستانیوں کی رہی سہی آزادی بھی چھین لی۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت کو اندھا دھند گرفتاریوں کا اختیار مل گیا اور مقدمہ چلانے بغیر سزاؤں کے خلاف اپیل کا بھی عوام کو حق نہ تھا۔ ہند کے مسلمان پہلے ہی انگریزوں سے بدعین تھے۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ زور مسلمانوں پر ہی پڑی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو ابھی اپنی منزل کا تعین کرنا تھا۔ فی الحال وہ اپنے مشترکہ دشمن

کو کچلنے کے لئے کانگریس کے ساتھ تھے۔ یہ ہندو مسلمان اتحاد نہیں تھا۔ بلکہ انگریزوں کے خلاف ایک جنگ تھی، آزادی کی لگن اور ولولہ تھا۔ جس نے ان دو مختلف تہذیبوں کو ایک پل کے لئے ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا تھا۔

کانے قانون نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گاندھی نے سیتہ گروہ کی تحریک شروع کر دی یکم مارچ ۱۹۱۹ کو بمبئی میں سول نافرمانی کی قرارداد منظور ہوئی۔ مارچ کو دلی کے ایک جلسے میں کانے قانون کی پرزور مذمت کی گئی، ۶ اپریل کو کانگریسی اور مسلمان لیڈروں کے ایما پر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں کامیاب ہڑتال کی گئی۔ دلی ریوے سٹیشن پر جب ہڑتالیوں نے ایک ریڑی والے کو سو ڈالیمین پیچنے سے منع کیا تو ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے گولی چلا دی۔ دو ہڑتالی مارے گئے۔ لاہور، امرتسر، بمبئی اور دلی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ لوگوں نے اکا دکا انگریز شہریوں کو زور و کوب کرنا شروع کر دیا۔ لاہور میں ہڑتالیوں نے کالی جینڈیوں کا جلوس نکالا۔ سات، آٹھ اور نو اپریل کے دن امن کے گزر گئے۔

پہلا دھماکہ ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ کو ہوا۔

پنجاب کے اُس وقت کے گورنر سر مائیکل اوڈوئر کے حکم سے گاندھی کو بمبئی سے امرتسر آتے ہوئے پہلوال سٹیشن پر روک کر واپس روانہ کر دیا گیا۔ اس خبر کے پھیلنے ہی سارے ہندوستان میں بلوے شروع ہو گئے۔ اس اثنا میں جلیانوالہ باغ کا بدنام قاتل جنرل ڈائر دلی سے جالندھر اپنے ہیڈ کوارٹر جا چکا تھا۔ گورنر پنجاب کے حکم پر اُس نے امرتسر ریوے سٹیشن کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا۔ دس اپریل کی دوپہر کو دائرلیس کے ذریعے جنرل ڈائر کو ایک خفیہ پیغام ملا جس میں کہا گیا کہ جتنی جلدی ہو سکے مزید فوج، ہلکی توپیں اور ایک ہوائی جہاز امرتسر بھیجا جائے۔

امرتسر میں ۱۸۵۷ کے بعد آزادی کا دوسرا حوالہ کبھی پھٹ پڑا تھا۔ ہڑتالیں، زوروں پر تھیں۔ امرتسر کے گلی کوچوں اور بال دروازے کی دیواروں پر جابجا پوسٹر لگے تھے جن پر لکھا تھا۔

”امرتسر کے شہریو! مارو یا مر جاؤ“

رام نوئی کے تہوار پر شہر میں ایک زبردست جلوس نکلا جس میں ”انگریزی راج مردہ باد“ کے نعروں لگائے گئے۔ امرتسر میں آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ امرتسر کے پلوں ریوے سٹیشن اور سول لائنز کی انگریز آبادی کی حفاظت کے لیے کمپنی باغ میں سومرسٹ لائیٹ انفنٹری نمبر ۱۲ ایمونیشن کالم اور رائل آرٹیلری کے فوجی تعینات تھے۔

۱۱ اپریل ۱۹۱۹ کو صبح آٹھ بجے دوسرے دو کانگریسی لیڈروں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر سیتہ پال کو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مائیکلزارونگ کی طرف سے پیغام ملا میرے بنگلے پر دس بجے تشریف لائیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے اُس وقت پولیس سے بھر ہوئی دو لاریاں اور ایک موٹر کار بنگلے کے عقبی حصے میں تیار کھڑی تھیں۔ جب یہ دونوں لیڈر ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے تو انہیں اُسی وقت گرفتار کر لیا گیا اور کار میں بٹھا کر دھرم سالہ روانہ کر دیا۔

کچلو اور سیتہ پال کی گرفتاری نے شہر میں آگ لگادی۔ لوگوں نے دھڑا دھڑ دکانیں بند کرنی شروع کر دیں۔ اور ہجوم در ہجوم ہال بازار میں سے گزر کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ گورا فوج نے سٹی جنٹریٹ مسٹر آر۔ بی۔ بیکٹ کی معیت میں فوراً انجن پارک والے ریوے پل کی دوسری طرف پوزیشن سنبھال لیں۔ آزادی کے متوالے امرتسر عوام کا یہ پھرا ہوا ہجوم جب نعرے لگتا پل پر پہنچا تو گورا فوج نے رائفیں تان لیں جلوس ایک پل کے لئے ٹک گیا۔ تیس ہزار کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بیکٹ گھوڑے پر سوار این۔ سی۔ او کو حکم دے رہا تھا کہ جلوس کسی حالت میں بھی پل عبور نہ کرنے پائے اور جلوس نے آگے بڑھ کر گورا فوج کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی نے مسٹر بیکٹ کے گھوڑے کے منہ پر سونٹی ماری۔ وہ الف ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے پتھر اڑاؤ شروع کر دیا۔ اُس وقت ایک گھڑ سوار فوجی نے پستول سے دو فائر کر دیئے جس سے دو آدمی زخمی ہو کر گرے۔ اُن کے گرتے ہی ہجوم ذرا پیچھے ہٹا۔ اُن زخمیوں کو اٹھا کر چوک فرید میں ڈاکٹر بشیر کی ڈسپنسری پہنچا دیا گیا۔ اب ہجوم بے قابو ہو گیا۔ امرتسر کے ڈی۔ ایس۔ پی مسٹر پلومرنے وہاں آتے ہی فائرنگ کا حکم دے دیا۔ گورا فوج نے

تورا گولی چلا دی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

”پھر کیا ہوا؟“

میں نے والد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے سگریٹ جلا یا اور آنکھیں ذرا سی میچ کر

بولے۔

”بس پھر کیا تھا۔ پل سے لوگ زخمی ہو کر اور لاشیں اٹھا کر شہر میں آئے تو ایک طوفان آگیا۔ امرتسر کے گلی کوچے انتقام کے نعروں سے گونج اٹھے۔ میں ان دنوں پورا جوان تھا اور پہلوانی کیا کرتا تھا۔ تکیہ شیخ چل میں غلام رسول حلوانی کے ساتھ زور کیا کرتا۔ بدن میں شباب کا خون گردش کر رہا تھا۔ میں بھی جلوس کے ساتھ وہاں سے لوٹ کر اپنے محلے میں آگیا۔ جس وقت میں مال بازار میں سکندر خاں والی اونچی مسجد کے پاس پہنچا تو میرے دیکھتے دیکھتے سامنے والے نیشنل بینک کو آگ لگا کر لوٹ لیا گیا۔ اس بینک کا ایک انگریز مینجر سوارٹ صاحب تھا اس کو قتل کر کے آگ میں پھینک دیا گیا۔ بجلی والے چوک میں بینک کی کوئی بڑی بڑی پٹیاں، پائپوں اور سرپوں سے توڑی گئیں اور ان میں سے جو ریشمی سوتی کپڑا اور سلمان نکلا اسے کچھ لوگ اٹھا کر بے گئے اور باقی وہیں چوک میں تندر آتش کر دیا گیا۔ اسی طرح ہمارے اپنے بازار میں محمد جان کی مسجد کے سامنے والے الائنس بینک اور سپلو والے چارٹرڈ بینک کو بھی ٹوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ بینک کے ہندو خزانچی نے انگریز مینجر کو بچانے کی کوشش کی مگر جیسے دھوبی نے انگریز کو بازوؤں پر اٹھا کر یا علی کا نعرہ لگایا اور آگ میں پھینک دیا۔ اس وقت امرتسر کے ان گھروں میں عورتیں بین کر رہی تھیں جہاں گورا فوج کی گولیوں سے چھلنی بھائیوں اور بیٹوں کی لاشیں پڑی تھیں۔“

والد صاحب نے سگریٹ کا کش لگایا اور ٹانگ سیدھی کر کے اسے دبانے لگے۔
نچے محمد جان کی مسجد اور یہ سارے بینک یاد آ گئے۔ یہ بعد میں پھر سے تعمیر ہو گئے تھے اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے برآمدوں میں کھیل کرتا تھا۔ پھر یہ بینک ہندو ساہوکاروں نے خرید لئے اور امرتسر کے مسلمانوں کا خون چوس چوس کر اک منزلہ سے دو منزلہ اور سہ منزلہ ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ان بنکوں کو فود ہم نے آگ لگا۔ نچے اس ہندو

بینک کی سہ منزلہ عمارت سے اٹھتے ہوئے شعلے آج بھی یاد ہیں جس کی چھت پر ایک آدمی شعلوں میں گھرا ہوا اس چوبے کی طرح دودھ اور دھواں بھاگ رہا تھا۔ یہ وہ چوبے تھے جنہوں نے اور جن کے آباؤ اجداد نے امرتسر کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی عمارت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اب میری امرتسر کی یادوں کا در کھل رہا تھا۔ میں نے پائپ سلگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یادوں کے در بند کر دیئے۔ اور سماوار میں سے گرم گرم چائے پیالی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ابا جی! کوڑیاں والے کھوہ کا واقعہ کیا تھا؟“

والد صاحب نے اپنے خشکی سر کو کھجایا اور اپنی پیالی پر جی ہوئی بالائی کو پھونک مار کر بولے۔

”ایک انگریز لیڈی (مس فارسلا شیر وڈ) جو کہ امرتسر کے مشن سکولوں کی بڑی استانی تھی سائیکل پر سوار گھر کو جا رہی تھی کہ راستے میں بدوائیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ بھاگ اٹھی۔ لیکن کوڑیاں والے کھوہ والی گلی میں پہنچ کر سائیکل سے گر پڑی۔ لوگوں نے اسے وہیں ختم کر دیا۔ بعد میں جب مارشل لا لگا تو جنرل ڈائر خود وہاں پہنچا اس نے گلی کوڑیاں والی کھوئی کے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ گھر سے نکلیں تو گلی کے فرش پر گھٹنے ٹیک کر بازار میں آئیں اور ویسے ہی گھروں کو واپس جائیں۔ مگر اس وقت ابھی مارشل لا نہیں لگا تھا۔ اس وقت امرتسر میں کاراج تھا۔ اور یہ امرتسری نٹانوسے فی صد مسلمان تھے۔ یہاں تک کہ جلیانوالہ باغ بھی مسلمانوں کے محلے میں تھا۔ ہندو سکھ محلوں میں کسی جگہ بھی بنکوں کو آگ نہیں لگی تھی۔ کانگریسی لیڈر محسن نعرے لگاتے۔ کانگریسی ہندو ان نعروں کا جواب دیتے اور بس۔۔۔ دشمن سے لڑنا اور مقابلہ کرنا، یہ کام امرتسر کے مسلمانوں کا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی اس بات کی گواہ ہے۔ میں نے ماچس جلا کر والد صاحب کا سگریٹ سلگایا۔

”لیکن ابا جی! آپ تو کہا کرتے ہیں کہ ٹوٹ کا مال ہمارے محلے میں بھی آیا تھا۔“
”ضرور آیا تھا۔ ہر جگہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گاما رنوگر جو ملل کا تھان لایا وہ

اسی گز کا تھا۔ اُس نے فوراً اُسے اگلا کر کُرتے سلوائے۔ احمد دین پٹولے کا بھائی اسی ملل کارنگ دار کُرتے پہن کر جلیانوالے باغ جلسہ سننے گیا تھا کہ گولی کھا کر مر گیا۔ ایسے ہی لوگ تھے جنہوں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کو تو الی میں ٹاؤن ہال کے کونے میں پہلے ایک ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا۔ مسجد عیدالون گل ڈبگراں کے مولوی صاحب کا جوان بیٹا غلام حسن میرا یار تھا۔ بڑا شینہ جوان تھا۔ ہم دونوں جمعے کے جمعے سخی سرور والے اکھاڑے میں زور کیا کرتے تھے۔ وہ ڈاکخانے کا دروازہ توڑ کر اندر چلا گیا۔ بس جوانی کے زور میں ایسا کر گیا۔ سینے میں آزادی کی آگ جو لگی تھی۔ اندر جا کر اُس نے روپے اور نمکٹ نکالے اور انہیں باہر سڑک پر لا پھینکا۔ اور نعرہ مار کر بولا۔

”یہ کافر کا مال ہے۔ اسے آگ لگا دو۔ یہ مسلمان پر حرام ہے۔“

حمید میاں۔ جب مارشل لا لگا تو ایک ہندو اشٹام فردش نے اُس کی فحری کر دی۔ غلام حسین گرفتار ہو گیا۔ انگریز نے اُسے پھانسی کی سزا دی اور اسے میانوالی جیل میں پھانسی چڑھا دیا گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل اسی ولولہ خیز شہید کی یاد میں سو گوار ہو گیا جو برصغیر میں آزادی کے اولین بیج بونے والوں میں سے تھا۔ میں نے پیالی میں سے سبز چائے کا تلخ گھونٹ پی کر کہا۔

”سری قصائی کون تھا؟“

”سری؟ سری قصائی تھا۔ بڑا دلیر جوان تھا۔ چھ فٹ تھا۔ ہر جلسے، ہر جلوس میں جھنڈا اٹھا کر چلتا تھا۔ عید میلاد کے جلوس میں علیم کی دیگ کا ریڑھ لے کر سگری باغ جایا کرتا تھا۔ سری اُس کا نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ دوپہر کو گلی گلی پھر کر سری پائے بیٹا تھا اور ”سری! سری!“ آواز لگایا کرتا تھا۔ سب سے پہلا جلوس جس پر انجمن پارک والے ریلوے پل پر گولی چلی اُس میں سری نے لال رنگ کا ترک کی حکومت کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ اور رومی ٹوپی پر اتارک کی تصویر پن کے ساتھ لگی تھی۔ اُس کے نعروں نے جلوس میں آگ لگا دی تھی۔ وہ چار روپے تک میں آگ لگانے والوں کے آگے آگے تھا۔

وہ بنک کے چوترے پر کھڑا تھا اور بنک کے نوٹوں کی گڈیاں آگ میں پھینک پھینک کر کہہ رہا تھا۔

”کافر کا مال بھی کافر کے ساتھ جہنم میں جائے گا۔“

مارشل لا میں سری کی بھی فحری ہوئی۔ پکڑا گیا۔ پھینچا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پھانسی کے بعد جب اُس کی بھی لاش لگی میں آئی تو ایک کھرم مچ گیا۔

والد صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ اُن پرانے ہم جولیوں کی سو گوار یادوں میں کھو گئے تھے۔ جنہوں نے جوانی میں ہی اُن کا ساتھ چھوڑ دیا اور آزادی کے پرچم تلے اپنی جان قربان کر دی۔ میں نے پوچھا۔

”لیکن ابا جی! حاکموں کو ان لوگوں کے بارے میں پوری معلومات کس نے دیں؟“

”یہ خبریاں سی آئی ڈی کے ملازموں۔ دولت کے بچاری اور حاکموں کے مطیع ہندو ساہوکاروں اور اُن پہاڑیے ہندو نوکروں نے کیں جو سول لائنز میں انگریزوں کی کوٹھیوں میں کام کرتے تھے۔ وہ سووا سی آئی ڈی میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھیں۔ لال گیان چند ہی نے تو ڈی سی کو ہمارے محلے کے مسلمانوں کے نام دیئے تھے۔“

”لیکن یہ بتائیے کہ پھر اُس دور میں ہندو مسلم اتحاد کیسا تھا؟“

”اصل میں ہم تو پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا امرتسر میں کبھی بھی ہندو مسلمانوں کو ایک ساتھ مل کر بیٹھے نہیں دیکھا۔ اُن کا رہن سہن ہی ہم سے الگ تھا۔ برتن بھانڈے الگ تھے، برتنوں کے نام ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ ہر محرم کو فساد ہو جاتا۔ اُس وقت اصل میں انگریز ساخا دشمن تھا۔ تو مسلمان جا پانیوں کو بھی ساتھ بلا لیتے۔ رام نومی پر ہندوؤں کا مسلمانوں سے کس قدر اتحاد تھا۔ مجھے یاد ہے میں چکن کا کُرتہ پہنے، صوبونیاں والے بازار گیا تو ہندو لالوں نے تعالیٰ میں مہری اور لاجپیش کی۔ میرے کُرتے پر صندل میں بھگو کر ٹھپہ لگایا۔ مگر اس کے ایک ہی سال بعد ہندوؤں کے انہیں محلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلسے ہوئے اور انہیں قتل کرنے کی سکیمیں بنائی

گئیں۔ جس روز گول باغ میں جلسہ ہوا تو قمر و نے (قمر دین آف بنو اؤس انارکلی) مجھے آکر کہہ دیا تھا۔

خلیفہ اب یہاں سے پوریا بستر گول سمجھو۔ ہندو لیڈروں نے کہہ دیا ہے، مسلمانوں تم عرب سے آئے ہو عرب چلے جاؤ۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ہندو مسلمان ہندوستان میں ایک ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ رام نونی والا اتحاد اصل میں انگریزوں کے غلام تھا۔ مسلمان ہندوستان میں شروع ہی سے نجات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی ڈیڑھ سو برس کی غلامی میں انہوں نے کئی بار علم آزادی بلند کیا اور قربانیاں دیں۔ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ خون مسلمانوں کا بہا۔ ہندوؤں نے اس وقت بھی مخبریاں کیں، اور اپنے سرکاری عہدے پائے۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ میں بھی مسلمان ہی زیادہ تر شہید ہوئے۔ ہندوؤں نے مخبری کر کے چُن چُن کر جوان مسلمان شہریوں کو چھانسی پر لٹکایا یا کالے پانی بھجوا دیا۔ اب بھی دیکھ لو کبھی تم نے یہ بھی سنا ہے کہ فلاں ہندو لالہ کالے پانی سے رہا ہو کر آیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم نے چچا محمدی اور فیروز کے نام ہی سنے ہوں گے۔ حمید میاں ہم نے ہندو سکھوں میں عمریں گزاری ہیں۔ یہ کبھی مسلمان کے دوست نہیں ہو سکتے۔

والد صاحب نے نفی میں گردن کو ہلایا اور ریمانہ کو آواز دی۔

”ریمانہ بیٹا! سمار ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

”آئی ابا جی!“

اتنے میں ریمانہ مسکراتے ہوئے اندر آئی اور سمار اٹھا کر لے گئی۔ اس وقت مجھے اپنی والدہ مرحومہ آپو جی بہت یاد آئیں۔ کشمیری چائے بنانے کا جو سلیقہ اُن میں تھا وہ امرتسر کی بزرگ کشمیری خواتین کا ہی حصہ ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے منہ اندھیرے اٹھ کر آگ جلاتیں۔ پتیل بھجھج اور پیالے گرم پانی سے پاک کرتیں تازہ پانی میں چائے کی پتی ڈالتیں جب خوب جوش آجاتا تو ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیتیں۔ دودھ الگ گرم کرتیں اور پھر اس میں چائے کا رس انڈیلتیں۔ ٹھیک جس وقت چائے کا رنگ نیچے گلاب ایسا

ہو جاتا تو ہاتھ روک لیتیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ جاتا۔ بڑی محبت سے میری پیالی میں چائے ڈالتیں۔ چائے میں سے کبھی گلاب کی خوشبو آتی اور کبھی نیچے یوں لگتا جیسے کسی گرم دوپہر کو چھیل سے لدے ہوئے جھگی میں سے گزر رہا ہوں۔ میں اپنی گرم خوشبو دھونگولوں میں سے ہوتا ہوا امرتسر کی نہروں اور پھولوں بھرے باغوں میں نکل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امرتسر کی رگوں میں کشمیری مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کا خون دوڑ رہا تھا۔ امرتسر میں مسلمانوں میں زبردست سیاسی شعور اور ادبی ذوق تھا۔ اس شہر بے مثال میں جتنی ادبی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا وہ مسلمانوں ہی کی مرہونِ منت تھیں۔

اس شہر نے بلند مرتبت مسلمان خطیب، لیڈر، شاعر، ادیب، پہلوان اور ہنرمند پیدا کئے۔ ہندو گول مارکیٹ، چھتی ڈیڑھی بازار مائی سیواں اور گورو بازار کی تنگ تاریک دکانوں پر تو نڈنگا نے دن بھر پیٹے پیٹ کھاتے رہتے جبکہ امرتسر میں مسلمان کاریگروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے قالین، جامع واریں اور لٹھینے کی چادریں سمرقند و بخارا کی منڈیوں میں داؤتھین وصول کرتیں۔ اُن کے اللہ اکبر کے جو شیلے نعرے آج بھی انجمن پارک، گول باغ اور سکتری باغ کی فضاؤں میں گونج رہے ہیں۔ بہت بعد میں متعجب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے سنگٹن کی تحریک شروع کی اور ہندوؤں میں ہندو نوجوان درزش کرتے دکھائی دینے لگے۔ ورنہ اس سے پہلے امرتسر کے اکھاڑے مسلمانوں ہی کے دم کے قائم تھے لیکن پچاس ڈنٹر پینے کے بعد مشکل تین پاؤں دودھ پینے والا پٹلا زور ہندو بھلا ایک ہزار ڈنٹر لگا کر سالم بکرے کی بخنی چڑھا جانے والے امرتسر میں مسلمان کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا! چنانچہ ۱۹۴۷ء کے نساہات میں ہندو کسی بھی جگہ کھل کر مسلمان کے مقابلے میں نہیں آیا۔ وہ اپنی اکثریت کے محلوں میں چھپ کر بیٹھ رہے تھے۔ ادھر کوئی اکاؤنٹ دلا دلا دلا کر مسلمان جازکھ تو اسے آیتے ہاں سکھوں نے ضرور مقابلہ کیا۔ مگر وہ بھی اللہ اکبر کے نعروں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سب سے پہلا حملہ ہمارے محلے کٹرہ مہان سنگھ پر برج پھولا سنگھ کے نہنگ سکھوں نے کیا۔ میں خود مقابلہ کرتے والوں میں موجود تھا۔ نہنگ اپنے ایک ساتھی

کی کٹی ہوئی موٹی پنڈلی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس مقابلے میں قادر شوز کمپنی انارکلی کے قادیان
شہید و خدی ہوئے تھے۔ اگر امرتسر میں باقاعدہ فوج برپا نہ کی جاتی تو یہی ہوتے۔ قادیان اور بکتر
بند گاڑیاں لے کر نہ آتی تو یقین کیجئے امرتسر کو امرتسر مسلمانوں سے غالی کر دانا ناممکن بات تھی۔
بہر حال اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا کہ عیسائیہ اور جالندھر کی طرح امرتسر
بھی اسلام کے کچھ اور دینی آزادی کا زبردست مرکز تھا۔ اور ہر سیاسی تحریک کے پیچھے
مسلمانوں ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ کون امرتسر ہے جو چوہدری فضل حق، شیخ حسام الدین، سید
عطا اللہ شاہ بخاری، سیف الدین کچلو، غازی عبدالرحمان اور مولوی غلام محمد ترنم کی شعلہ فشاں
تقریروں کو بھلا سکے گا؟ قاصداں والی مسجد کے گنبد و مینار آج بھی مولوی ترنم کی پرجوش خطابت
کے امین ہیں۔ مسجد خیر الدین کے درو دیوار آج بھی سید عطا اللہ شاہ بخاری کی آتش نواہیوں
پر ہمہ تن گوش ہیں۔ یہ وہ اسلام کے جیالے سپوت ہیں جنہوں نے اپنے خون سے
دین محمدی کے چین کی آبیاری کی اور مسلمانوں کو وہ سیاسی اور دینی استحکام بخشا جس نے
۶۵ کی جنگ میں کہیں میجر عزیز بھٹی، کہیں جنرل سرفراز خاں، کہیں کپٹن میجر عبدالجلیل
کہیں حوالدار شیر دل، کہیں راجہ مسعود اختر کیانی اور کہیں میجر عباسی بن کر ہندو حملہ آور
دشمن کو آگ اور خون کے جہنم میں نیست و نابود کر دیا۔

امرتسر کا ہندو بنیا پائی پائی دمڑی و دمڑی کے حساب کے کپڑا بیچتا تھا اور یہی کھاتوں
کا زور رو کپڑا تھا۔ سکھ کنگ منڈی اور پاپڑ منڈی میں یا پاپڑ وڑیاں بناتا تھا اور یاہور
میں آری تیشہ ڈالے گی لگی منی پیڑھی ٹھکانو کی آوازیں لگاتا تھا۔ لیکن امرتسر کا مسلمان مجلس
امرار اور نیلی پوشوں کے جلوس میں ستارہ و ہلال کا پرچم اٹھا کر سینہ تانے چلتا تھا۔ انقلاب
زندہ باد۔ اسلام زندہ باد اور پھر پاکستان زندہ باد کے فلک شکست نعرے لگاتا تھا۔ امرتسر
انہی پرجوش، پرجوش، زندہ دل، شیر دل اور بیدار معر مسلمان نوجوانوں کی جدوجہد کا دوسرا
نام تھا۔ امرتسر کی ساری رونقیں سیاسی ہنگامے، شعر و ادب کی بزم آریاں، صبح سری
پائے کے ناشتے، نہر کی آم پارٹیاں اور ہنگامہ خیز جلوس امرتسر مسلمانوں ہی کے
دم قدم کی برکت سے قائم تھے۔ امرتسر مسلمان ہمیشہ ہندو کے تن لاغر میں اپنی سیاسی

بصیرت، ملی سلوت بے مثال ذہانت اور جذبہ عمل کا خون دیتے رہے۔ امرتسر کے تاج محل
کی عمارت مسلمانوں ہی کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ مسلمانوں نے امرتسر چھوڑ دیا۔ تاج محل
گر پڑا۔ ہندوؤں کی سپلائی لائن ٹوٹ گئی۔ اب امرتسر کی مثال اُس ہندو عورت کی سی
ہے جیسے اُس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو۔ اُس مریم کی سی ہے جو قلبت فون کے
باعث مر گیا ہو اور جس کی لاش سڑ پھر پڑا ل کر مردہ خانے لے جاتی جا رہی ہو۔

”بھائی جان چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے“

چھوٹی بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں امرتسر کی ٹمٹماتی بھومی سے واپس لاہور کی
انارکلی میں آگیا۔ ریحانہ چائے پیالیوں میں انڈلی بھی چکی تھی اور والد صاحب بڑے سکون سے
پی رہے تھے۔ وہ ۱۹۱۹ کے جلیا نوالہ باغ کی یادوں میں گم تھے اور میں، ۱۹۴۷ کی یادوں میں
کھو گیا تھا۔ دراصل ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی جدوجہد
آزادی کے درخشاں مینار ہیں جن کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے دینی
دروٹے اور اسلامی عظمت کے اجا اور بقا کی منزل پائی۔

ابا جی نے اب پیالی میں ٹکیں قلو ڈبولیا تھا اور اُسے چمچ سے بڑے مزے سے
کھا رہے تھے۔ میں نے پائپ میں نیا تمباکو بھرا اور کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں کو
دیکھ کر اُسے سگاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے بعد کیا ہوا ابا جی؟“

”بس پھر جو ہوتا تھا ہو کے رہا۔ جنرل ڈائر گورکھا فوج لے کر امرتسر میں آن داخل ہوا۔
دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ جسے جلوسوں پر پابندی لگ گئی۔ بیساکھی کے دن تھے۔ رام تلانی
کے سامنے والے میدان میں میلہ لگا تھا۔ اگلے روز ۱۳ اپریل کا دن تھا۔ اس روز امرتسر
کے آسمان پر ہلکا گرد و غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ میں سخی سرور کے اکھاڑے میں زور کر کے
گھر آیا۔ نہادھو کر دوپہر کا کڑھا ہوا دودھ پیا۔ مونچھوں پر بالائی کی مالش کی۔ سلک
کا کرتا اور پیپ شو پہنا۔ ماسٹر المہ بخش (والد محترم جناب ظہور الحسن ڈار) اور چھوٹے شاہ
کو ساتھ لیا اور ہم تینوں جلیا نوالہ باغ کی طرف روانہ ہو پڑے۔ ہم تینوں جوان تھے

اور بدن میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا۔ بازار بکرواناں سے نکل کر کیسری باغ سے ہوتے ہوئے ہم جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

میں نے پوچھا۔

”آپ نے فضا میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی؟“

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔ امرتسر میں دفعہ ہم اہل گاہی کرتی تھی اور جلسے ہوا ہی کرتے تھے۔ جلیا نوالہ باغ میں لوگوں کے ٹھٹھہ کے ٹھٹھہ لگے تھے۔ حمید خدا جھوٹ نہ بوائے کوئی پچاس ہزار کا ہجوم تھا۔ ارد گرد مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں بھی لوگوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ جلسہ گاہ کے بیچ میں تخت پوش پر ایک کرسی رکھی تھی جس پر ڈاکٹر کچو اور سیتہ پال کی تصویریں رکھی تھیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے اُس وقت کانگریس کا منسراج تقریر کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک ہوائی جہاز نے جلسہ گاہ کا ایک کچر لگایا اور قلعے کی پریٹ کی طرف چلائی۔ اب ایک شاعر اٹھا اور اُس نے اردو میں لکھی ہوئی انقلابی نظم پڑھنی شروع کر دی۔ ہم چونکہ دیر سے آئے تھے اس لئے لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گورکھا فوج نے باغ کے دروازے والے ٹیلے پر اگر ایک دم مورچہ سنبھال لیا اور جنرل ڈائری سفید گھوڑے پر ذرا اوپر اٹھ کر دور بین سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

چھوٹے شاہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

خلیفہ ایسا لگتا ہے آج گولی چلے گی،

میں نے کہا۔

”شاہ جی فکر نہ کرو۔ یہ محض ڈرانے کے لئے ہے۔“

ماسٹر اللہ بخش نے بھی کہا کہ خلیفہ آثار اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ میرا خیال ہے یہاں سے نکل چلو۔ ماسٹر اللہ بخش ہم میں پڑھا لکھا تھا۔ اُس کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ ہم تینوں آہستہ سے اٹھے اور باغ کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ ہمارے سامنے دروازہ ہی وہی تھا۔ وہاں فوجی مشین گنیں تانے بیٹھے تھے۔ جنرل ڈائری نے بھی

اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر بول۔

”گو اون۔ چانو۔ چانو۔ پیچھے۔“

ایک گورکھا رائفل لے کر ہماری طرف لپکا۔ ہم اٹھے پاؤں بھاگے۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ پیچھے سے تڑا تڑا تڑا مشین گن کے فائرروں کی آواز آئی۔ جنرل ڈائری نے گولی چلانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ مشین گن کی یہ پہلی باڑ لوگوں کے سروں کے اوپر سے ہو کر گزر گئی۔ اس باڑ کی ایک گولی گولائی گیٹ کے باہر اوپے تھپتی ایک گوجر عورت کو لگی اور وہ ہلاک ہو گئی۔ جلیا نوالہ باغ فائرنگ کی یہ پہلی مسلمان شہید عورت تھی۔ ہم تینوں ہجوم میں ایک دوسرے سے بکھر گئے۔ اُس وقت سیٹج پر لالہ منسراج نے چلا کر کہا۔

لوگو! بیٹھے رہو۔ یہ پھوکے فائر ہیں۔

مگر لوگ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دراصل زیادہ بھگدڑاں دیہاتیوں نے چائی جو بیساکھی کے میلے پر امرتسر آئے ہوئے تھے اور اس قسم کی سیاسی ہنگامہ خیزوں سے بالکل ناواقف تھے۔ اب فوج نے دوسرا اونڈ چلایا جس کی باڑ جلسے میں موجود لوگوں پر ماری گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں بیچ و پکار اور کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھاگنے اور گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ گولیوں کا ٹھائیس ٹھائیس اور تڑا تڑا کرتا مینہ برس رہا تھا۔ ہر طرف کھرام بپا تھا۔ لوگوں نے گھبرا کر کنوئیں میں چھپا لگیں لگا دیں اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے چلے گئے اور دب کر ہلاک ہو گئے۔ بچے بھاگتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔ میں ہجوم کے ریلے میں باغ کی مشرقی دیوار کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ ایک گولی سنناقی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزری اور ایک سکھ کو سر میں لگی۔ وہ آہ کئے بغیر گرا اور اس کی لاش دیکھتے دیکھتے لوگوں کے پاؤں تلے کچلی گئی۔ میرا سٹک کا کرتہ تار تار ہو چکا تھا۔ پمپ شو جانے کہاں رہ گئے تھے۔

میں نے دھوتی کا لنگوٹا کس لیا اور لوگوں کے اوپر سے ہوتا باغ کی دیوار کی طرف لپکا۔ یہ دیوار باغ کے گرد گرد چلی گئی تھی اور کوئی و فٹ اونچی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ دیوار کو پھاندنے کی کوشش میں گولیاں کھا کھا کر گر رہے ہیں اور ہلاک ہو رہے ہیں۔ دیوار پر

خون کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اب میرے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ دیوار بچاؤں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ زمین پر لیٹے ہوئے لوگوں کے سروں پر بھی گولیاں لگی تھیں۔ جنرل ڈائر کے فوجی، رائفلس نیچی کر کے بھی فائر کر رہے تھے۔ میں بڑا جوان اور طاقتور تھا۔ بدن کمایا ہوا تھا۔ جونہی میں دیوار کے پاس پہنچا میں خدا کا نام لے کر اچھلا اور دوسرے لمحے میں دیوار کی دوسری جانب ٹال کی لکڑیوں پر پڑا تھا۔ میں اُسی گرمی سردی میں اٹھا اور دیوار کی اوٹ میں چلتا وہاں آگیا جہاں دیوار ختم ہوتی تھی اور میں فوجیوں کو گولیاں چلاتے دیکھ سکتا تھا۔ فوجی اُس وقت تیسرا اونڈ چلا رہے تھے اور جلسہ گاہ میں ہا ہا کار مچی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جنرل ڈائر اشارے کر کے فائرنگ کر رہا تھا۔ پھر اُس نے فائرنگ بند کرادی اور فوجیوں کو ساتھ لے گھوڑے پر سوار ہو کر ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ اب میں بھاگ کر جلسہ گاہ میں آگیا کیونکہ مجھے ہاسٹل اللہ بخش اور چھوٹے شاہ کی تلاش تھی۔

حمید۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ میدان میں کیا حشر مچا تھا۔ بس تم اُسے دیکھتے تو لکھتے میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ لاشوں کے انبار تھے اور خون کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک آٹھ دس برس کے لڑکے کو دیکھا کہ لاشوں کے نیچے دبا اپنا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے لاشوں کو ہٹایا تو وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور دربار صاحب والی ہنسلی کی حوضی میں سے پانی پلانا چاہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حوضی کے پانی میں دس گیارہ لاشیں تیر رہی ہیں پانی اُن کے لہو سے سرخ ہے۔ ایک آدمی سہا ہوا پانی میں لٹکا ہے۔ چہرہ سفید ہے۔ ہاتھ نیلے ہیں۔ آنکھیں پھٹی پھٹی ہیں مجھے دیکھتے ہی یا گلوب کی طرح پکارا تھا۔

”کیا گولی چینی بند ہو گئی؟“

ہنسلی کی نہر میں بھی ان گنت لاشیں تیر رہی تھیں۔ اُن میں سے میں نے نمک منڈی کے ایک مسلمان رفوگر بابا صمد کو لاش پہچان لی۔ اُسے دو گولیاں لگی تھیں ایک سر کے بیچ میں اور ایک داہنے جھڑے سے ذرا اوپر۔ میں نے لڑکے کو نہر کا خون ملا پانی پلایا۔ وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر نکلنے اور پھر چھینے لگا۔

”بتائی! لالاجی! پتاجی!“

اور پھر زور زور سے رونے لگا۔ میں نے اُسے چُپ کرایا اور سوچا کہ اسے سامنے والی گلی کے کسی گھر میں چھوڑ آؤں۔ میں جو اُسے لئے گلی میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ادھیر عمر کا ہندو لالہ صرت بنیان اور نیکر پہنے روتا ہوا ادھر ادھر وادیا کرتا۔ ”میرے بلرام پترنوں دیکھیا ہے!۔ میرے بلرام پترنوں دیکھیا ہے لو کو! ہائے میرا پتر!۔“ وہ زار و قطار دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اب جو اُس نے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ دیکھا تو باپ بیٹا پیچ مار کر لپٹ گئے۔ ہندو باپ نے بیٹے کو گندے پر لادا اور وہاں سے آندھی کی طرح بھاگ گیا۔

اب میں پھر اپنے دوستوں کی تلاش میں باغ میں آگیا۔ میں نے راستے میں دیکھا بازار بڑج میوہ سنگھ اور بازار علیا نوالہ باغ میں بھی لوگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو جلے میں گولی کھا کر گھروں کی طرف بھاگے اور بازار میں ہی گر کر دم توڑ گئے۔ میں نے ایک زخمی کو دیکھا کہ بالکل نیلا پڑ چکا تھا اور بازار کی نالی پر منہ رکھے پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاں جلے کا تخت پوش بچھا تھا وہاں کم از کم تین سو کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق سارے باغ میں اس وقت خدا جھوٹ نہ بلوائے تو تین چار ہزار کے قریب بچوں بوڑھوں اور جوانوں کی خون آلود لاشیں پڑی تھیں ان میں شدید زخمیوں کی بھاری تعداد بھی تھی۔ میرے ایک دوست سکندر علی جو ڈھاب کھٹیکاں میں رہتے تھے شام سات بجے اپنے چھوٹے بیٹے کی تلاش میں وہاں پہنچے۔ اُن کے لخت جگر کی لاش مردوں کے انبار تلے پڑی تھی۔ گولی اُس کے سر کو توڑ کر نکل گئی تھی۔ اُس کے پاس ہی اُس کے ماہوں اسماعیل کی لاش پڑی تھی جس کے ساتھ وہ جلسہ سننے آیا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے سیکھ کو دیکھا کہ بچے کو سیلنے سے لگائے زمین پر پڑا ہے۔ مشین گن کی گولیوں نے دونوں کے جسموں کو ادھیر ڈال دیا ہے۔ ہنسلی دربار صاحب والی میں ہی میں نے ترنارن کے ایک چھڑا سی کو مرے پڑے دیکھا۔ وہ کچھ بھی کہی امرتسر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ لاشوں کے ساتھ ساتھ میدان میں جوتوں کے انبار بھی لگے تھے۔ مجھے چھوٹے شاہ اور ماسٹر اللہ بخش کہیں نظر نہ آئے۔ اب میں بھی لاشوں اور زخمیوں کے درمیان پھرتے دہشت زدہ ہو گیا

تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ لوگ لالٹینیں لئے اپنے اپنے لوگوں کی لاشیں ڈھونڈ رہے تھے
میں گھر کی طرف چل پڑا۔ بازار بند تھے اور ایک عجیب و بہشت ہر طرف طاری تھی۔ بازاروں
میں لوگ اپنے عزیزوں کی لاشیں چار پائیوں پر اٹھائے جلدی جلدی اپنے گھروں کو لئے
جا رہے تھے کیونکہ ۸ بجے کے بعد شہر میں کرفیو لگنے والا تھا۔ ملکہ کے بت کے پاس مجھے
والد صاحب ملے۔ وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں ماسٹر اللہ بخش اور چھوٹے شاہ کے
ساتھ میری تلاش میں آ رہے تھے۔ سوا سات بجے شام ہی شہر پر ہو کا عالم طاری ہو گیا
تھا۔ روڑاں والی مسجد کے پاس ہمیں ایک نیم عریاں پریشان حال سکیہ بوڑھا ملا جو رورو
گر ہر ایک سے پوچھتا تھا۔ میرے بیٹے کو کسی نے دیکھا ہے؟

اُسی روز مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور امرتسر میں وحشت و بربریت کے ایک عبرت ناک
باب کا آغاز ہوا۔ کوتوالی کے سامنے ٹٹکیاں نصب کر دی گئیں۔ لوگوں پر بے رحمی سے کوڑے
برسائے جانے لگے۔ دھڑا دھڑا گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ وہیں عدالت لگتی اور سزا سنائی
جاتی۔ کسی کو چھانسی اور کسی کو عبور دریائے شور۔ کتنے ہی آزاد کی پسند جیائے مسلمان
جوانوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ یا انہیں کانے پانی عمر قید کے لئے بھیج دیا گیا۔ کوڑیاں ڈالنے
کھوہ کے محلے میں انگریزوں نے لیڈی کے قتل کا پورا پورا بدلہ لیا۔ گلی والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ
گھٹنوں کے بل چل کر گھروں سے باہر نکلیں اور واپس گھروں کو جائیں۔ ایک روز
ڈھنڈورا پھر گیا کہ آج جنرل ڈائر شہر کی گشت کریں گے۔ تمام لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ
جنرل صاحب کو اٹھ کر سلام کریں۔ جب ڈائر ہمارے محلے کٹرہ میاں سکھ میں آیا تو صدیق
قصائی گوشت کاٹنے میں لگا تھا۔ اُس نے سلام نہ کیا۔ اچانک مالٹ کی آواز آئی۔
ایک سپاہی نے زور سے صدیق کو ہنڑ مارا۔ صدیق نے وہی ہنڑ کھینچ کر سپاہی کے
منہ پر دے مارا۔ پھر کیا تھا۔ فوراً اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ صدیق کو بھی
کانے پانی بھیج دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے کڑیل جوان اور ماڈل کے سوہنے نعل چھانسی
چڑھا دیئے گئے۔ شوق کے ماتھ میں ابھی شادی کی مہندی بھی پھینکی نہ پڑی تھی کہ اُس
کی لاش گھر آگئی۔ اُس کا گھر گلی فراسیاں میں تھا۔ مائی بھری بیوہ کے رٹکے کو جلے میں

ہی گولی لگی تھی۔ بعد میں جب حکومت نے اُسے بھی کچھ روپے بطور معاوضہ دیئے تو
مائی نے اس رقم سے گھی منڈی والے قبرستان کے نالوں کی ٹپیاں پکی کر وادیں۔
والد صاحب چائے پینے لگے اور مجھے گھی منڈی والا قبرستان یاد آ گیا جو امردوروں
کے باغوں میں گھرا ہوا تھا اور جس کے ارد گرد نہروں میں سے کاٹے ہوئے نالے بہتے
تھے۔ ان کی پکی پیوں پر بیٹھ کر ہم باغ میں سے توڑے ہوئے کچے کپے کے امرود کھایا کرتے
تھے۔ عید بقر عید کو منہ اندھیرے ہم یہاں اپنے آباد اجداد کی قبروں پر چاول اور گلاب
کے پھول نچھاور کرنے آتے۔ اگر بقیان سلگانی جاتیں۔ یہاں دیاں جلی موم بتیوں کی روشنی
میں قرآن شریف پڑھنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اب ان قبروں کو ڈھا کر ہندو
سکھوں نے وہاں مکان بنا لیے ہیں۔ کیا ہم اپنے اجداد کی روجوں کو کفار کے بوجھ سے
آزاد نہ کرائیں گے؟ کیا مسجد قاصداں، مسجد خیر الدین اور مسجد جان محمد کے میناروں میں
کبھی اذان نہ گونجے گی؟ ہمیں خدا کے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں کو پاشش
پاشش کرنا ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کہہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

میری آنکھوں میں اقبال کی ایک تصویر آگئی کہ وہ مسجد قرطبہ کے گنبد سے
ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا ہے اور میں امرتسر کی ویران مسجدوں سے نکل
کر غرناطہ و قرطبہ کے مسلمان بادشاہوں کے اجڑے ہوئے محلات میں نکل گیا۔
اور اباجی کہہ رہے تھے۔

— اب گانگریس اور مسلم لیگ دو الگ جماعتیں بن چکی تھیں۔ مسلمانوں پر
ہندوؤں کی غریب کاری کھل گئی تھی۔ غالباً ۲۲-۱۹۲۱ء میں گول باغ میں لیگ کا جلسہ
ہوا۔ متنبو قناتیں تن گئیں۔ اسی میدان میں ساتھ ہی کانگریس کا سالانہ جلسہ بھی ہوا۔
نہرو، گاندھی، اور تلک آئے۔ ابوالکلام آزاد بھی ساتھ تھے۔ دوسری طرف محمد علی جناح
(قائد اعظم) بھی آئے۔ انہوں نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں بھی لیگ کے جلسے میں

گیا۔ امرتسر میں لیگ کا بڑا زور تھا۔ قائد اعظم نے انگریزی میں تقریر کی۔ لیگ بابو نے میرا گزرتہ تہیند دیکھ کر پوچھا۔

”تم کیا انگریزی سمجھ لیتے ہو جو یوں جم کر بیٹھے ہو؟“
میں نے کہا۔

”میں جناح صاحب (قائد اعظم) کی تقریر سننے آیا ہوں“
وہ بابو بڑا خوش ہوا اور مجھے قائد اعظم کی تقریر کا ایک ایک لفظ سمجھاتا رہا۔
میں نے پوچھا۔

”قائد اعظم نے کیا فرمایا تھا؟“
اب ٹھیک طرح یاد نہیں۔ ان کی تقریر کا مطلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے نکال کر اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں جسے مسلمان کبھی گوارا نہیں کریں گے۔

”پھر کیا ہوا؟“
”پھر یہی ہوا کہ جیاناوالہ باغ میں مسلمان شہیدوں کا بہایا ہوا خون رنگ لایا۔
پاکستان بن گیا اور امرتسر میں جو کشت و خون کا بازار گرم ہوا اس سے تم سب نوجوانوں واقف ہی ہو۔ ہم نے بڑی قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا ہے۔ اب اس ملک کو طاقت ور بنانا اور قائم و دائم رکھنا تم لوگوں کا کام ہے۔“
میں نے کہا۔

”ابا جی! پاکستان کی طاقت اور اس کے دوام کا ثبوت دشمنوں کو ۶ ستمبر ۶۵ کو مل چکا ہے۔ آپ فکر نہ کریں اور اگر کبھی پھر امتحان کا وقت آیا تو ہم اس سے بھی بہتر ثبوت دہیا کریں گے۔“
”انشاء اللہ“

والد صاحب نے پیالی میز پر رکھ دی اور میری نظر کارنس پر رکھے گلاب کے پھولوں سے ہوتی کھلی کھڑکی میں سے باہر نکل گئی جہاں مغل پورہ، والگہ، اور امرتسر

جانے والی ریلوے لائن سورج کی سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اب میرے کانوں میں امرتسر کی ویران مسجدوں کی فلک شکاف اذانیں گونجنے لگیں اور انجن پارک میں گونجنے ہوئے ”پاکستان زندہ باد“ کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں اور میں نے اقبال کو قرطبہ کے دریا وادابکیر کے کنارے گہری سوچ میں گم گھڑے دیکھا۔

اب روانہ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

گھنے جنگلوں کو جاتے پڑانے راستے ہیں۔ سیاروں کے افق سے طلوع ہوتے سیارے ہیں اور سورجوں کے ساتھ ساتھ سیر کرتے سورج ہیں اور ان تھریوں میں نشانیاں ہیں۔ روشن اور تابناک نشانیاں۔۔۔۔۔

کمرے کی فضا میں اعلیٰ انگلش تبا کو اور اعلیٰ چلنی چائے کی خوشبو نے مل کر ایک تیسری خوشبو کو بیدار کر دیا ہے۔ یہ خوشبو ہے اعلیٰ خیالات، پُر حلال فکر اور پُر شکوہ تصورات کی۔ قرطبہ کی ویران مسجدوں کو تکتی، ہجرت زدہ اندلسی شہزادوں کی آنکھیں اور ان مسجدوں کے بے اذان، مناروں کے عقب سے طلوع ہوتا آتشیں، غضب ناک آفتاب۔ بے سجدہ خرابوں نیچے ٹھہرتے سنگ مرمر میں سجدوں کے دہکتے نشان۔ مفتوح محلات کی شاہی خواب گاہوں میں شہنشاہوں کے لاشے، لعل و جواہر از مرد و عقیق سے محروم نیچے ہوئے تاج، بے تاج اُموی حکمرانوں کی ڈوبتے کُوج کو گھورتی آنکھیں اور ٹوٹی تلواریں کے قبضوں پر جسے ہوئے خون آلود پتے۔ قرطبہ! ہم پھر آئیں گے، غرناطہ ہم پھر آئیں گے۔ ہم اپنی اذانوں کو تیرے مناروں میں اور اپنے سجدوں کو تیری خرابوں میں بطور امانت چھوڑے جا رہے ہیں۔ ہم تجھ سے اپنی امائیں واپس لینے ایک دن ضرور آئیں گے۔ ہم دیوار گریہ کے ساتھ لگ کر نہیں روئیں گے۔ ہم اپنی خامیوں کے دارغ، بحیرہ روم کے پانیوں میں دھوئیں گے۔ ہم اور اپنی عظمتوں کے یا قوت ابھرتے سورج کی روشنیوں میں چمکائیں گے۔ ہم تیرے حجر کے باغات میں کھلے ہوئے سیاہ گلابوں کو سینے سے لگا کر رکھیں گے اور تو ہماری بخشی ہوئی عظمتوں کو فراموش نہ کرنا۔ ہماری مسجد قرطبہ کے گنبد پر سورج کی کرنوں کو چمکاتے رہنا۔ ہمارے غرناطہ کی وادیوں میں سر و شاد سے درختوں کی آبیاری کرتے رہنا اور ہمارے حجر کے باغوں میں سیاہ گلاب کے شگوفے کھلاتے رہنا۔ ہم آج تجھے الوداع کہتے ہوئے تیری مسجدوں، تیرے باغوں، تیری وادیوں اور تیرے دیواروں سے سو رہے ہیں اور کل تو ہم فاتحین کو خوش آمدید کہنے کے لیے فیصل شہر کے باہر اپنی سرزمین کے بہترین تحائف لینے کھڑا ہو گا۔ الوداع! الوداع! خوش آمدید! خوش آمدید!

ایک آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ ایک ماہتاب طلوع ہو رہا ہے۔ یہ ماہتاب اُسی آفتاب کے نور سے منور ہے۔ ہمارے تخت و تاج سے لوٹا ہوا سونا ہمیں دور سے دکھاتا ہے اور اُداس اور غمگین چاند کی اُداس روشنی میں مجھے غرناطہ کے کھنڈر اور ان کھنڈروں کے اُڑے باغوں

امرتسر کا کمپنی باغ

میں نے ابھی ابھی وائٹ جیسن چائے کی ایک پیالی پی ہے اور امرتسر کے کمپنی باغ پر مضمون لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس چلنی چائے کی خوشبو میرے ہر سانس کے ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی ہے۔ میرا دل چبیلی کا سفید پھول بن کر میرے سینے میں دھڑک رہا ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے گویا میں قلم سے نہیں گلاب کی ٹہنی سے یہ مضمون لکھ رہا ہوں کاغذ کے تختے پر گلاب کی ٹہنی بہا کی ہول کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور سطروں کی شافوں پر یادوں کے شگوفے بن کر کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کمپنی باغ پر کچھ لکھتے ہوئے وائٹ جیسن چائے کی ایک پیالی بڑی ضروری تھی۔ یہ کمپنی چائے میرا ایک دوست چین سے لایا تھا۔ جب میں نے پہلی بار لیمن یلو کر کے اس گول ڈبے کو کھول کر سونگھا تو میری آنکھیں اس کی خواب آلود خوشبو کے سحر سے خود بخود بند ہو گئیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں صبح کی ٹہنی ہوا بن کر کمپنی باغ کے درختوں میں سے گزر رہا ہوں کمپنی باغ کے ہر درخت میں وائٹ جیسن چائے کی مہک تھی اور اُس کی روشنیوں کی گھاس میں جھگی گلاب اور بنفشے کے پھول کھلا کرتے تھے میں نے آنکھیں کھول کر ڈبے میں چلنی چائے سیاہی مائل سبز خشک پتیوں کو دیکھا تو مجھے وہ خشک پتے یاد آ گئے جو شروع سردیوں کی ہلکی بارش میں کمپنی باغ کے درختوں پر سے گرا کرتے تھے۔

ڈن بل کی دھیمی انگلش مہک والا سگریٹ الیش ٹرے میں سگ رہا ہے۔ کھڑکی سے باہر ڈوبتے سورج کی سرخ کرنیں سفید سے کی ٹہنیوں کو چوم کر پیچھے سمٹتی جا رہی ہیں۔ سبز پتوں کے بیج میں نیلے آسمان پر شام کی سنہری انگلیاں رات کی تحریر لکھتی نظر آرہی ہیں۔ یہ تحریر پُر اسرار ہے، سحر زدہ ہے۔ اس میں وقت کے اہراموں میں سوئی ہوئی شہزادیوں کی سرگوشیاں ہیں، خلاؤں کے بیکراں سناٹوں میں اپنی طرت بلانے والی آوازیں ہیں۔ سامنے اگر چھپ جانے والی شکلیں ہیں

میں کپنی باغ کے درخت سر جھکائے نظر آرہے ہیں۔

کپنی باغ — میرے غرناطہ کا الحما! جس کی روشنیوں پر میرے قدموں کے نشان سو رہے ہیں۔ جس کے درختوں پر میری محبتوں کے نام لکھے ہیں۔ جس کی برساتوں میں کوئیں آج بھی میری یاد میں نوحہ کٹاں ہیں اور جس کی بہاروں میں آلوپے کے پھول شاخوں پر کھلے میری راہ دیکھتے ہیں اور شاداب نہروں کا پانی آج بھی میرا نام لے کر اپنے کناروں کو چوم کر گزرتا ہے۔ کپنی باغ کی مشک بار ہوائیں میرے سانس میں ہیں۔ اس کے پھولوں کی خوشبو میرے خون میں ہے۔ امرتسری جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے اوپر کپنی باغ کے پرکھٹس کے درختوں کا سایہ تھا۔ جب میں نے چلنا سیکھا تو میرے پاؤں تلے کپنی باغ کی گھاس تھی اور جب میری پہلی محبت مجھے چھوڑ کر ڈول میں سوار ہو کر اپنے گھر چلی گئی تو اس باغ کے خشک پتے میرے آنسوؤں کے ساتھ زمیں پر گرتے تھے۔ اس کی سردیوں کی ستھری دھوپ، اس کی برساتوں میں گھنے درختوں سے ٹپ ٹپ کرتی جامیں اور اس کی تپتی دوپہروں میں باغوں سے آتی گلاب کی گرم خوشبو اور نہر کنارے اُگی ہوئی بھگ کی جھاڑیوں کی تیز مہک اور ٹھنڈی کھوئی کا رخ پانی اور اس میں بیگے ناشپاتی کے پھولوں سے ٹپکتی شبنم — کپنی باغ کو میں کس طرف سے لکھنا شروع کروں؟ اس کتاب کا کون سا صفحہ پہلے کھولوں؟ یادوں کے اس ویران شہر میں کس دروازے سے قدم رکھوں؟ کون سے درخت پر سب سے پہلے اپنی محبت کا نام پڑھوں؟ اس زندہ شوہر کی بیوہ کو کس نام سے پکاروں؟

اگر ہم ہال دروازے کی طرف سے کپنی باغ میں داخل ہوں تو ہمیں انجمن پارک کے ساتھ ساتھ ریلوے پل کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ انجمن پارک جہاں میں نے سب سے پہلے مسلم لیگ کے جلسے میں راجہ محمود آباد کی تقریر سنی اور پاکستان زندہ باد کے نعرے سنے۔ جہاں ہندو سبھا کالج اور ایم او کالج کے درمیان کرکٹ کے زبردست میچ ہوا کرتے اور مرقت حسین کی باؤلنگ پر ہمارے دینیات کے استاد اُتھیں پڑھ پڑھ کر پھوٹکیں مارا کرتے تھے۔ آج اس انجمن پارک میں میوہ منڈی بن گئی ہے۔ چاروں طرف بوسیدہ کھوکھے ہی کھوکھے لگے ہیں اور گے سڑے پھولوں کا بیوپار ہوتا ہے اب نہ وہ انجمن ہے اور نہ پارک — ریلوے پل کی اترنی اتریں تو ایک جانب کرشل ہوٹل اور دوسری جانب وکٹوریہ جوبلی ہسپتال کا دروازہ۔ یہی وہ کرشل ہوٹل ہے جہاں میں نے اردو کی

ڈکٹری نیچ کر اپنی محبوبہ کو اس کریم کھلائی تھی۔ اب سامنے کپنی باغ ہے۔ ایک چھوٹی سی سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک ہسپتال کی دیوار کے ساتھ ساتھ شریف پورے کو نکل جاتی ہے۔ ایک سڑک دائیں بائیں پر الیگزینڈرا گراؤنڈ کو چھوڑ کر سیدھی فچھ روڈ کی طرف نکل جاتی ہے۔ ارد گرد پھولوں کے تختے ہیں جگہ جگہ امتاس کے درخت اپنے زرد پھولوں کے گچھے لٹکائے ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ ذرا آگے جا کر پرانے وقتوں کی بنی ہوئی ایک بارہری ہے جس کے بیچ میں سبز پانی کا حوض ہے یہاں سے گھنے درختوں میں گھرا ہوا کچا راستہ ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ کو نکل جاتا ہے۔ اس راستے میں تناور درختوں کے تنے کھود کر بیٹھنے کو گڑی نما جگہیں بنادی گئی ہیں۔ بائیں بائیں کو پختہ روشنیوں کے بیچ میں فوارے لگے ہیں جو دور باغ کی شرفی جانب کے تختوں کو چلے گئے ہیں۔

اگر ہم رام باغ دروازے کی جانب سے کپنی باغ کو چلیں تو ہمارے بائیں ہاتھ پہلے ہندو پان والوں کی دکانیں آتی ہیں جو پان میں ناریل کی گری، خشکاش، چینی اور خدا جاتے کیا کیا ملا کر کھلاتے ہیں۔ دکان میں گنیش اور کرشن کی تصویریں سجی ہیں جن کے سامنے ہر وقت لوبان سلگتا رہتا ہے۔ ایک طرف دھو تو وال گراموفون رکھا ہے، پاس ہی ریکارڈوں کا انبار لگا ہے۔ سونے کے دانت والے ایک لہلہا سا ہندو آدمی بڑے زور سے گراموفون کو چابی دیتا ہے۔ مٹین چلاتا ہے اور ساؤنڈ بکس کی سٹوئی گھومتے ریکارڈ پر رکھ دیتا ہے اور پھر دھو تو میں سے کسی عورت کی تیز اور تنگی آواز بلند ہوتی ہے۔

چرا کرے گیا قالم میری زنجیر سونے کی۔

کبھی اے کاش لیلے کے گھے کا بار ہو جاتا۔

ابر ہے، ساقی ہے، نے ہے، جام ہے۔

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے۔

یاد دل سے باز آجایا دل نواز ہو جا۔

کبھی اختر سی باقی فیض آبادی، کبھی کلا جھریا، کبھی اندو بالا، کبھی بھائی چیل پٹیا نے والا اور کبھی کھن خاں کی آوازیں ہمارا دور تک تعاقب کرتی ہیں اور ہم سیدھے ہاتھ پر عشق بیچاں کی بیل میں چھپنے ہوئے گر جا گھر کو پیچھے چھوڑتے جی ٹی روڈ کو عبور کرتے ہیں۔ اب ہمارے ایک طرف

ڈاکٹر سوہن سنگھ کا آنکھوں کا ہسپتال ہے اور دوسری طرف عید گاہ کی دیوار۔ ایک خرابی ڈیڑھ سی می سے دروازہ عید گاہ کو جاتا ہے۔ کئی لگے حوض کے سبز پانی میں گرے پڑے پتے اور سنہری مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جامنوں کے گتے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ حوض کی پرانی روشوں پر کالی سیاہ موٹی موٹی جامیں گری پڑی ہیں۔ ہم برسات کے مینہ میں بھٹکتے۔ سونیاں شپشپاتے غالی ٹیکریں پہنے، دوڑیں لگاتے یہاں آتے۔ فوب جامیں کھاتے۔ نیکر کی جلیں بھرتے اور شور مچاتے کپنی باغ کے کچے پتے کپتے امرودوں پر حملہ کرنے بھاگ جاتے۔ اب ریل کا پھاٹک عبور کرتے ہیں تو بائیں اتر پر اسی دکنٹوریہ جو بی ہسپتال کا مشرقی دروازہ ہے اور سامنے کپنی باغ ہے۔ یہ کپنی باغ کا سب سے پرانا دروازہ ہے مغلیہ طرز کی ایک کشادہ ڈیڑھ سی ہے جس کے اوپر پڑانے اندھیرے کمروں میں کپنی باغ سے متعلق دفتر ہے عمارت کی پیشانی پر ایک بارہ دری ہے جس کا اٹھارہ پھول دار بیلوں نے چھپا رکھا ہے ڈیڑھ سی کی فصانیم روش اور ٹھنڈی ہے سامنے کپنی باغ کے ہرے بھرے دھوپ میں چلتے ہواؤں میں جھومتے درخت نظر آ رہے ہیں۔ ڈارمی سے باہر لگیں تو کونے میں ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی بائیل ہے جس پر بکافلی کا گھٹنا درخت سایہ کیے ہوئے ہے۔ باؤلی کا شفات پانی اچھل اچھل کر چھوٹے نالے میں بہتا باغ کی اُس جانب جا رہا ہے جدھر لوکاٹ کے درختوں کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ اب ہم کپنی باغ کی بڑی اور سب سے پرانی سڑک پر جا رہے ہیں سیدھے ماتھ پر جامن کے پرانے درخت ہیں اور دوسری طرف آٹے کے درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں چوڑے پتوں والے بھیرے کے پیر بھی ہیں۔ سامنے پھر ایک پرانی مغلیہ طرز کی عمارت کھڑی ہے جس کے شرقی اور غربی پہلوؤں میں سنگ مرمر کے حوض ہیں اور ان میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ کہتے ہیں اس عمارت میں ہمارا جہ رنجیت سنگھ اگر آرام کیا کرتا تھا۔ اب یہاں امرتسر میں نسل کپنی نے ایک لائبریری بنادی ہے۔ باغ کی سیر کرتے کہیں میں اندر چلا جاتا تو مہراب دار چھتوں والے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں ایک بڑی سی گول میز پر کچھ اخبار پڑے ہوتے اور کسی کونے میں کوئی بوڑھا لالہ یا ادھیڑ عمر کا مسلمان مطالعے میں غور ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں اس جگہ ایک لوگ ریڈیو سٹیشن بنادیا گیا تھا جو کپنی باغ میں جگہ جگہ لاؤڈ سپیکروں پر جرموں کے غلغلے تقریریں سنایا کرتا اور کہیں کوئی شوقیہ فن کار ایک آدھ گیت بھی گاتا۔ شام کو یہاں سے فلمی گانے

نشر ہوا کرتے۔ اُن دنوں امرتسر میں فلم انمول گھڑی بڑے زوروں پر چل رہی تھی، چنانچہ کپنی باغ کے لاؤڈ سپیکروں پر نور جہاں کے گانے نشر ہوا کرتے۔ ایک روز میں بھی یہاں سے سہجی کا ایک گیت گایا تھا۔ اُن گے دونوں طرف ہرے بھرے گھاس کے میدان ہیں جہاں جگہ جگہ پھولوں کے تھتے ہیں۔ سامنے ٹھنڈی کھوئی ہے جس کا پانی گرمیوں میں برف سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ کتوں کی ایک جانب ہندو پانی پلاتے والا بیٹھا اور دوسری جانب مسلمان — پانی دونوں جانب ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر ہم مسلم مائی سکول یعنی شریف پورے والے پھاٹک سے کپنی باغ میں داخل ہوں تو سامنے بھائیوں والی نہر کا چھوٹا ٹپل اُٹا ہے۔ اس ٹپل پر سے ہم نہر میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے اس کے کنارے ٹپل کے پاس ٹوٹا پھوٹ گئے تھے اور نہر کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا۔ یہاں پانی کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے روڑے بہت ہوا کرتے تھے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے اکثر ہمارے گھٹنے چھل جاتے۔ یہ نہر کپنی باغ کو جاتی ہے۔ اس کی ایک جانب امرودوں کے وسیع باغ ہیں اور دوسری جانب کنارے کے ساتھ ساتھ کھٹیوں کی قطار چلی گئی ہے۔ امرودوں کے باغ میں ہم ایم اے اور سکول سے بھاگ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ ساری دوپہر ہم باغوں میں اُوارہ گردی کرتے رہتے اور کچے امرود توڑ کر کھاتے۔ جب امرود پک جاتے تو باغ میں رکھوالوں کی ہو ہو کی آوازیں آنے لگتی۔ پھر ہم جہر کی پرلی جانب شہتوت ڈالیوں پر اوڑھنوں کی طرح لٹک رہے ہوتے اور پھر کی گرم فصا میں اُن کی میٹھی خوشبو چھی ہوتی تھی۔

یہاں ایک کوٹھی کے برآمدے میں ستون کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل چڑھی تھی جس کے کانوں پھولوں کے سامنے میں ایک ہندو لڑکی کرسی پر بیٹھی کہیں کتاب پڑھا کرتی اور کہیں سوئیٹر بنا کرتی۔ میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا۔ میں اس لڑکی سے عشق کرنے لگا بچپن اور بڑھاپے کا عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی اور بادامی رنگ کی تھی۔ ماتھے پر سرخ بندیا لگی ہوتی میں اسکول سے بھاگ بھاگ کر اُسے دیکھنے آتا۔ وہ مجھ سے بڑی تھی۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میرے سر کے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھرتے ہوئے پوچھا کہ میں نہر کنارے بیٹھا اُسے کیوں دیکھتا رہتا ہوں۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور کالسی کی تھالی میں دو لٹوے آئی۔ اُس نے مجھے لٹو کھلائے اور میرا کان اُستے سے کھینچ کر کہا

”خبردار جو تم پھر اسکول سے بھاگے“

مگر میرے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ میں ہر روز وہاں جا کر اس لڑکی کے درشن ضرور کرتا۔ ایک روز میں درختوں سے پکے پکے امرود توڑ کر اس کے لیے لے گیا۔ اس نے امرود لے لیے اور ہنس کر بولی۔

تمہیں رکھو لے نے نہیں پکڑا؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے آج بھی اس کے ماتھے کی سُرخی بندیا اور سفید خوبصورت دانت یاد ہیں۔ اُس نے کاسنی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ ہنس کر کہنے لگی:

”ہم تو جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“

اس اثنا میں اندر سے کسی مرد نے اُسے بلایا اور وہ ”اُئی بھاپا جی“ کہہ کر اندر چلی گئی۔ وہ دوبارہ باہر نہ آئی۔ میں اٹھ کر آنکھوں میں آنسو لیے کہنی باغ کی طرف چل دیا۔ اگلے روز اس کوٹھی پر تلا پڑا تھا اور ہفتے بعد دوسرے لوگ وہاں آن لے۔ اس کے بعد میں نے اُس ہندو لڑکی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اب بھی جب کبھی میں سُرخی انگور یا قمری شہتوت دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے کانوں میں ٹپکتے آویزے یاد آجاتے ہیں۔ خدا جانے آج وہ لڑکی کہاں ہوگی، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا بیاہ ہو چکا ہوگا۔ بچے ہوں گے، پتی ہوگا، اُسے یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ کبھی ایک لڑکا نہر کنارے شہتوت کے پیر تلے کھڑا اس کے برآمدے میں نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وقت نے اس کی نوعمری کی یادوں کو محو کر دیا ہوگا، لیکن میرے مافقے کی لوح پر یادوں کے نقوش وقت کے ساتھ اُبھرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مٹی میں بوئے ہوئے بیج اب تناور گھنے درخت بن کر میری محبتوں کے پُرانے راستوں پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی چھاؤں میں کہیں موتیے کے جھاڑ ہیں اور کہیں جنگلی گلاب کھلے ہیں۔ زندگی کے ایسے پر جب آخری ایکٹ کا پردہ گرے گا تو میں واپس موتیے کی خوشبوؤں سے جھپکتے ہوئے اپنی محبتوں کے ان پُرانے راستوں میں نکل جاؤں گا، لیکن گم شدہ محبتوں کے خواب آلود جنگلوں میں نکلنے سے پہلے میں آپ کو کہنی باغ کی سیر ضرور کرانا۔ آئیے اب تحصیل پورے کی طرف سے کہنی باغ میں داخل ہوتے ہیں۔

دروازہ مہاں سنگھ سے نکل کر جی ٹی روڈ عبور کرتے ہیں تو ایک طرف تحصیل کا دفتر ہے

اور سامنے کونے والی گھنی بیر کی تلے مائی کا کچا مکان ہے۔ اس بیر کی میں بڑے میٹھے لال لال بیر لگتے تھے۔ ہم ڈھیلے مار کر بیر گراتے تو مائی لاٹھی لے کر گالیاں دیتی اندر سے باہر نکل آتی اور ہم مائی کا منہ چڑاتے ایک ٹانگ پر ناچتے، ہنسنے شور مچاتے نہر کی جانب بھاگ جاتے۔ مائی کی بیر کی سے ذرا آگے ایک طرف ہندو سکھوں کے مکان اور دوسری جانب لوکاٹ کے باغ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہندو سکھوں کے مکانوں کے درمیان ایک چھتہ ہوا کنواں ہے۔ اب ایک کچی پگڈنڈی لوکاٹ کے باغوں کے بیچ میں سے ریوے لائن کو جاتی ہے۔ اس پگڈنڈی پر کھٹے اور لمبوں کی ٹہنیوں پر سفید پھول کھلتے ہیں تو سارا راستہ خوشبو سے نہک جاتا ہے۔ صبح صبح سیر کرتے ہوئے جب میں اس چھتی ہوئی کچی پگڈنڈی پر سے گزرتا تو خوشبوئیں مجھے چاروں طرف سے لپیٹ لیتیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں کسی پھول میں سے گزر رہا ہوں۔ لوکاٹ کے باغ میں رستیاں بٹنے والے اپنے تھکے لگائے کام میں مصروف ہوتے۔ درختوں پر کیسری رنگ کی لوکاٹوں کے گچے ٹپکتے ہوئے۔ اب ریوے لائن سامنے ہے۔ لیون کی جھاڑیوں میں اس کی چمکتی ہوئی پٹری نظر آنے لگی ہے۔ ریوے لائن کے پار مقبول پورے کی مسجد کے سفید مینار صبح کی سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ سیر سے واپسی پر کبھی کبھی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ورزش کرتے کے بعد اس چھوٹی سی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا تھا۔ ہم نہر کی طرف سے پھلا ہی کی مسواکیں کرتے ہوئے یہاں آتے۔ دھوتیوں کے پتو دانتوں میں داب کر لگوٹ باندھ بدن پر تیل ملتے۔ ناخ کی اوپر کوٹھی چھیری ٹہنیوں والے درختوں کے پاس ڈنٹر لگاتے۔ کنوئیں سے بو کے نکال نکال کر سقاوے میں پانی بھرتے اور سقاوے کے اندر ٹونٹی میں پھنسی ہوئی لکڑی یا مسواک نکال کر ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار کے نیچے بیٹھ جاتے۔ مسجد کے باہر کبابیوں میں کیسری رنگ کے گیندے پھول کھلے ہوتے تھے۔ شریف پورے کے سامنے والی یہ آبادی خالص مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ۱۴ اگست کے بعد یہ لوگ بھی شریف پورے میں آگئے تھے۔ یہاں آگے جا کر ایک نسبتاً کشادہ جگہ آبادی ہے۔ یہاں درختوں کے سائے اس قدر گھنے تھے کہ آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ اس جگہ ایک دیوان، کنواں بھی تھا جس میں ایک بار میری چپل گر گئی تھی۔

اب کہنی باغ کو حاتی نہر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائ آنے لگی ہے۔ اس ہوا میں مرطوب جھاڑیوں کی بو ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں کی بو ہے۔ اس نہر پر آم کے درختوں کی جھاڑیں

کی چھاؤں ہے۔ یہ چھوٹی نہر ہے۔ یہاں سے مشرق کو ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو موٹے ٹھوکے
 یہاں ایک مندر ہے جس کے صحن میں ہندو فسادات کے دنوں سے کچھ پہلے وندش کیا کرتے
 تھے۔ نہر کے پار گاؤں کی آبادی ہے۔ یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے۔ کہیں کہیں نیم اور دھریک
 کے درختوں میں مسجدوں کے مینار نظر آ رہے ہیں۔ فسادات میں اس گاؤں کی اکثر آبادی شہید کر دی
 گئی تھی۔ یہاں ایک باری صبح سیر کرتے گزرتے گاؤں میں شادی کی ڈھولک بج رہی تھی اور لڑکیاں
 ڈھولک کی تال پر گار ہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
 بابل دیاں گلیاں نی
 دیجھے اپنے بابل کی گلیاں
 خواب ہو جائی گی۔۔۔۔۔

میں لوکاٹ کے گھنے باغ کو جانے والی چھوٹی سی ندی کی پل یا پر بیٹھ گیا اور دیہاتی لڑکیوں کا درد
 بھرا الوداعی گیت سننے لگا۔ میرے قریب ہی زرہ لوکاٹوں کا ایک گچھا اپنی ٹہنی کو جھکائے ندی کے پانی
 کو چھونے کی کوشش کرتا رہا تھا اور ٹیلا پانی ختمی تھی لہروں کی صورت میں گزرتا چلا جا رہا تھا۔
 گیت کے بول صبح کی شبی ہو میں کبھی قریب آجاتے اور کبھی دور چلے جاتے خدا جانے ان لڑکیوں
 میں سے کسی کو پاکستان کی سرحد تک پہنچنا نصیب ہوا ہوگا یا نہیں! انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جو کچھ
 گار ہی ہیں وہ ایک دن پچ ہو جائے گا اور انہیں بابل کی پیاری گلیاں بابل کا شفق بھرا پیارا چہرہ
 خواب ہو جائے گا۔ میں نے لاہور آکر سنا کہ اس گاؤں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر کے بے شمار
 مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا مجھے وہ لڑکیاں یاد آ گئیں جو اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر ڈھولک کی تھاپ پر
 اپنی بھولی بھالی آواز میں گار ہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
 بابل دیاں گلیاں نی

اب ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے کہیں باغ میں آ گئے ہیں۔ یہ نہر اب کہیں باغ کے بیچ
 میں سے گزرتی ہے۔ یہاں ایک کنارے پر آم کے درخت جھکے ہوئے ہیں اور دوسرے کنارے

پر دور تک ناشپاتی کا باغ پھیلا ہوا ہے۔ ہم اکثر نہر پار کر کے اس باغ میں گھس جاتے۔ درختوں سے
 بگو گھسے توڑ توڑ کر ٹیکر کی جیبوں میں بھرتے اور نہر میں کود کر ٹھنڈی کھوٹی کی طرف بھاگ جایا کرتے تھے
 اسی نہر کے پاس لاہور کے گلستانِ فاطمہ کی طرز کا ایک بڑا ہی خوبصورت پلاٹ تھا۔ یہاں گلاب،
 گیندا اور طرح طرح کے اعلیٰ قسم کے پھولوں کے تختے تھے۔ جگہ جگہ سنگ مرمر کے بنچے رکھے تھے جن
 کے پاس مور پنکھ کے پودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پہلو میں ناشپاتی کا باغ تھا جس کے
 درخت بہار کے موسم میں سفید اور گلابی پھولوں سے بھر جاتے۔ انہی پھولوں میں، میں اپنی پہلی
 محبت سے آخری بار جدا ہوا تھا۔ وہ سواری برقعے کا نقاب لٹے گھاس پر نظریں جھکائے بیٹھی اور میں
 سلی قیسف، کلکتے کی چارخانہ دعوتی اور سپر پینے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے اور
 پانسنگ شوکا سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ ہوا کا جھونکا آتا تو کچھ سفید اور گلابی پھول ٹوٹ
 کر ہم پر گر پڑتے۔ اس کی ناک میں سرخ رنگ دمک رہا تھا۔ سفید گالوں میں کشمیری سیب کی لالی
 تھی۔ لپ بٹک سے بے نیاز گلابی ہونٹوں کے اوپر پسینے کے موتی جھللا رہے تھے اور اس
 کے کپڑوں میں سے سرخ جٹا کی گرم، پڑا سارا، سحر خیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ طوطوں کا ایک جھنڈ شور
 مچاتا ہوا ہمارے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے راجدہ کا ہاتھ آہستہ سے چھو لیا۔ جس طرح شام کی ہوا گیتے
 کے پھول چوم کر گزر جاتی ہے۔ راجدہ سمٹ سی گئی اور پھر جب اُس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس
 کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خوشبو، گیندے کے پھول، ناشپاتی کے گلابی شگونے تھے۔ راجدہ کی سیاہ
 آنکھوں میں جھللاتے محبت کے ستارے تھے اور اڑتے پرندوں کے گیت تھے۔ ہم محبت میں جدا
 ہو رہے تھے اور یوں لگتا تھا گویا یہ ہماری محبت کی ابتداء ہے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی، لیکن
 یوں مل رہے تھے گویا پہلی بار مل رہے ہوں اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ محبت کی کوئی ابتدا اور
 انتہا نہیں ہوتی۔ یہ جس سمندر سے بادل بن کر اٹھتی ہے، قطرہ بن کر پھر اُسی میں جذب ہو جاتی ہے
 شگونہ بن کر جس مٹی سے پھول بنتے ہیں، بیج بن کر پھر اُسی خاک میں سما جاتی ہے۔ یہ اگر مغرب میں غروب
 ہوتی ہے تو مشرق میں ایک بار پھر طلوع ہو جاتی ہے۔

امرو د کے باغوں میں طوطے شور مچانے لگے۔ ہم اٹھے اور گھر کی طرف چل دیے۔ پردہ باغ
 کے پلاٹ میں لڑکیاں جھولے جھول رہی تھیں اور ان کے قبچھوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ پاکستان

بن جانے کے بعد میں اس باغ میں آگیا تو نہ پردہ بھانہ جھوٹے اور نہ باپردہ مسلمان لڑکیوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ پلاٹ کا گھاس موکھ کر سیاہ ہو رہا تھا اور گارڈینیا کی پانچ فٹ اونچی باڑھ کو کاٹ کر زمین کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ جہاں ناشپاتی کے پیڑ ہوا کرتے تھے وہاں شرابارہتوں نے کچے پکے بدنام مکان بنا ڈالے تھے اور جس جگہ میں نے راجدہ کا ماتھ اپنی انگلیوں سے چھوا تھا اور ہم پر ناشپاتی کے گلابی شگوفے ٹہنیوں سے ٹوٹ کر گرے تھے، وہاں ایک موٹی پھللی تووند والا ہندو لالہ دھوئیں بھری دکان میں بیٹھا میلے میلے پکوڑے تل رہا تھا۔

اب میں اور راجدہ پوکھش کے درختوں میں سے گزر رہے تھے۔ بائیں طرف کہیں باغ کلب کی کائی زدہ دیوار پر ایک بادامی بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے ہمیں گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے دیکھا اور منہ کھول کر انگڑائی لی اور کلب کی دیوار پھلانگ گئی۔ کلب کے اندر سے دو ایک بار بلیر ڈکھلنے والی چھتری کی ٹپ کی آواز آئی اور ہم خاموشی سے اُس کے گزر گئے۔ ایک جفتے بعد راجدہ کا بیاہ ہو گیا، وہ دلی چلی گئی ہیں کلکتے کی طرف نکل گیا۔ پاکستان بننے کے آٹھ برس بعد میں نے راجدہ کو میو ہسپتال میں دیکھا وہ اپنے ساتویں بیمار بچے کی دوا لینے ہسپتال آئی تھی اور میں راشن کارڈ بچوانے راشننگ آفس کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں نہ گرم چنا کی سحر انگیز خوشبو تھی اور نہ ناشپاتی کے گلابی شگوفے نہ میرے بدن پر سگی قمیض تھی اور نہ۔۔۔ راجدہ کی ناک میں عقیق دمک رہا تھا۔ نہ خوبصورت لمبے گیت گاتے امرود کے جھنڈوں کو جارہے تھے اور نہ ٹھنڈی نہری کی طرف سے پتے گلابوں کی خوشبو آرہی تھی۔ رکٹوں، بسوں ٹرکوں کا شور تھا۔ بیماروں کی چنچیں تھیں۔ زرد مر جھائے ہوئے چہرے تھے۔ چوٹی سے ایڑیوں تک بہتا پسینہ تھا۔ گرمی میں جھلنے درختوں پر بیٹھے پیاسے کوڑوں کی کانٹیں کانٹیں تھیں اور بھاگتے، دوڑتے بگرتے پڑتے، گر کر اٹھتے، اٹھ اٹھ کر گرتے، مرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم تھے۔ راجدہ کے ہاتھوں میں مہندی کی جگہ بیمار بچہ تھا اور میرے ماتھ میں گلاب کے شگوفے کی جگہ راشن کارڈ تھا۔۔۔ نہ راجدہ نے مجھے پہچانا نہ میں نے راجدہ کو پہچانا۔ وہ بیمار بچے کو لیے اور میں راشن کارڈ کو لیے اُس کے گزر گیا، پھر جیسے یادوں کے جنگل میں کسی نے ہم دونوں کو آواز دی۔ ہم نے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک پل کے لیے ہم ٹھنکے، رُکے اور پھر چل دیے۔ اُسے اپنے بیمار بچے کے لیے دوا لانی تھی اور مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کے لیے آٹا لانا تھا۔

اے میری محبت، میرے پھولوں، میری یادوں، میرے درختوں، میری نہروں، میرے شگوفوں کی اتار کی! تجھے کس نے پتھر کی دیوار میں زندہ چن دیا؟ اے میری محبت! اب کے بچھڑے کب ملیں گے؟

اے میری محبت! اے میری محبت!

راجدہ کا مکان گلی میں ہمارے مکان کے سامنے تھا پڑانے چھتے والا مکان۔ کھڑکی پر چتی پڑی رہتی۔ میں گلی میں سے گزرتا تو راجدہ چتی کی تیلیوں میں دو انگلیاں ڈال کر اُسے ذرا سا اپنی طرف کھینچتی اور مجھے گلی میں سے گزرتے دیکھتی۔ میں بالوں کو جھٹکنے کے بہانے اُسے دیکھتا۔ گلابی ناخنوں والی دو گوری انگلیاں اور سیاہ آنکھیں مجھے نظر آتیں اور میرا چہرہ خوشی سے کھل جاتا۔ میں گلی مڑتے ہوئے پلٹ کر اُسے نکلتا۔ وہ چلن کی اوٹ میں مجھے تک رہی ہوتی۔ دُور سے مجھے اُس کی چمکتی آنکھیں اور کان میں دمکتا ہوا آدیزہ دکھائی دیتا اور گلی والی مسجد کے گنبد پر سفید کبوتر چکر لگا رہے ہوتے۔ برسات کی جھریاں لگتی تو وہ اپنے مکان کی چھت پر سے میری طرف آم پھینکتی اور میں انہیں دبوچ لیتا۔ کسی وقت جب وہ آم چوس کر گٹھل میری طرف پھینکتی اور میں اُسے آم سمجھ کر شوق سے ہاتھوں میں دبوچ لیتا تو وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی اور اسے بار بار اپنے بھیکے ہوئے لمبے بال اوپر جھٹکنے پڑتے۔ عید شبرات پر جب وہ کرن گوٹ لگے نئے نئے کپڑے پہن، عطر لگا کر میری بہنوں سے ملنے آتی تو ہم چپ چپ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ اور ہمارے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔ شادی بیاہ میں وہ ڈھولک پر گیت گاتی تو میں کسی نہ کسی بہانے کمرے میں جا کر اُسے گاتے ہوئے دیکھتا۔ اُس کے مہندی لگے گورے ہاتھ ڈھولک بجا رہے ہوتے تو بصورت سیاہ بالوں والا سر ایک طرف کو ذرا سا جھکا ہوتا۔

کبھی میں اس کے گھر جاتا تو وہ کیلے رنگ کی گرم کشمیری شال اوڑھے پنک پر بیٹھی سوئی ہوئی رہی ہوتی اور یا نلکین سبز چائے پی رہی ہوتی۔ سبز پھولوں والی جا پانی پیالی اُس نے نازک گلابی انگلیوں میں تمام رکھی ہوتی۔ ہونٹوں کا پھول چائے کا گھونٹ لیتے وقت سمت کر شگوفہ بن جاتا۔ سبز خوشگوار چائے حلق سے اتارتے ہوئے وہ آنکھیں بند کر لیتی پھر بڑی بڑی ریشمی پکیں اٹھا کر مجھے دیکھتی اور ذرا سا مسکرا کر چائے پیتے لگتی اور کھڑکی سے باہر جنوری کی تیز بارش اور تیز ہوجاتی اور

سبز چائے کی ملک اپنے ساتھ اڑا کر ان پہاڑوں پر بے جاتی جہاں چنار کے درختوں پر سفید بروت گر رہی ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں منہ اندھیرے راجدہ کے گھر کے نکلے میں پانی آتا تو اس کے نیچے رکھی ہوئی خالی بالٹی شور مچا دیتی۔ یہ صبح کے چار بجے کا الارم تھا۔ راجدہ کی ماں اور بہنیں فوراً اٹھتیں۔ محلے کی دوسری عورتوں کو گھر میں جا کر جگا یا جاتا اور یہ ٹولی سیر کرنے کہنی باغ کی طرف چل پڑتی۔ راجدہ کا ادھیر عمر کلکتوی چچا اس ٹولی کی قیادت کرتا۔ وہ کلکتے میں بیس برس تک شالیں بیچتا اور جوا کھلتا کرتا تھا۔ اور اب امرتسر میں رفوگری کرتا تھا۔ تانبے ایسی رنگت، گنجا سر، چہرے پر جھریاں، سخت مزاج، الکھڑ بات بات پر گالی، جسے کے جسے ڈاڑھی منڈواتا۔ فارسی کے ان گنت نصیحت آموز شعر اسے اکر برستے اور ہر شعر کو وہ شیخ سعدی کی طرف منسوب کر دیتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اکثر اردو اور پنجابی کے شعر بھی یہ کہہ کر سنایا کرتا تھا کہ یہ شیخ سعدی نے کہے ہیں۔ اس کا جادو وہ یہ دیا کرتا کہ شیخ سعدی سیلانی آدمی تھا۔ وہ پنجاب میں آیا تو اس نے پنجابی سیکھی اور پھر پنجابی میں شعر کہے۔

صبح کی ملکی ملکی روشنی پھیل رہی ہوتی کہ ہم کہنی باغ میں داخل ہوتے۔ نیلے آسمان پر مشرق کی طرف نورانی جھلکیوں میں ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ باغ کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو چچا نہر کے کنارے بیٹھ کر اونچی آواز میں کلمہ شریف پڑھتے ہوئے زور زور سے کھانسی کھانسی کر دھونکرتا اور سنگ مرمر کے پنج پر نماز پڑھنے لگتا۔ عورتیں اور بچے نہر میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیتے۔ پو پھٹے کی نیم روشن نیم تاریک فضا میں نہر کا ریتلا ٹھنڈا پانی ہر سکون خاموشی سے سرگوشیاں کرتا بہہ رہا ہوتا۔ ہوا میں شبنم کی ٹھنڈک اور کچے امرودوں کی خوشبو رچی ہوتی۔ آلوچے کے پیروں کی ٹہنیاں گھاس پر اوس ٹپکار رہی ہوتیں۔

عورتیں ناشپاتی کے پیروں کی اوٹ میں نہاتیں۔ مشرق میں صبح کا ستارہ نمودار ہوتا۔ آسمان پر نیلی روشنی کا غبار مشرق سے مغرب کی طرف پھیلتے لگتا۔ باغ میں بیاں دیاں سیر کرنے والوں کے ہیولے دکھائی دینے لگتے اور ہم لوگ واپس اپنی گلی میں آجاتے۔ ہم اپنے ساتھ بھولوں کے گدے بنا کر لاتے۔ گلاب، چنبیلی، مولسری اور ناشپاتی کے گلابی بھولوں کے دستے۔ کسی رخصتم کوچے کی سفید بھولوں بھری ٹہنیاں ہی توڑ کرے آتے۔ ہم اونچے مکانوں میں گھری ہوئی اپنی گلی میں داخل ہوتے

تو ہمیں گلی اور گھٹن سی محسوس ہوتی۔ ہمارے کپڑوں میں شبنم کی ٹھنڈک ہوتی اور شگفتہ پھولوں اور تر تازہ سبزے کی جھلک اٹھ رہی ہوتی ایک دن راجدہ نہر میں سے نہا کر بال نچوڑتی ہوئی باہر نکلی تو ہم مولسری کے درخت تلے بھول چھنے لگ گئے مولسری کے گول گول ننھی ننھی کرنوں والے پھول اندھیرے میں زمین پر تاروں کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ ہم نے بہت سے پھول اکٹھے کر لیے۔ میں نے اپنے پھول بھی راجدہ کے دوپٹے میں ڈال دیے۔ ان پھولوں میں سے بڑی گہری اور شیریں خوشبو آ رہی تھی۔ راجدہ مسکرائی۔ اس کے سفید دانت پچھلے پہر پڑتے تھے کے اندھیرے میں ناریل کی دودھیا گری کی طرح نظر آتے اس نے گیلے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا تو میرے منہ پر نہر کے ٹھنڈے پانی کی پھوار پڑی۔ اب اس پھول میں جتا کی خوشبو بھی تھی۔ ٹھنڈی کھوئی والی مسجد کی طرف سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ چچا دھونک رہے تھے۔ ہم دیر تک پھول توڑ توڑ کر گدے سے بناتے رہے اور جب ہم اپنی گلی کی طرف واپس جا رہے تھے تو کہنی باغ کی جادو بھری خوشبو میں ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔

کہنی باغ والی مسجد ٹھنڈی کھوئی کے پہلو میں تھی۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت مسجد پختہ اور چمکے پتھروں سے بنائی گئی تھی۔ شام کو مسلمان سیر کرنے آتے تو وہاں باجماعت نماز ادا کرتے۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں امرتسر گیا تو یہ مسجد ویران ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے پتھر اکھاڑ کر لے گئے تھے اور اس کے صحن میں لمبی لمبی جنگلی گھاس اگ آئی تھی۔ گرے ہوئے ستونوں کے اوپر گھریاں بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ خرابوں کی پتھریلی جھاڑیاں توڑ پھوڑی گئی تھیں۔ یو کیٹس کے درخت اپنی سوگوار ٹہنیاں جھکائے مسجد کے کھنڈروں کو چشم حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہمسایہ تو فون مسلمان کا امیں ہے

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تیری خاک میں مسجدوں کے نشانیں

خاموش اذانیں ہیں تیری باورِ سحر میں

کہنی باغ کی مسجد کے کھنڈر قرطبہ کی مسجد کا ماتم کر رہے تھے۔ غزنائے کے بعد امرتسر کی جڑی ہوئی مسجدیں ایک بار پھر مسلمانوں کی درد انگیز ہجرت کا المیہ دہرا رہی تھیں۔ وہ اپنے پتھر بے خبر و خراب کے سینے چاک کیے ہم سے پوچھ رہی تھیں کہ ہم انہیں کیوں چھوڑ گئے! لیکن کے

پاس چھوڑ گئے؛ کیا ہمارے ٹوٹے ہوئے میناروں سے اب کبھی اذان کی صدا میں بلند نہ ہوں گی؟ کیا ہمارے صحن میں اگر کوئی مسلمان خدا کے حضور میں سجدہ ریز نہ ہوگا؟ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اذانوں کی دل نواز صدائیں اپنے ساتھ لے گئے اور بے آواز میناز میرے پاس چھوڑ گئے تسبیح کے سارے دانے اپنی جھولیوں میں ڈال کر لے گئے اور خالی رشتہ میرے ہاتھ میں چھوڑ گئے۔ تم مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا اب کبھی پلٹ کر نہ آؤ گے؟ مجھے بتاؤ میں اپنے سینے پر ٹوٹے ہوئے میناروں کا بوجھ رکھے کب تک تمہاری راہ دیکھتی رہوں گی؟ کیا میں اب کبھی تلاوت کی پُر شکوہ آواز نہ سن سکوں گی؟ اگر مجھے ایک روز نوبت پرستوں کے حوالے کرنا تھا تو پھر میری پیشانی پر کلمہ طیبہ لکھ کر خدا کی وحدانیت کا اعلان کیوں کیا تھا؟ میں کمپنی باغ کے اس دیران کو تنے میں کھنڈ رہتی پڑی ہوں میری محرابوں کی سیلین ہندوؤں کے غسل خانوں میں لگی ہیں۔ میری عبادت گاہ کے پتھر سکھوں کی ڈیوڑھیوں میں نصب ہیں۔ تم جہاں سجدہ کرتے تھے یہ لوگ وہاں پاؤں رکھ کر اپنے مکانوں میں داخل ہوتے ہیں تمہاری اذانیں ان کے ناقوس کے شور میں ڈوب گئی ہیں۔ اسے خدا! اسے خدا!

عجے کہاں روزِ مکافات اسے خدا! اسے خدا!

کمپنی باغ کے منتظم اعلیٰ چوہدری نور الہی تھے۔ ان کا مکان ہماری گلی میں ہی تھا۔ قبلے پتلے ادھیر عمر کے، نماز روزے کے پابند، بے حد بااخلاق، گلی میں سے گزر کر باغ کو جاتے تو ہر بڑے چھوٹے کو سلام علیکم کہنا کبھی نہ بولتے۔ رات گئے تک ان کے گھر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آیا کرتی۔ سفید پگڑی، بوسکی کی قمیض، کالی کنی والی سفید دھوٹی اور پمپ شو۔ میں نے ہمیشہ ان کو اسی لباس میں دیکھا۔ باغ کی فضاؤں میں رہ کر رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر ملائمت اور پاکیزگی کی چمک تھی۔ کمپنی باغ کے وسط میں ان کا دفتر تھا جہاں بہت بڑی زسری بھی تھی۔ چھڑ کاؤ کرنے والی کچھ شکستہ گاڑیاں وہاں پڑی رہتیں۔ چوہدری صاحب درختوں کی چھاؤں میں پھولوں سے لدے ہوئے گلوں کے پاس پڑی چار پائی پر بیٹھے مالیوں سے باتیں کیا کرتے۔ دور خشک پتوں کا ڈھیر سلاگ رہا ہوتا۔ آج بھی جب کبھی مجھے جلتے ہوئے سوکھے پتوں کی خوشبو کہیں سے آجاتی ہے تو مجھے کمپنی باغ یاد آ جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار دوپہر کو میں کمپنی باغ سے اٹلاؤں کے زرد پھولوں کے چھ سات گچھے توڑ

کر بھاگا تو دو مالیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے ان کی منت سماجت بھی کی اور یہ بھی کہا کہ ہمارے گھر میں ختم شریف ہو رہا ہے۔ اُس کے لیے پھول لیے جا رہا ہوں، لیکن وہ نہ مانے اور مجھے پکڑ کر چوہدری نور الہی کے پاس لے گئے چوہدری صاحب نے مجھے دیکھا تو بولے:

”اوئے ایہہ تے خلیفے دا پتر اسے“

پھر مجھے ڈانٹ کر کہا:

”نٹھ جا اوئے“

اور میں زرد پھولوں کے گچھے اٹھائے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

رمضان المبارک کے دنوں میں ہم سحری کھا کر سیدھے کمپنی باغ میں آ جاتے ہیں اور میرے محلے کے دوست لڑکے۔ اُن دنوں روزے بڑی سخت سردیوں میں آیا کرتے تھے۔ مگر ہمیں سردی نہیں لگتی تھی۔ روزہ کھولنے اور سحری ختم ہونے کی نوبت بچانے کا ہمیں بڑا شوق تھا اس شوق میں ہم مسجد میں سب سے پہلے پہنچ جاتے۔ سحری کی نوبت بچا کر ہم اذان کی آواز کے ساتھ ہی پچھلے پہر کے نیم روشن اندھیرے میں گلیوں کی کمپنی باغ کی طرف دوڑ لگا دیتے۔ راستے میں ہم بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر مکانوں کی دیواروں سے لگے فلمی پوسٹر بھی اکھاڑتے جاتے۔ تہہ در تہہ لگے ہو پوسٹر بڑی جلدی اتر جاتے، نسلی اشتہاروں کے نام یہ ہوتے تھے۔ لیلیٰ مخمل، زسری سانپ، جادوئی بنسری، ہند کیسری و سنت سینا شیل بال، بھولا شکار، خدا دوست، شاہی لکڑا راجپنڈی داس، صبح کا ستارہ سینا۔ بھگت پر بلا ٹپل گرل، بیٹی کی بتی۔ دکن کوئیں وغیرہ۔

کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا پرانا درخت تھا جس کی گھنی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ ہم ان اشتہاروں کو اس درخت کے نیچے لاکر ڈھیر کر دیتے اور انہیں آگ لگا کر ارد گرد بیٹھ کر آگ تپاتے۔ پھر ہم درخت پر چڑھ جاتے اور لیڈی بہادر اور بارتن کا کھیل کھیلتے۔ ایک ٹھہنی کو پکڑ کر بندر کی طرح اچھلتے اور جھولتے ہوئے دوسری ٹھہنی کو ہٹام لیتے اور وہاں سے تیسری شاخ پر جا پہنچتے۔

برسات میں کمپنی باغ کے پلاٹ بارش کے پانی سے لبالب بھر جاتے تو ہم اُن میں پانی اچھالتے، لمبی لمبی دوڑیں لگاتے۔ راتے مینڈکوں پر ڈھیلے برساتے۔ روشوں پر گری ہوئی

جامنیں اٹھا اٹھا کر کھاتے۔ نہر کی طرف نکل جاتے تو آم اور امرود کے درختوں پر ٹوٹ پڑتے۔
 رکھوالے چوکس ہو کر ہماری طرف پکٹتے تو ہم ہرنوں کی طرح چوڑیاں بھرتے نظروں سے اوجھل ہو
 جاتے۔ جو سڑک میڈیکل کالج کو جاتی تھی اس پر جامن کے پیروں نے چھت ڈال رکھی تھی۔ کالج
 کی گراؤنڈ بڑی سرسبز تھی۔ کنارے کنارے چاروں طرف آم کے گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ سڑک
 کے پار رڑکیوں کا ہوسٹل تھا۔ یہاں ہندو سکیم رڑکیوں کے علاوہ بٹالہ، گورداسپور، پٹھانکوٹ اور ہوشیار
 پور سے تعلیم حاصل کرنے آئی ہوئی مسلمان رڑکیاں بھی رہتی تھیں۔ اس علاقے میں اکثریت سکھوں کے
 بنگلوں کی تھی؛ چنانچہ امرتسر میں جب منادات کا شعلہ بھڑکا تو اس ہوسٹل سے بہت کم مسلمان رڑکیاں
 نکل کر شریف پورہ کیمپ میں آسکی تھیں۔ وہ کہاں گئیں؟ وہ کہاں ہیں؟ اس کا جواب نہ میرے پاس
 ہے اور نہ ان لیڈروں کے پاس جو امرتسر کی انجمن پارک اور گول باغ میں دھواں دھار تقریریں
 کیا کرتے تھے اور جولاہور میں آج امیرکنڈلیشنڈ ڈرائینگ روموں میں نیم دراز اپنے سیکرٹریوں
 کو تازہ بیان قلمبند کروا رہے ہیں۔

ایگزینڈا گراؤنڈ اور مینگو پارک میں ڈی اے دی کالج، ہندو سمبھا کالج اور گرینٹ کلب
 اور ایم اے او کالج کے درمیان کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔ ہم ایم اے او اسکول میں پڑھتے تھے
 چنانچہ میچ کے روز چھٹی ہوتی۔ ہم بستے گھروں میں پھینک پیچ دیکھنے کہنی باغ پہنچ جاتے۔ زندہ دلاں
 امرتسر، ہجوم درہجوم یہاں آئے ہوتے۔ قلعہ چھوٹے، قیمے کے کپڑے اور نان ہر لیسہ عام بک رہا ہوتا۔
 سردیوں کی خوشبودار چھیلی دھوپ میں لوگ منڈلیاں بنائے، دریاں اور قالین بچھائے بیٹھے
 میچ دیکھ رہے ہوتے۔ سبز سبز میٹھی مولیاں بیچنے والے گراؤنڈ کے چکر لگا رہے ہوتے۔ پنچ کا وقت
 ہوتا تو ایک کس کر باندھی ہوئی پگڑی والا سکھ ہاتھ سے گھنٹی بجاتا ساری گراؤنڈ کا چکر لگاتا۔ لوگ
 ہنستے، مذاق کرتے کھیل پر تہرہ کرتے اور پھر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ ہم گراؤنڈ میں دوڑیں
 لگانی شروع کر دیتے، درختوں سے پتے توڑ توڑ کر ان کے تاج بناتے۔ اسی بھاگ دوڑ میں امپیریل
 ہوسٹل کی طرف نکل جاتے جس کے صحن میں بوڑھے انگریز آرام کر سکیں پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے
 ہوتے۔ وہ ہمارے شور غل سے تنگ اگر وردی پوش بیروں کو ہماری مرمت کو بھیجتے۔ مگر ہم چاق
 چو بند امرتسر کی کشمیری رڑکے بھلا ان کے ہاتھ کب آنے والے تھے۔

شام کو کرٹل ہوٹل کے کیمپوں کی روشنی باہر نالے کے پانی میں جھلایا کرتی۔ ہم نالے کی چھٹی سی
 پتیا پر بیٹھے لوگوں کو شیشوں کے پیچھے آئیں کریم کھاتے اور چائے پیتے دیکھا کرتے۔ ایک بار ہم سب
 رڑکوں نے آپس میں چندہ کر کے داں جا کر آئیں کریم کھائی اور ان کے دو گلاس توڑ کر بھاگ آئے۔
 باغ کی لائبریری والی گراؤنڈ میں سردیوں میں پھولوں کی نمائش لگا کرتی۔ مختلف رنگوں کے
 گل داؤدی کے سیکنڈوں گئے بڑے قرینے سے سجادے جاتے۔ سخت کالروں میں پھنسی ہوئی تھی
 گردنوں والے افسر ہیڈ مایوں کے ساتھ گھوم پھر کر پھولوں کا معائنہ کرتے اور نوٹ بک میں کچھ لکھتے جاتے
 — پچھلے پیرافان سے پہلے میں سیر کرتا اس گراؤنڈ میں پہنچنا تو گل داؤدی کے پھول ٹھنڈی ریخ شبنم
 سے تربتر ہوتے۔ تاروں کی ہلکی ہلکی نورانی روشنی میں یوں لگتا جیسے بے شمار دلائی گڑیاں اپنے رنگ رنگ
 ریشمی بال لٹکائے گلوں میں کھڑی ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں میں گل داؤدی مقام کراپنی آنکھیں گرم ہو جاتیں
 اور نیم گرم سونچی خوشبو میرے رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔ پھر ٹھنڈی کھوئی کی جانب آم کے جھنڈوں
 کے پیچھے سورج طلوع ہو جاتا اور زرد، سفید، پمک، قرمزی اور گلابی گل داؤدی کے پھولوں پر شبنم کے قطرے
 زرد و جامر بن کر دمک اٹھتے۔ ایک ایک شبنم کے موتی میں سینکڑوں سورج طلوع ہوتے دکھائی دیتے
 میری آنکھوں کی شبنم سے سورج کی سنہری کرنیں ٹکرا کر پھولوں کی شبنم پر منعکس ہوتیں اور دیاں سے پھر میری
 آنکھوں میں آکر چمکنے لگتی۔ گویا میں ہزاروں سورجوں کے بیچ میں سورج بن کر پھولوں، شبنم کے موتیوں
 موتیوں کے سورجوں اور کہنی باغ کے درختوں، شاخوں، شگوفوں کے خور کے گرد گردش کر رہا ہوں۔ میں
 طلوع ہوتے آفتاب کی طلائی کرن بن کر صبح کی خوشبودار فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا۔

کہنی باغ میں سورج آج بھی طلوع ہو گا، لیکن صبح کبھی نہیں ہوتی ہوگی۔ منہ اندھیرے شبنم
 پھولوں پر گرتی ہوگی مگر ان کا منہ نہیں چومتی ہوگی۔ باد سحر آہیں بھرتی ہیں یاد کرتی درختوں پر ہماری ہفتوں
 کے نشانوں کو بوسہ دیتی چپ چاپ گزر جاتی ہوگی۔ سادوں کی گھٹائیں باغ کے آسمان پر ہیں اور میں
 دے دے کر گر جاتی ہوں گی۔ بارشیں آج بھی ہوئی مسجدوں کے شگاف زدہ گنبدوں اور خزاں نصیب بیڑوں
 پر روتے ہوئے برسی ہوں گی۔ ٹھنڈا زرد چاند آم کے درختوں پر ٹھوڑی رکھ کر دیرین باغ میں ہمیں تلاش
 کرتا ہوگا اور نہر کا پانی پچھلی شب کی نورانی روشنی میں کالروں کی گھاس پرے ہٹا کر اپنی آبی آنکھوں سے
 ہمیں دیکھنے کی بے سود کوشش کرتا ہوگا۔

مخروہ خوبصورت، خوش پوش لوگ کہاں چلے گئے؟ کپنی باغ ضرور سوچتا ہوگا۔ اسے کیا معلوم کہ پت
جہڑ میں سوکھے پتے جس ٹہنی سے ٹوٹتے ہیں اس کے نیچے کبھی نہیں گرتے۔ ہوا میں چکر کھاتے، جھاٹی
کے بے آواز نوحے پڑھتے، وہ ایک سسکی کے ساتھ زمین پر آکر بچھ جاتے ہیں اور پھر ہوا انہیں جدھر
کو چاہے اٹھا کر لے جاتی ہے۔

میں کپنی باغ کے درختوں کے پتوں کے ساتھ کئی بار ٹوٹ کر گر اہوں اور ہوا میں مجھے اڑائے لئے
پھرتی رہی ہیں۔ میں بھی تو ایک ہوں۔ جانے کس شاخ سے ٹوٹا کس سرزمین کی خاک پر آکر بچھ گیا اور
اب ہوا میں کس دیس کو اڑائے لیے پھر رہی ہیں! کیا اب کبھی اپنی شاخ سے لگ کر پھول کھلتے دیکھنے
نصیب نہ ہوں گے؟

کپنی باغ! میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اُن پرندوں کو یاد رکھوں گا جو صبح دم تیرے درختوں
کے جھنڈوں میں چھپایا کرتے تھے اور اُن کوئوں کو جو ساؤن کی سیاہ کالی بھگیاتی راتوں میں اُم کے پیروں
میں بولا کرتی تھیں اور سوکاٹ کے اُن نند گچھوں کو جو تیری نہر کے شفاف پانیوں میں جھک کر اپنا عکس
دیکھا کرتے تھے اور اُن گلابی شگوفوں کو یاد رکھوں گا جو بہار میں تیری ناشپاتی کی ٹہنیوں پر کھل کرتے
تھے اور اُس اذان کو یاد رکھوں گا جو تیری مسجد کے گنبد سے بلند ہوا کرتی تھی اور اُن نورانی چہروں کو جو
تیرے مہنوں میں نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ میں اس لیے یاد رکھوں گا کہ مجھے یہ سب کچھ تجھ سے
واپس لینا ہے اور تو اُس لیے یاد رکھنا کہ ایک دن تجھے یہ ساری امانتیں بھی واپس کرنی ہوں گی۔

میرے غرناطہ! میرے اُنڈس! میرے قرطبہ! ہم تیرے دریاؤں میں ڈوبے ہوئے اپنے موتیوں
کی غواصی کرنے ایک دن مزدرائیں گے۔ ہم اپنے تاج، اپنے زہرہ بکتر اور اپنی تواریں اُنے والی نسلوں
کو دلانے کے لیے عجائب گھروں میں نہیں رکھیں گے۔ ہم اللہ کے نام پر اپنی تلواروں کو بے نیام کریں گے
اور اللہ کے لیے تجھے ایک بار پھر حاصل کریں گے۔ ہماری مسجدوں کے میناروں، ہمارے عظیم کتب
خانوں کے گنبدوں اور ہمارے الحرا کے باغات کے پھولوں بھرے تختوں پر سورج کو طلوع ہونے
دیکھ۔ اپنی سبز پوش وادیوں کی فضاؤں میں ہمارے رجزیرہ اشعار کی آگے بڑھتی ہوئی آواز سن! اور
اپنے قلعوں کی رنگ خورہ فصیلوں پر کھڑے ہو کر دور گرد و غبار میں ہمارے شہسواروں کی چمکتی ہوئی
تلواریں دیکھ اور اپنی خندقوں پر پُل گرادے اور شاہی قلعوں کے دروازے کھول دے۔

میری کھڑکی سے باہر سفیدے کے درختوں میں سُرخ زہرہ سیارہ انگارے کی مانند دھکنے لگا ہے
اس سیارے نے میرے چہرے کو سُرخ کر دیا ہے اور یہ سُرخ ہی ہے عظمت، غیرت اور شکوہ کی
دودھیا گنبدوں کو چمکاتے سورج طلوع ہو رہے ہیں۔ پتے ٹوٹی ہوئی تواروں کے قبضوں پر جمے
ہیں۔ گرد آلود پاؤں رکابوں میں پیوست ہیں اور جھاگ اڑاتے، مہنہاتے گھوڑوں کی گردنیں تنی ہیں
ڈوبا ہوا سورج روشنی کے تحت پر بیٹھا ایک بار پھر مشرق سے ابھر رہا ہے۔

طلوع ہو! طلوع ہو! میرے اللہ کی عظیم نشانی! میں اندھیروں میں کھڑا ہوں اور
تیرے طلوع ہونے کا وقت اُن پہنچا ہے۔

کون سی منزل میں ہے کون سی دایہ میں ہے
عشق بلا خیر کا قافلہ سخت جاں

امر تسر کی ایک گلی

پاکستان بن جانے کے سات آٹھ برس بعد جب میں پہلی بار امر تسر گیا، تو ہال بازار والے سندھ شکار پور ہوٹل میں ٹھہرا۔ کل امر تسر میرا گھر تھا، لیکن آج وہ مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میں بھی وہاں اجنبی تھا۔ سیکھ اور بہندو دوستوں کے گھر ٹھہرنا مجھے پسند نہ تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھروں سے ہمیشہ ایک قاص قسم کی بوا آ کرتی، جو مجھے ناگوار تھی۔ میں پو پھٹے ہوٹل سے نکلا اور کمپنی بارغ کی سر کرتا ہوا اپنے محلے کی جانب آگیا۔ اپنی گلی میں داخل ہوا، تو امر تسر کی صبح کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ سب سے پہلا فرق جو میں نے گلی میں داخل ہوتے ہی محسوس کیا وہ یہ تھا کہ کسی بھی مکان کی کھڑکی یا دروازے پر جتنی نہیں تھی۔ پردہ داری اور حیا داری مسلمانوں کے ساتھ ہی پاکستان چلی گئی تھی۔ چتوں کے بغیر کھڑکیوں پر مجھے ان حیا یافتہ آنکھوں کا گمان ہوا جن کی پلکیں غائب ہو چکی ہوں۔ اکثر مکانوں کے پٹ کھلے تھے اور ڈیوڑھیوں سے دالانوں تک نظر جاتی تھی۔ آٹھ برس پہلے یہ گلی ایک برقعہ پوش خاتون تھی اور آج کسی طوائف کی طرح کھڑکی میں بیٹھی راہ چلتوں کو اشارے کر رہی تھی۔

مکانوں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ دوسری منزلوں کے چھبے مزید جھک گئے تھے۔ میٹروں منڈیریں ڈھے چکی تھیں۔ رشتہ کے مکان کا دروازہ کھلا تھا اور جس دیوان خانے میں وہ شہزادیوں جیسے وقار کے ساتھ قالین پر بیٹھ کر سلائی مشین پر اپنی ویٹ کی قمیض سیبا کرتی تھی وہاں اب ایک گھٹے بندھی تھی۔ میں نے مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے رشتہ کو یاد کیا، تو گائے نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے گائے سے پوچھا: "ان گھروں میں سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور بے داغ میز پوشوں پر نیلے خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں کہاں چلی گئیں؟ گائے

نے کوئی جواب نہ دیا اور میں حاجی قمر دین شال مرچنٹ کے مکان کو نکلنے لگا۔ جس کی تیسری منزل کے چھتے پر اخروٹ کی لکڑی کا کام کیا گیا تھا۔ وہاں اب سوائے طے کے ڈھیر کے اور کچھ نہ تھا۔ مسجد عبدالنور کے صحن کو توڑ کر وہاں پیل کا درخت اگادیا گیا تھا۔ خرابوں پر "اوم" لکھا تھا اور منبر پر کرشن کی مورتی رکھی تھی۔ اس مسجد کے سامنے ہمارا مکان تھا۔ ہمارا پہلا مکان۔ جس کے دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کے ترجمے پڑھا کرتا تھا اور جس کے آگے تخت پر سوا در گرم کیے میرے دادا جان اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے کشمیری چائے پیا کرتے اور پہلوانوں، دنگوں اور مشہور کشتیوں کی باتیں کیا کرتے۔ جس کے دالان میں موسیے، رتن جو اور عیش بیچاں کے گلے رکھے ہوئے تھے اور گرمیوں کی راتوں میں موسیے کی میٹھی خوشبو سے سارا گھر ملک جاتا۔ اس مکان کو میں پہچانہ سکا۔ اس کا دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ دوسری منزل غائب تھی۔ جس دیوان خانے میں بیٹھ کر میں خلیل جبران کی کتابیں پڑھا کرتا تھا اس کا ادھاپٹ کھلا تھا اور اندر ایک بوڑھی ہندو عورت فرش پر گائے کے گوبر کا لیپ کر رہی تھی۔ جہاں میرے دادا جان تخت پوش پر سوا در گرم کیے کشمیری چائے پیا کرتے تھے وہاں ایک بودی والا ہندو لالہ باسی پکڑوں کی چھابڑی رکھے سیتا رام سیتا رام کا جاپ کر رہا تھا۔

ماسٹر رفیق ستار کی دکان میں ایک موٹی تو ند والا سکھ حلوائی بیٹھا اپنے گندے گندے ہاتھوں سے لسی بنا رہا تھا۔ ماسٹر رفیق بڑا صاف ستھرا نوجوان تھا۔ وہ دکان کو شیشے کی طرح جمکائے رکھا۔ دیوار الٹی پالتی مارے بیٹھا لاکھ میں جڑی سونے کی انگوٹھی میں نیگے جڑ رہا ہوتا۔ اس کے بال سواری تھے، آنکھیں شفاف اور بے داغ تھیں۔ دانت صحت مند مونگ پھلی کے نزدیکی مائل سفید دانوں کی طرح ہموار اور مہو ترے تھے۔ حکام کہتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ نعت بھی پڑھتا جاتا تھا۔

نہی جی کرو ششاد ڈکھیا ریاں نوں

محببت زدہ غم دیاں ماریاں نوں

اسے ہم ماسٹر سہگل بھی کہا کرتے تھے۔ وہ محلے کی نعتیہ پارٹی کا صدر بھی تھا۔ ان دنوں میں بھی میلاد کی محفلوں میں نعتیں پڑھا کرتا؛ چنانچہ ماسٹر رفیق مجھے ہر محفل میلاد میں اپنے ساتھ لے کر جاتا۔ قمر مزی پھول دار و مال میرے گھر میں ہوتا جسے میں نعت پڑھتے ہوئے سر پر کر لیتا۔ جازم پر طشتوں میں پھل سٹھائیاں، چھو بارے، مخانے سجے ہوتے۔ اٹما بھرے پیالوں میں لگی ہوئی اگر جیاں اپنا خوشبودار

دھواں پھیلا رہی ہوتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی اہل محل گلاب دانی لیے اٹھتا اور ہم پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ نعت پڑھتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوتی۔ جب گلاب کے عرق کا ٹھنڈا اور خوشبو دار قطرہ میری بند پلکیوں، ہونٹوں اور گالوں پر پڑتا تو مجھے روحانی سرور ملتا۔ محفل میلاد سے واپسی پر ہمیں الگ الگ تبرک ملتا ہے ہم اپنے اپنے در والوں میں باندھ لیتے۔

ماسٹر رفیق کی دکان پر اس کے دوست بیٹھے اکثر سہل کانن بالا، ماسٹر نثار اور اس دور کے مشہور فلم ایکٹروں کی باتیں کیا کرتے۔ دراصل ماسٹر رفیق کو فلم میں کام کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ خوش شکل تھا۔ آواز سُرلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر نیو تھیٹر فلم کمپنی والے اسے بلا لیں، تو وہ سہل سے کم ثابت نہیں ہوگا۔ میں ہر روز صبح سات بجے والی مسجد کے سقاوے میں نہایا کرتا۔ ماسٹر رفیق بھی روزانہ اسی مسجد میں آکر نہایا کرتا۔ وضو کرنے والی ٹوٹیوں کے سامنے بیٹھا وہ کتنی ہی دیر سواک کرتا۔ پھر کالی نوں ٹوٹھ پیٹ سے رگڑ رگڑ کر دانتوں کو صاف کرتا۔ اس کے بعد سقاوے میں کس اور پام آئیو صابن سے خوب مل کر نہاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ اس کا رنگ گہرا سا لال تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ گونا ہو جائے۔

سنو کھڑوالی گراؤنڈ میں ایک تھیٹر ریکل کمپنی نے آکر مقبول گائے، تو خدا جانے کس کی سفارش سے ماسٹر رفیق کو ایک روز وہاں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ رات کے بارہ بجے تھیٹر سے گھر واپس آیا تو نہ پر لگی سُرخی پاؤڈر سمیت ہی سو گیا۔ صبح مسجد میں آیا، تو لوگوں نے پوچھا۔

”ماسٹر! یہ مٹہ پر گیا لگا ہے؟“

”میک آپ ہے اور کیا ہے؟“

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماسٹر رفیق اپنے اور اپنی دکان کے میک آپ کا ہر لحظہ خیال رکھتا تھا مگر آج اس کی دکان کا میک آپ اُجڑ چکا تھا۔ جس جگہ وہ قالین کا ٹکڑا بچھا کر اسے ہر روز بُرش سے صاف کیا کرتا تھا وہاں آج چوکی پر میل سے بھرا ہوا بوریا بچھا تھا جس پر میل کچلا تو ندیل سیکھ بیٹھا، لسی بنا رہا تھا۔ میں آگے نکل گیا۔ گئے جولاہے کے مکان کی ڈیوڑھی ڈھے گئی تھی۔ پچھلے دروازے پر سوراخ دار بوریا پڑا تھا جس کے آگے جھنگا سی چارباٹی پر ایک بیار بوریا بندو لیشا کھائش رہا تھا۔ مگر اب وہ شالوں کی رونگری کا کام کرتا تھا۔

گل خان بڑے بڑے گل فچوں والا ادھیر عمر آدمی تھا۔ جس کا گلی کے پچھلے کونے میں چائے خانہ تھا۔ چائے خانہ دراصل برائے نام ہی تھا۔ وہ اپنے چوبارے پر جوا کر داتا تھا۔ ہر جمعے کی جمعے فتم شریف بھی کرواتا اور روکر گڑا کر خدا سے اپنے پچھلے ہفتے کے گناہوں کی معافی مانگتا۔

مسجد خیر الدین کے جگہ گاتے صحن میں ہم مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا عطار اللہ شاہ بخاری کی پُر جوش اور ایمان افروز تقریریں سنا کرتے تھے۔ آج اس کی محرابوں میں دراڑیں پڑی تھیں۔ صحن والا حوض خشک ہو چکا تھا جس میں جال لگا کر دو سکہ لٹکے چڑی چھینکا کھیل رہے تھے۔ وضو کرنے والے بڑے نلکے کے ساتھ ایک گائے بندھی تھی۔

مسجد جان محمد میں لائل پور کے سکھوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ خطیب مسجد مولوی سلام بابا مرحوم و مغفور کے جُڑے میں ایک سکہ صرف کچا پہنے چارپائی پر بیٹھا اپنے گندے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں مولوی سلام بابا کا بھرا بھرا شیر ایسا گول پُر نور کشمیری چہرہ گھوم گیا۔ ان کی بارعب کڑک دار آواز مسجد میں گونجا کرتی تھی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کہیں انہوں نے زبان سے پورا ادا نہ کیا تھا۔ حضور کا اسم مبارک زبان پر آتے ہی مولوی صاحب کی ہچکی بندھ جاتی۔ میں نے کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضور کا نام زبان پر آیا اور زار و قطار رونے لگے۔ آنکھوں سے دیکھا۔ مولوی صاحب جمعے کا خطبہ دے رہے ہیں۔ حضور کا نام زبان پر آیا آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ ہچکی بندھ گئی۔ اے! کیسے کیسے مردان پاک طینت و مردان حق آگاہ تھے کہ جن کے سوز و گداز سے زمین کا دامن خالی ہو گیا۔

مسجد قاصدال کے دونوں میناروں پر اکال سکھوں نے اپنے زرد جھنڈے گاڑ رکھے تھے اور اس کی محرابوں پر سکہ عورتیں اوپے تھاپ رہی تھیں۔ یہ وہی مسجد تھی جس کے در و دیوار جمعے کے روز مولانا غلام محمد ترنم کی ولولہ انگیز تقریروں سے گونجا کرتے تھے شہر کے دھندلے محلوں سے مسلمان مسجد قاصدال میں مولوی ترنم کی تقریر سننے آیا کرتے۔ سیاہ کالی گھنی ڈاڑھی، گٹھا ہوا مضبوط بدن چوڑا چپکلا ہر وقت مسکاتا ہوا نورانی چہرہ۔ مولوی ترنم گیندے اور سرخ گلاب کے اردوں سے لہے پھندے جب منبر پر چڑھتے، تو نمازیوں میں عقیدت اور جوش ایمان کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ مسجد کا صحن، ہال کمرہ، چشتیں اور گلی نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی۔ مسجد کا صحن،

بال کمرہ، چھتیں اور لگی نمازیوں سے کچا کچ بھری ہوتی۔ چھت پر تہو، قناتیں لگی ہوتیں جہاں پردہ دار بیویاں سہمہ تن گوش ہوتیں۔ مولوی ترم عشق رسالت مآب میں نشر انکسوں سے مجمع پر نگاہ ڈالتے۔ والہانہ انداز میں گردن کو دائیں بائیں گھماتے اور پھر جیسے خدا کے حضور میں مودب ہو کر آنکھیں بند کر لیتے اور لب معجز گفتار سے یہ الفاظ نکلتے:

نحمدہ و نصلی.....

اس کے بعد خطابت و بلاغت کا ایک دریا بہہ نکلتا جو پریچ وادیوں کے ٹیلوں سے ٹکراتا تھا جو کوڑ کرتا، سنگلاخ چٹانوں کو پیچھے چھوڑتا بالآخر ایک بحر زخار میں جا ملتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار محرم کے دنوں میں مولانا ترم شہداء کو بلا کا ذکر کر رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ چھت پر عورتیں محالیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

مولانا ترم تبلیغ دین کے لیے لگی مٹے مٹے خاکر جلے کیا کرتے۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی۔ تقریر کرتے ہوئے ایک ادب جملہ سامعین پر کچھ اس طرح چست کر جاتے کہ محفل زعفران زار بن جاتی۔ ان دنوں امرتسر کے سینا گھروں میں بدھ دار سیشل زمانہ شونیا نیا شروع ہوا تھا۔ ترم صاحب ہمارے محلے میں بعد از نماز عشاء تقریر کر رہے تھے۔ لگی میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں کی چھتیں اوڑھ کر لکیاں عورتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ تقریر کرتے کرتے مولانا نے زمانہ فلمی شو کی بات شروع کر دی۔

اچانک مکانوں کی منڈیروں کی طرف دیکھ کر بولے۔

”اٹو! اٹ نہ سٹ دینا۔“

پھر انہوں نے نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ بدھ وار کو ٹینی شو پر جانے کے لیے کس طرح ایک دوسری کو اکٹھی کرتی ہیں۔

”نی سکینہ! آج منڈو سے چلنا ای۔ روٹی جلدی پکا لیں۔“

”نی دارا! جلدی جلدی کپڑے دھو۔ آج بدھ وار سے۔“ لوگ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے پھر فوٹا ہی مولانا ترم کا لہجہ پڑ عتاب ہو جاتا اور کہتے۔

”سنو! ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو تو خدا کے حضور میں جانے کی تیاریاں کرنی چاہیے تھیں۔“

یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ایک جگہ میں کشمیری گھرانوں کی شاخ چریوں اور قاص طور پر بیاہ شادیوں کے موقع پر ان کی خوش فواری اور بے جا اسراف پر تقریر کر رہے تھے کہ شادی کی دعوت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔

”دیگیں کھل گئی ہیں۔ دسترخوان لگ گئے ہیں۔ پلاؤ کی مہک اڑنے لگی ہے۔ زردہ، برانی متجن سے بھرے ہوئے قاب جا رہے ہیں۔ اونے چھیدرے قورمہ ہو روے جا۔ کاکاجی! پٹھکی بوٹی بھیج دیا ہے تی صفر! متجن داک کاب دے جا۔“

لوگ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے۔ اچانک مولانا ترم کا لہجہ بدل گیا۔ بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔

”شرم کرو بہتے ہو کیا تمہیں یاد نہیں ہمارے نبی اکرمؐ نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ ان کے گھر میں لاقہ آجاتا تھا۔ مسلمانو! تم کہاں سے چلے تھے اور کہاں آگئے ہو۔۔۔۔۔“

اس کے بعد اسلامی تاریخ کے اوراق کچھ ایسے دلگداز انداز میں الٹنا شروع کرتے کہ وہی مجمع جو ایک منٹ پہلے ہنس رہا ہوتا سسکیاں بھرنے لگتا۔

اب میں اپنی لگی کی لال حویلی کے سامنے سے گزر رہا ہوں۔ اس حویلی سے محرم کے سو گوار دنوں میں جھولا نکلا کرتا تھا۔ ہم اپنے باندر میں کھڑے جھوٹے کابے تابی سے انتظار کیا کرتے۔ جب کڑمندی کے چوک میں سیاہ علم نظر آتا، تو ہم بھاگ کر جھوٹے میں شامل ہو جاتے۔ سوز خوانوں کی آواز میں آواز ملاتے۔ ماتم والوں کے پیچھے پیچھے چلتے جاتے۔ مکانوں کی چھتوں سے عورتیں جھوٹے پر آٹیاں اور گیندے گوب کے پھول پنچا در کرتیں۔ جو پھول جھوٹے سے نیچے سرک پر گر پڑتے ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جھوٹے سے سڑک پر گر پڑتے ہم انہیں فوراً اٹھا کر چومتے، آنکھوں سے لگاتے اور جیب میں رکھ لیتے۔ ہماری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ جھوٹے سے گرا ہوا پھول چوم کر گھر لے آنا۔ وہ ان پھولوں کو چینی کے مرتبانوں میں سنبھال کر رکھا کرتی تھیں۔ بہندی کے دن محلے کے ہر گھر سے ریشی سرخ دوپٹے لے کر ہم ان کے علم بنا کر تانگوں میں بیٹھ جاتے اور سوز خوانوں کی معیت میں آدھے شہر کا چکر لگاتے۔ ہماری لگی سے کئی تعزیرے نکلتے۔ رام بارغ والا تعزیرہ اپنے لکڑی کے بے مثال کام اور آٹھ منزلہ چھنے کی وجہ سے سارے محلے میں اول تھا۔ نویں محرم کو شبیبہ ذوالجناح ہمارے محلے سے گزرتی، تو گتے بازوں کی ٹولیاں آگے آگے ہوتیں۔ شبیبہ سنی کا وہاں کوئی سوال نہ تھا۔ سب اسلام

کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ اسرت سرین خرم کے دنوں میں ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا جس میں مسلمانوں کا پتہ ہمیشہ بھاری رہتا۔ پٹ رنگوں کا تعزیہ گورو بازار یعنی ہندوؤں کے گڑھ سے ہو کر گزرتا تھا۔ ہندو ضرور شرارت کرتے۔ مسلمان بھی ہر قسم کے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم لے کر نکلتے تھے۔ ایک دفعہ یہ تعزیہ کرموں ڈیور بھی کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک ہندو ملوانی نے جو پڑیاں تل رہا تھا چپنی سے گرم گرم کھولتا ہوا کھی مسلمانوں کی طرف اچھال دیا۔ مسلمان "نعرۂ تکبیر" اور یا علی کے فلک شکاف نعروں کے ساتھ دکان پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے لمحے دکان سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

لال حویلی میرزا بیضا خان مروی ایرانی کے آباؤ اجداد نے بنائی تھی۔ میرزا صاحب بڑے کم گو حلیم الطبع، خوش اخلاق، خوش وضع اور خوش فکر شاعر تھے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ہم آٹھویں نویں میں پڑھا کرتے تھے، ان کی علمیت کا اندازہ نہ لگا سکتے تھے، لیکن میرزا صاحب اپنے دیوان خانے میں کبھی کبھی شعرو سخن کی محفل گرم کرتے، تو میں مزور گھس گھسا کر کہیں نہ کہیں بیٹھ جاتا۔ اہل محفل میرزا صاحب کے شعروں پر خوب داد دیتے۔ آج میرزا بیضا خاں مروی ایرانی کی شمع محفل سیاہ پوش رہی تھی۔ لال حویلی کی منڈیروں پر سوکھی گھاس آگ رہی تھی۔ ڈیور بھی میں ایک گائے کھڑی کوٹنے میں پڑا نمک کا ڈلا چاٹ رہی تھی۔ میرزا صاحب کے دیوان خانے میں ایک موٹی لالائی چرخہ کات رہی تھی اور اس کی زرد روکتی پاس ہی بیٹھی رو رہی تھی۔ بہار کا کارواں گزر گیا اور اپنے پیچھے ایک ایسی خزاں چھوڑ گیا جس کی بہار کبھی نہیں آئے گی۔ راستے خون اور مٹی میں چھپ گئے۔ گرے ہوئے پتوں کو ظلم کی ہوا اڑا کر لے گئی۔ پھر کسی دور کسی رات اور کسی گلشن میں نہ ملنے کے لیے اڑا کر لے گئی۔ سورج غروب ہوا۔ اندھیری رات چھا گئی اور پھر اس رات کی کوئی صبح نہ ہوئی، کوئی سورج نہ نکلا۔ کسی مشرقی افق کی گود سے سنہرے کرنوں نے طلوع ہو کر فاک لبر مر جھائے ہوئے پھولوں کا منہ نہ چرما۔

بچپن میں میں نے ایک پنجابی شعر سنا تھا۔ سردیوں کی شہر تی صبحوں کو ایک پو پھٹے گلی

میں سے گاتا گزر جاتا ہے

تینوں سفا ہو جان گیاں

بابل ویاں گلیاں نی،

د بے بابل کی گلیاں ایک دن خواب ہو جائیں گی

میں اپنے لحاف میں دبکا اس فقیر کی درد بھری آواز سنتا اور پھر سو جاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا سچ مج ایک روز بابل کی گلیاں خواب و خیال بن کر رہ جائیں گی۔ کوئی بھی نہیں پہچانے گا۔ مسجدیں اُجڑ جائیں گی۔ ان کے بتاروں کے سنہری کلس مندروں کی بُرجیوں پر لگا دیئے جائیں گے۔ مکانوں کے چھتے جھک جائیں گے اور چھتوں پر پڑی چمنیں جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ چھتوں کی منڈیروں پر سوکھی گھاس آگ آئے گی۔ کھڑکیاں تنگی اور بے حیا ہو جائیں گی اور ہر گھر دبیز سے لے کر عقیقہ کرے تک عریاں دکھائی دے گا۔ اس گلی کے سر پر سے چادر کس نے کھینچ لی تھی؟ اس کا سہاگ کون ٹوٹ کر لے گیا تھا؟ کل تک یہ گلی میرے محلے کی مانگ تھی اور اس مانگ میں سہاگ کا زعفران نمک رہا تھا اور جوڑے میں سوتیلے کے سفید پھول مگڑا تھے، لیکن آج اس پر گندی خشک خالی کا گمان ہو رہا تھا۔ کل اس گلی میں سے سفید نسواری، سیاہ بُرقعوں میں لپٹی، شرمیلی، حیا دار، سٹی سمٹائی ٹڑکیاں گزرا کرتی تھیں اور آج یہ تنگے سراب ہند پاؤں بیچ بازار میں کھڑی تھی۔ کل یہ بھی دور دور سے اپنے پاس بلایا کرتی تھی اور آج یہ اتنے قریب سے بھی نہیں پہچان رہی تھی۔

یہ اندھی، سنگدل، ویران گلی!

اس گلی نے ہمارا دودھ پیا ہے۔ ہمارا خون پیا ہے۔ اس نے وفا کا ہنس ہم سے لیا اور پیمانہ وفا غیرو سے باندھ لیا، لیکن۔۔۔ لیکن یہ گلی تو مر چکی ہے اور میں اس کی لاش پر کھڑا آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے لاش پر آنسو نہیں بہاتے۔ میں آنسو بہانے والی اُمت میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اس لاش پر پاؤں رکھ کر آگے گزرنے ہے۔ زمین میں دھنستے ہوئے اس ٹھنڈے بے جان پتھر کو پیچھے چھوڑ کر ابھرتے ہوئے روشن چاند کی طرف جاتا ہے۔ اس کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے ہیں۔ اس کے کھنڈر پر ایک نیا، درخشاں اور تابناک تاج محل تعمیر کرنا ہے۔ الوداع امیری تاریک گلی کے روشن چہروا میں ایک نئی گلی کے افق پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کی کرنیں میری آنکھوں میں بہیں اور اس کی روشنی میرے راستوں پر ہے۔

امرتسر کی مسجدیں

امرتسر میں مسجدیں بہت تھیں۔ پُر شکوہ پربلال، کشادہ، رب عظیم کی حمد و ثناء سے گو بجتی ہوئیں اور توحید کی فضا نے سردی میں سرشار ٹھنڈی نیم روشن ڈیوڑھیوں اور پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی محرابوں اور پُرسکون، برآمدوں والی مسجدیں۔ جن کے دودھیا گنبد اور سنہری کس و صوپ میں چمکا کرتے تھے۔ ان میں ایسی مسجدیں بھی تھیں جنہیں محلے کے مکانات نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ کچھ مسجدوں کے کشادہ صحنوں میں لبالب بھرے ہوئے تالاب بھی تھے جہاں بیٹھ کر نمازی وضو کیا کرتے ان تالابوں میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ جمعہ کے روزیاں شامیانے تان دیئے جاتے اور مسجدوں کی چھتیں اور صحن ابلے ابلے پاکیزہ کپڑوں والے نمازیوں سے بھر جاتے۔ فضا میں عطر گلاب اور عطر حنا کی خوشبوئیں بس جاتیں خاص خاص موقعوں پر ان مسجدوں کو جھاڑ فانوس کیلے کے چوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا رات کو چراغاں ہوتا اور اگر تہیوں کی خوشبو سارے محلے کو مہکا دیتی۔

لیکن یہاں میں صرف ان مسجدوں کا ذکر کروں گا جن سے میرے بچپن اور جوانی کی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ یہ وہ مسجدیں ہیں۔ جو آج بھی میرے خوابوں میں آتی ہیں اور جن کی پھولوں میں چھپی ہوئی محرابوں سے لگ کر میں بند آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوں ان میں سے کوئی بھی مسجد میرے لئے مسجد قرطبہ سے کم نہیں۔ امرتسر میرا ہسپانیہ تھا۔ میرا اندلس تھا اور کہنی باغ میں اندلس کا الحمرا تھا۔ جہاں میں سات سو سال تک رہا اور پھر مجھے میری مسجد قرطبہ اور میرے الحمرا کی روشنیوں پر شہید کر دیا گیا۔ گلاب کے وہ سرخ پھولوں جو ان باغوں اور مسجدوں کے صحن میں کھلا کرتے تھے آج بھی میری یادوں کی سجدہ گاہوں میں شگفتہ و تروتازہ ہیں اور میں اپنی بند آنکھوں میں ان پھولوں کی شبیہ ٹھنڈک اور نفس گرم میں ان کی آسمانی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔

آیتے میں سب سے پہلے آپ کو اپنے محلے کی، اپنی گلی کی مسجد میں لئے چلتا ہوں۔ میں نے تو اس مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آنسوؤں سے وضو کر لیا ہے۔ آپ بھی وضو کر لیں۔ یہ مسجد ہمارے گھر کے عین سامنے تھی اور مسجد عیدالون کہلاتی تھی۔ وہ دیکھتے پیر جی صفت بیٹھے محراب کی دیوار سے ٹیک لگائے کتابت کر رہے ہیں۔ لکڑی کا لمبوتراروغنی قلدان قریب بڑا ہے یہ ہماری مسجد کے امام ہیں نام ان کا بھول گیا ہوں۔ سب انہیں پیر جی کہتے تھے اونچے لمبے دھیرا بدن، بھری بھری ڈاڑھی، جس میں سفید بال بھی تھے۔ خالص کشمیری تھے۔ محلے کے باتوں اور میری نانی سے کشمیری زبان میں گفتگو کرتے تھے سر پر کلاہ پہنتے۔ جمعہ کی نماز سے پہلے خطبہ دیتے تو نسواری رنگ کا ایک جبتہ زیب تن ہوتا۔ فرصت کے وقت محلے کے بچوں کو دینیات پڑھاتے اور حدیث و فقہ کے مسودات کی کتابت کرتے۔ کسی وقت مسجد کی رونٹ پر بیٹھے گلی میں آنے جانے والوں کو غور سے دیکھا کرتے۔ ہماری شرارتوں پر بڑی سختی سے ہمارے کانوں میں ناخن چبھو کر بڑی نرم آواز میں سرزنش کرتے تھے۔ کشمیری لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ ہم وضو کرنے والے حوض کی ٹونٹیاں کھل چھوڑ کر بھاگتے تو ہمیں لپک کر پکڑ لیتے۔ کان کی ٹو میں انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے ناخن چبھو کر بڑی شفقت سے کہتے۔

”ٹوٹی کھل نہیں چھوڑ دی۔“

مسجد کے پیچھے ان کا گھر جس کا ایک راستہ حجرے میں سے بھی جاتا تھا۔ پیر جی کا لڑکا امین میرا بھولی تھا۔ غضب کا شرارتی تھا۔ کبھی آرام سے نہیں بیٹھتا تھا اور کچھ نہیں تو مسجد کی چھت پر چڑھ کر گلی میں سے گزرتے لوگوں کو روٹے مارنے شروع کر دیتا۔ امرتسر میں ایک سرکس آیا۔ جس میں ایک کتا بندی سے آگ میں چھلانگ لگاتا تھا۔ ہم دونوں نے مسجد کے کچھوڑے ایک چوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں بالٹی سے پانی بھرا۔ کتے کو لے کر امین چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے پانی میں مٹی کے تیل سے بھری ہوئی بوری کو آگ لگا کر ڈال دیا۔ امین نے اوپر سے کتے کو پھینک دیا۔ کتے کی قسمت اچھی تھی کہ باہر گرا اور بچ گیا۔ پیر جی کے حجرے میں ایک نوبت پڑی تھی۔ رمضان المبارک میں سحری اور افطار کے وقت یہی نوبت بجاٹی جاتی۔ یہ نوبت کبھی میں بجاتا اور کبھی امین بجاتا تھا۔ زیادہ تر یہ فرض مسجد کا موزن ہی سرانجام دیتا تھا۔ لیکن ہمیں نوبت بجانے کا بڑا شوق

تھا۔ ایک روز افطار کے وقت سے پانچ چھ منٹ پہلے ہی نوبت بجا دی۔ پیر جی ڈنڈا لے کر ہمارے پیچھے بھاگے۔ رات کو مجھے بھی گھر سے مار پڑی اور امین کی بھی خوب خبر لی گئی۔

ایک روز میں اور امین ساتھ ساتھ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ پہلے مسجد کے بعد سرائٹھا یا تو میری جیب سے ایک دوٹی نکل کر صف پر گر پڑی۔ دل میں سوچا کہ سلام پھیرنے کے بعد اٹھاؤں گا۔ لیکن دوسرا سجدہ کرنے کے بعد جو دیکھا تو دوٹی غائب تھی۔ معلوم ہوا کہ امین نے مسجد کے دوران کمال چاکل دستی سے اٹھا لی تھی۔ ایک روز امین نے مجھے کہا۔

”میں ہوا میں اڑ سکتا ہوں۔“

”نکو اس کرتے ہو۔“

”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اڑ کر دکھاتا ہوں۔“

وہ مجھے ساتھ لے کر قبرستان گھی منڈی والی سڑک پر گیا۔

”یہاں کھڑے ہو کر دیکھتے رہنا۔ وہ جو ٹاپی ہے نا۔ بس اس کے پاس جا کر میں ہوا میں اڑھاؤں گا۔ یہ کہہ کر امین نے شلوار کے پائینے اوپر کے اور ماتوں کی بندھنوں کو چوم کر اندھا دھند بھاگ اٹھا۔ میری نظر اس ٹاپی پر تھی۔ جہاں سے امین نے ٹیک اوت کرنا تھا۔ آپ یقین کریں کہ وہ اس ٹاپی کے پاس پہنچ کر غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور اڑ گیا ہو گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر دکھائی دیا۔ دونوں ہانعوں کو ناپٹنے والیوں کی طرح لہراتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم نے مجھے اڑتے ہوئے دیکھا تھا نا؟ پورے قبرستان کا چکر لگا کر آیا ہوں۔ جی ٹی روڈ والے بجلی کے کھمبے سے ٹکرتے ٹکرتے بچا۔“

آج بھی جب وہ منتظر یاد آتا ہے کہ امین کس طرح رقص کرتا میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

گرمیوں میں مسجد کے کنوئیں پر نہانے والوں کا جھوم رہتا۔ دو سقاوے تھے۔ جن کی ٹوٹیوں میں مسواکیں ٹھنی ہوئی تھیں۔ فرش پر پھیلی تھی اور دیواروں پر سبز کائی جی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ منہ سر صابن کی جھاگ میں چھپا ہے اور سقاوے کی مسواک نکل کر فرش پر گر پڑی ہے اب ایک ساتھ سقاوے کے سوراخ پر ہے کہ پانی نہ نکلے اور دوسرے ہاتھ سے فرش پر سے مسواک تلاش کی جا رہی ہے نہ مسواک مٹی اور

نہ پانی کی دھار رکتی۔ باہر سے حیرت انگیز سقاوے میں بوکا ڈال کر آواز لگاتا ہے۔

چلو بھئی چھوٹے خلیذا اندر اتنی دیر کیوں لگا دی۔ گارڈ محمد حسین بیٹ اپنے دانتوں پر کالی نوٹس ٹوٹھ پیسٹ کرتے ہوئے کہتا۔

”یہ لڑکا اگر شعلے میں ہو تو اس پر واٹر ٹینکس لگ جائے۔“

مسجد کے چوترے پر مٹی کا ایک بڑا پیالہ رکھا ہوتا جس میں محلے کے بچے اور عورتیں آکر کڑوا تیل ڈال جاتی تھیں۔ یہ تیل مسجد کے لئے ہوتا۔ چوٹی پہلوان سقاوے کے باہر بیٹھ کر اسی تیل سے اپنی مالش کیا کرتا۔ ایک بار پیر جی نے اسے کہا۔

”چوٹی اکبھی نماز بھی پڑھ لیندی۔“

چوٹی پہلوان کو بڑی شرم آئی۔ اسی روز نماز کے وقت وضو کر کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بعد میں محلے کے ایک آدمی نے اس کی نماز پر سخت تنقید شروع کر دی۔

”تمہارا وضو غلط تھا۔ تمہارا رکوع ٹھیک نہیں تھا۔ تم نے ہاتھ ٹھیک طرح سے نہیں باندھے تھے۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہو گی۔“

چوٹی کو بڑا غصہ آیا۔ سر پر بندھا ہوا صافہ اتار کر زور سے فرش پر مارا اور اتنا کہہ کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

”اب کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔“

امام مسجد پیر جی کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ اسی وقت چوٹی کے گھر گئے اور اسے کچھ ایسی محبت، پیار اور اخلاق کے ساتھ سمجھایا کہ وہ اس کے بعد سے پکا نمازی بن گیا۔ پیر جی کا اخلاق بڑا بلند تھا۔ مسجد کی رونٹ پر بیٹھے ہوتے اور گلی میں گھومتے ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ کسی نے کبھی انہیں کسی کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرتے نہ سنا تھا۔ مسجد میں اگر ہم شور مچاتے تو اپنے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر ہمیں منع کرتے۔ زیادہ شرارتیں کرتے تو بس کان میں ذرا سانان سن چھو دیتے۔

عید میلاد کے مبارک دن اسی مسجد کے باہر سے جلوس تیار ہوتا۔ ہم میں سے ہر لڑکے کی یہی خواہش ہوتی کہ سبز پرچم تمام کر جلوس کے آگے آگے چلے اس روز امین کی دوستی بڑی کام آئی۔ وہ مجھے ایک نہ ایک جھنڈا ضرور تھا دیتا جسے کندھے کے ساتھ لگا کر میں بڑی شان سے جلوس کے ساتھ ساتھ

چلتا۔ رات کو مسجد میں ختم شریف ہوتا تو فیروز نعت خوان کی آواز محلے کے ہر گھر میں جاتی۔ میں بڑے شوق سے تبرک کے مکھانے اور کھجوریں لے کر گھر جاتا۔

مسجد کی چھت میں ایک خوبصورت فانوس لگا تھا جس کی روشنی میں دیواروں پر لگی زرد روغنی ٹائیلیں اور ان پر ابھرے ہوئے۔ گلاب کے پھول چمکا کرتے۔ گرمیوں کی سسنان دھپروں میں مسجد کے صحن سے آذان کی آواز ابھر کر فضا پر چھا جاتی۔ نماز کے وقت مسجد کے دروازے کے آگے عورتیں اور محلے کی لڑکیاں اپنے کمن بچوں اور بھائیوں کو کاندھے سے لگائے کھڑی رہتیں نماز کے بعد نمازی باہر نکلتے تو ان بچوں پر پھونکیں مارتے جاتے۔

سن ۱۹۴۷ء کے اگست کے مہینے کی چودہ تاریخ کی رات کو ہمارے محلے پر ہندوؤں اور سکھوں نے اس قدر شدید فائرنگ کی کہ اتنی گولی پہلے کبھی نہیں چلی تھی ساسی رات پیر جی کا مسجد کے حجرے میں انتقال ہو گیا دوسرے روز ہماری گلی کے آہنی دروازے پر ڈوگرہ فوج نے بم مارا ہر طرف جھگڑا مچ گئی۔ عورتیں، بچے جواں اور بوڑھے سرسید ہو کر گلی کے دوسرے دروازے سے ہو کر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ سامنے شریف پورہ تھا بیچ میں ایک سڑک تھی۔ برج پھولا سنگھ میں نہنگ سکھ بیٹھے اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ غلام محمد شال مرچنٹ کا بڑا لڑکا موٹلی اپنے بچے کو گود میں اٹھائے نالا عبور کر رہا تھا کہ گولی بچے کے سر میں لگی اور کھوپڑی کو توڑ کر اس کے باپ کے سینے سے نکل گئی۔ دونوں نالے میں گرے اور پاکستان پر قربان ہو گئے۔

کیا کیا کچھ پاکستان پر قربان ہو گیا! کیسے کیسے انمول موتی خاک میں مل گئے! ہماری تاریخ کا یہ ایک الم انگیز باب ہے جس کا ہر ورق ہمارے عظیم شہداء کے خون سے سرخ رو ہے۔ جس کی ہر سطر ایک دیوار گریہ ہے۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ پاکستان کی نئی نسل کو اس دیوار گریہ کے سامنے لے جاؤں۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر اپنے شہیدوں کے خون کے چھینٹے دکھاؤں اور پھر ان سے پوچھوں کہ کیا یہ قربانیاں اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتی کہ ہم اپنے وطن کی ابرو پر اپنی جانیں قربان کر دیں؟

تقسیم کے بعد میں دیراے کرام تر گیا تو اپنے محلے میں بھی آیا۔ مسجد عیدالون کے صحن میں پھل کا دفعت لگ رہا تھا اور اندر جہاں کبھی پتھر کے منبر پر بیٹھ کر پیر جی جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ وہاں گیش دیوتا کی مورتی رکھی تھی۔ اور ایک مہنت وہاں بیٹھا پوجا پاٹھ کر رہا تھا۔

بیہڑ والی مسجد ہمارے بازار میں پکی گلی کے سامنے تھی۔ ڈیوڑھی سے گزر کر سیریاں مسجد کی گیلری کو جاتی تھیں جو مسجد کے اندر جاتی ہوئی تھی۔ اس گیلری کا فرش کھڑی کا تھا اور رمضان شریف کے مہینے میں ہم بڑے یہاں تراویح پڑھا کرتے۔ گیلری میں تراویح اس لیے پڑھتے تھے کہ جب تک جلتے تو چپکے سے کھسک جایا کرتے۔ اس مسجد کے امام کا نام اگر بھول نہیں رہا تو احمد شاہ تھا۔ گورے چٹے ادھیر عمر کے کشمیری بزرگ تھے۔ شرعی دائرہ تھی۔ بیٹھ سفید لباس پہنتے۔ سنہری فریم والی عینک لگی ہوتی۔ چہرے پر نور برسا کرتا۔ سر پر سفید صاف باندھتے تھے۔ بڑے ہی پاک صاف رہتے۔ ابراہیم عطار کی دکان شربت پینے آتے تو پہلے پیٹھے کے گلاس کو نمک سے دھواتے۔ پھر ہونٹوں پر تل کا دھلا دھلا مال لکھ کر شربت پیے۔ ہفتے میں شاید ایک بار وہ چپ کا روزہ رکھتے۔ پھر وہ چراغ سبزی والے کی دکان پر کھڑے ہو کر اشادوں سے سبزی خریدتے۔

اس مسجد کے باہر بڑا گھٹا درخت تھا۔ جس نے اس پاس کے مکانوں پر اپنا سایہ کر رکھا تھا۔ کنواں باہر کی طرف تھا۔ جہاں سے محلے کے بہشتی مشکیں بھر آتے۔ سحری کے وقت سخت سردی میں اس مسجد کی گیلری کی فضا گرم ہوتی۔ محرابوں پر غنڈے گرے ہوتے۔ جماعت کھڑی ہوتی تو مسجد کی فضا میں ایک پُر جلال خاموشی چھا جاتی۔ اس مسجد کی دیواروں پر قرآنی آیات کے قلعے لگے تھے یہ مسجد بھی اتنی کشادہ نہیں تھی۔ مسجد عیدالون کی طرح یہ بھی مکانات میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے کنویں کے قطرے پر سبز کائی جی رہتی۔ جس پر گرمیوں میں زرد بھڑی اگر بیٹھا کرتیں۔ ہم ان پر گیل کا قند مار کر پکڑتے۔ ان کے ڈنک نکال کر دھاگہ باندھ کر اڑایا کرتے۔ عید شبرات اور رمضان شریف میں اس مسجد میں بڑی رونق ہوتی۔

تقسیم کے بعد اس مسجد کو دیکھا کہ فتنہ حالت میں تھی لیکن کشمیری باتو اور پاٹھی یہاں رہ رہے تھے جن کی وجہ سے یہ مندر بننے سے بچ گئی۔

ہمارے محلے میں ہی کھٹی کے باغ کے پہلو میں مسجد جان محمد تھی یہ مسجد دوسری منزل پر تھی اور کافی کشادہ تھی۔ نیچے دکانیں تھیں۔ ایک طرف سے یہ مال بازار کو لگتی تھی۔ مال بازار کی جانب مسجد کے نیچے امرتسر کے مشہور و معروف پینٹر عبدالغفار کی دکان تھی۔ مسجد کا دروازہ ہمارے بازار میں تھا۔ دونوں جانب دھوکے لئے نلکے لگے تھے۔ پیچھے سقاویں تھیں۔ صحن چوڑا تھا۔ محرابوں پر غنڈے سردیوں

میں گرا دیئے جاتے اور گرمیوں میں لپٹے رہتے۔ دائیں جانب ایک احاطے میں مسجد کے بانی جان محمد کی قبر تھی۔ جو مسجد سے باہر تھی۔ اوپر کھلا آسمان تھا۔ امرتسر کا خوبصورت نیلا آسمان! سلام بابا اس مسجد کے پیش امام تھے۔ بھاری بھر کم، گھٹی سفیدی مائل داڑھی۔ چھوٹا قد مگر مضبوط جسم امرتسر کے پرانے کشمیریوں کی طرح سرج و سفید رنگت تھی تیز تیز باتیں کرتے تھے۔ میڑھیاں چڑھ کر مسجد کے دروازے کے بالمقابل ان کا حجرہ تھا مگر بازار میں اپنے الگ مکان میں رہتے تھے ان کا ایک بڑا بالکل ان کی شکل کا تھا۔ مجھ سے بڑا تھا۔ بینک لگا تھا۔ اوپر والے ہونٹ پر سردیوں میں بھی پسینہ آیا رہتا۔ پانگ شو کے سگریٹ پیتا تھا۔ جس کی خوشبو مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ گھر کی بیٹھک میں ہر وقت کتابیں پڑھتا رہتا۔ بڑا کم گو تھا۔ کسی وقت میری طرف دیکھتا تو مجھے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھوں میں ایک گہری اداسی کی جھلک دکھائی دیتی۔ تقسیم کے بعد پھر ان صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی مجھے ان کا نام بھی یاد نہیں رہا۔

اس مسجد کی ایک خاص بات یہ تھی کہ سال میں ایک بار یہاں کوئی کانفرنس ہو کرتی جو تین روز تک جاری رہتی۔ اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے علماء کرام تشریف لایا کرتے۔ ایک بار معراج شریف کے موضوع پر باہر سے آئے ہوئے ایک مولانا صاحب نے سائینٹفک حوالوں کے ساتھ ایسی پر مغز تقریر کی کہ لوگ عیش عیش کرا گئے۔ میں بھی اس جلسے میں بیٹھا تھا۔ امرتسر میں مدتوں ان مولانا صاحب کی تقریر کے چرچے رہے۔ اس مسجد میں مجھے اپنا نماز پڑھنا یاد نہیں۔ لیکن کانفرنس کے اجلاسوں میں ضرور جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد اس مسجد کو بھی سرنگر سے آئے ہوئے کشمیریوں نے اپنی تحویل میں لے لیا اور سنا ہے کہ بوہڑ والی مسجد کی طرح یہاں بھی پانچوں وقت اذان ہوتی ہے۔

مسجد خیر الدین ہال بازار میں تھی کشادہ صحن بیچ میں پانی کا حوض جس میں سرج مچھلیاں تیرا کرتیں۔ چھٹی ہوئی ڈیوڑھی میں ٹھنڈا ٹھنڈا نیم روشن اندھیرا سا چھایا رہتا۔ مولانا عطار اللہ شاہ بخاری نے اس مسجد میں جو دلولہ اگیو پر جوش تقریریں کیں وہ امرتسر کے مسلمانوں کو آج بھی یاد ہوں گی۔ جس روز شاہ صاحب کی تقریر ہوتی مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی چونکہ لڑکیوں کی یادوں کے سہارے یہ مضمون لکھ رہا ہوں اس لئے شخصیتوں کے منصوبوں کے تعین کے سلسلے میں اگر کوئی سہو ہو جائے تو معذرت

چاہوں گا میرا خیال ہے کہ امرتسر کے مشہور اور جید عالم دین مفتی محمد حسین اس مسجد کے پیش امام تھے۔ میں انہیں اکثر اس مسجد میں تشریف لاتے دیکھا کرتا تھا۔ ان کے ایک پاؤں میں تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سپیوں والی کرسی پر بیٹھ کر تشریف لاتے ان کے قابل قدر صاحبزادے حافظ عبید اللہ میرے دوست تھے اور ماٹار اللہ اب بھی ہیں حافظ عبید اللہ اس مسجد میں حدیث اور فقہ پڑھتے بھی تھے اور درس بھی دیتے نو عمری میں ہی علوم کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے ان کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کو ہم چشم غزال کیا کرتے تھے۔ ایسی خوبصورت آنکھیں ہمارے دوستوں میں سے کسی کی بھی نہیں تھیں آج بھی جب کہیں وہ مجھے ملتے ہیں تو میں ان کا ٹھنڈا چشمہ اتار کر چشم غزالاں کا دیدار ضرور کر لیتا ہوں۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں دائیں جانب ایک حجرہ تھا جہاں حافظ شفیع بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے دبلے پتلے خوش مزاج، خوش اخلاق و پرہیزگار، استعنا اور توکل علی اللہ کی زندہ تصویر مجھ سے عمر میں پندرہ بیس سال بڑے تھے۔ سبحان اللہ تکیہ کلام تھا۔ کھانے کو مل گیا تو سبحان اللہ فاقہ آگیا تو بھی سبحان اللہ کہہ کر مسکرا دیتے۔ بار بار سے دو آنے کی چائے کی چٹیک منگواتے صندوقچی میں سے ٹین کی گول ڈبی نکال کر اس میں سے تھوڑا اصلی زعفران چائے میں ڈالتے اور پھر جب زعفران کی خوشبو اڑتی تو پیالی ہمارے آگے بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہتے۔

”سبحان اللہ“

بات کرتے وقت ان کے منہ سے لوگ کی خوشبو آیا کرتی۔ کیونکہ وہ پان میں لونگ ڈال کر کھاتے تھے۔ مسجد کی ڈیوڑھی میں ان کے جبرے کے باہر ایک گھنی بیل کا سایہ تھا جس کی شاخیں موسم بہار میں گلابی پھولوں کے جھرمروں سے لد جاتیں۔ یہ پھول فرش پر بھی گرا کرتے۔ حافظ شفیع ان پھولوں کو دیکھ کر کہا کرتے۔

”سبحان اللہ! میری بیل نمازیوں کے قدموں میں پھول بچھا کر کرتی ہے۔“

اب میں آپ کو مسجد عید گاہ کی طرف لئے چلتا ہوں۔

یہ ہمارے محلے کی عید گاہ والی مسجد تھی۔ دروازہ رام باغ سے نکل کر سیدھا کلپنی باغ کی طرف چلیں تو جی روڈ کراس کرنے کے بعد یہ مسجد بائیں ہاتھ کو ریوے پھاگ سے پہلے آتی تھی عید گاہ کی چار دیواری میں ایک دروازہ تھا۔ دروازے کی ڈیوڑھی میں سے گزریں تو سامنے انار کے درختوں

نے اپنی ٹھنڈی چھاؤں ڈال رکھی تھی۔ اس کے بعد عید گاہ کا مختصر سامیان تھا۔ یہاں ہم اگلے اگلے پہن کر ماؤں کے لگائے ہوئے سرے اور عطر میں بے عید کی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ تھوڑے وقفے قافلے پر یہاں چھوٹے چوڑے بنے تھے۔ جن پر بکر کھڑے ہوتے اور اللہ اکبر کی صدا کو آگے بڑھاتے آج کل لاؤڈ سپیکروں کی وجہ سے بہت کم بک کر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنے گھر سے لایا ہوا کپڑا آگے بچایا ہوتا۔ جس پر گھر سے ہو کر عید کی نماز پڑھی جاتی اور بیٹھ کر عید کا خطبہ سنا جاتا۔ خلیفہ یسین صاحب اس مسجد کے امام تھے جن کا گھر ہماری گلی میں تھا۔ سیاہ گھٹی ڈارمی اور مشہدی کے ساتھ بڑے بارعب گئے۔ مسجد کے چھوٹے سے باغچے میں ان کا حجرہ بھی تھا۔ ریلوے لائن عید گاہ کی دیوار کے پار تھی ہم اس دیوار پر بیٹھ کر ریل گاڑیاں دیکھا کرتے تھے مسجد کے حوض کے ارد گرد برسات میں موٹی موٹی جامنیں ٹپک کر تیں جنہیں ہم بہت شوق سے کھایا کرتے۔ مسجد کے سامنے والے درختوں میں انار پکتے تو ہم خلیفہ صاحب کی نظریں بچا کر انہیں توڑ کر نیکر کی جیبوں میں بھر لیتے سادوں کی لمبی جھڑیاں لگتی تو ان جامنوں میں کوئیں بولا کرتیں۔

برسات کی بارش میں خالی نیکریں پہنے، ننگے پاؤں اپنے محلے سے نکل کر عید گاہ والی مسجد میں آتے اور جامن کے درختوں پر چڑھ کر جامنیں توڑا کرتے۔ بچپن ہی سے ہمارے دلوں میں یہ فوٹ بٹھا دیا گیا تھا کہ جامن کا پیڑ بڑا کچا ہوتا ہے پھر بھی ہم بندروں کی طرح ان درختوں پر چڑھ کر پھل کھاتے اور کھیل تماشے کیا کرتے۔ گرمیوں کی راتوں کو چھت پر سوتے ہوئے میری آنکھ کھل جاتی تو میں دیکھتا کہ لہر لہر کے پچھلے پہر کے آسمان پر نیلے چمکے ستاروں کے فانوس جگمگا رہے ہیں۔ ہر طرف گہری، ٹھنڈی، شبنم آلود خاموشی ہے اور عید گاہ کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آرہی ہے یہ قلب کو گرہ دینے والی اور روح کو تڑپا دینے والی آواز میں آج بھی آدمی آدمی راتوں کو کبھی کبھی سنتا ہوں اور کمرے سے باہر نکل کر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتا ہوں لیکن وہ سبز پانی کا حوض اور جامن کے درختوں کے جھنڈ کہیں نظر نہیں آتے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ مسجد بھی ویران ہو چکی تھی۔ عید گاہ میں لوگوں نے کوڑا بٹالے تھے اور امام صاحب کے حجرے میں ایک سکھ شرتار تھی سا نیکیوں کو پتھر لگا رہا تھا۔ حوض پر چمکے ہوئے جامن کے درخت ویران ہو گئے تھے اور حوض میں لمبی لمبی خشک گھاس اگی تھی، مسجد کے صحن

میں ایک جانب سکھوں نے گائے بھینسیں باندھ رکھی تھیں اور اناروں کے درخت کہیں بھی نہیں تھے نہ انار تھے۔ نہ اناروں والا راستہ تھا۔

مسجد قاصداں ہمارے گھر سے دور دوسرے محلے میں تھی۔ مجھے اس محلے کا نام یاد نہیں رہا۔ کمرہ جیل سنگھ سے نکل کر ہم چڑے کی دکانوں والے ایک بازار میں آ جاتے۔ یہاں سے نکلے تو دائیں جانب ایک گلی مڑتی۔ آگے گوبروں کا دیہڑا آ جاتا۔ یہاں مکانوں کی دیواروں پر پھاتیاں لگی ہوتیں گوبر کی بدبو پھیلی ہوتی اسی گلی میں ایک جگہ سفید چھوٹے میناروں اور دو دو سیاہ گنبد والی چھوٹی سی مسجد قاصداں مکانوں کے درمیان میں جیسے کوزے مہری کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں اپنے چھوٹے بھائی یا کسی دوست کے ساتھ ہمیشہ اسی مسجد میں پڑھنے آتا۔ اس کی وجہ اس کے آتش نوا اور شعلہ بیاں مبلغ دین مولانا ترنم کا خطبہ تھا پھند نے والی رونی ٹوپی بھری بھری گھٹی ڈارمی اور چوڑے شانوں والا گٹھا ہوا جسم۔ درمیانہ قد، پاٹ دار آواز تقریر کرتے ہوئے جوش میں آتے تو گردن کو دائیں بائیں ہلاتے جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر عالی پر مولانا ترنم کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے عموماً سفید قمیض شلوار میں ہوتے۔ چھتے وقت رونی ٹوپی کا پھندا گردش میں ہوتا۔ امرتسر کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ جن محلے میں ان کی تقریر ہوتی وہاں لوگ شہر سے کھینچ کھینچ کر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی تقریر کرتے کرتے اچانک پنجابی میں مکالمے شروع کر دیتے۔ جب لوگ ان کی کسی بات پر محفوظ ہوتے تو مولانا اچانک کوئی جملہ بلند آواز میں ادا کرتے اور ہر طرف سنا جاتا۔

جمعہ کے روز اس مسجد میں شامیانے تن جاتے چھت پر عورتوں کے لئے نماز ادا کرنے کا انتظام ہوتا مسجد میں تن دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ مسجد چھوٹی تھی اور دھنوکرنے کا انتظام محدود تھا۔ میں عموماً گھر سے دھنوکرنے کے جایا کرتا۔ خطبے کے وقت مولانا ترنم سرخ گلاب کے ہاروں سے لدے پسندے، سیاہ جبہ پہنے، رونی ٹوپی کے پورے سفید رومال لپیٹے منبر پر تشریف لاتے تو مجھے یوں لگتا جیسے عباسی دور کا کوئی خلیفہ مسجد میں نکل آیا ہے۔ ان کی گردن سرخ گلابوں میں چھپی ہوتی۔ پھولوں کی کچھ ٹپکڑیاں ان کی ڈارمی میں بھی سجی ہوتیں ان کے آتے ہی مسجد کے صحن میں ہر شخص ہمہ تن گوش ہو جاتا وہ خدا اور اس کے رسول مقبول کی حمد و ثنا کے بعد قرآن حکیم کی کوئی آیت پڑھتے اور پھر خطبے کی تقریر اپنے چھتے سے نکل کر عظیم سمندر کی طرف بڑھتا شروع کر دیتی۔ وہاں کوئی مانگر و فون اور لاؤڈ سپیکر نہ تھا لیکن مولانا ترنم

کی آواز سے گئی محلے کے درو دیوار گونج رہے ہوتے۔

اب نہ وہ مسجد رہی ہوگی اور نہ اس گلی محلے کے درو دیوار مولانا ترنم کی تلاوت کلام پاک سے گونج رہے ہوں گے۔ پاکستان بننے کے بعد میں اس مسجد کو نہ دیکھ سکا۔ ظاہر ہے اب وہاں سب کچھ ہوگا مگر مسجد نہیں ہوگی۔ امرتسر سے ہجرت کرنے سے دو تین روز پہلے سنا تھا کہ مسجد قاصداں کے علاقے میں خوفناک آگ لگی ہوئی ہے۔

بہاولپور روڈ سے ایک سڑک قبرستان سے ہو کر سن آباد کو جاتی ہے۔ اس کے موڑ پر سڑک کے کنارے مولانا ترنم محو خواب ہیں۔ میں وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں بہت یاد کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ مسجد قاصداں میں خطبہ دیتے ہوئے ان کا مسکراتا، نورانی چہرہ یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کبھی یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ زندگی سے بھرپور چہرہ جس مرقہ میں محو خواب ہوگا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا اس کا لوح مزار میں ہر روز آتے جاتے پڑھا کروں گا۔ یہ میرے امرتسر کے انمول میرے تھے جولاہور میں اگر اسودہ خاک ہوئے خدا ان کے درجات بلند فرمائیے۔ آمین!

اب میں آپ کو ایک ایسی مسجد میں لئے چلتا ہوں جو حجم میں شاید امرتسر کی سب سے چھوٹی مسجد تھی یہ کہنی بارغ کی ٹھنڈی کھوٹی کے پہلو میں گویا کسی بڑی مسجد کے چھوٹے ماٹل کی طرح زمین پر رکھی ہوئی تھی۔ ساری کی ساری سبزی مائل پتھر کی تھی اور اسے شیخ صادق حسین نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کا گنبد نہیں تھا۔ چھوٹے سے دو مینار سے تھے۔ پندرہ بیس نازیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ دیواروں میں پتھر کی جالیاں لگی تھیں۔ چیت میں بجلی کے دو سبز گوب لگے جسے رات کو ان کی سبز روشنی جالیوں سے کڑوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر آ کر تھی۔ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا جیسے آسمان سے کوئی نتھاسا سبز ستارہ کہنی بارغ میں اتر آیا ہے۔

ان کی روشنی میں یہ درختوں پھولوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی مسجد خود بھی ایک پھول لگتی۔ سبز پھول جو کسی درخت کی شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہی پتھر ہو گیا ہو۔ بہار کے موسم میں اس کی چھت پر درختوں سے پھول گرا کرتے۔ اس کے عتب میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ گرمیوں کی صبحوں کو میں منہ اندھیرے میں گرنے آتا تو مجھے دور سے اس مسجد سے بلند ہوتی اذان کی آواز

سنائی دیتی۔ مجھے یوں لگتا جیسے کہنی بارغ کے سارے درخت، سارے پھل، سارے پھول اور شاخیں ٹھگوفے ایک ہی آواز کی لہروں میں بدل گئے ہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے! اللہ بہت بڑا ہے۔ مجھے منہ اندھیرے کی پُر نور خاموشی میں اس اذان کی آواز میں درختوں، پھولوں اور ٹھگوفوں کی ٹھک آتی محسوس ہوتی اور شکستہ گلاب کے سرخ پھولوں سے مجھے اذان کی آواز خوشبو بن کر ابھرتی سنائی دیتی ہے۔ میں پردہ کلب کے قریب سے گزر کر حوضی والے درختوں کے جھنڈ میں آتا تو دور اس مسجد کی جالیوں میں سے پھوٹی سبز روشنی دکھائی دیتی۔ معلوم ہوتا آسمان سے فرشتے صبح کی نماز پڑھنے وہاں اترے ہوئے ہیں۔ میں سیر کرتا ہوا مسجد کے کچھوڑے چھوٹی ندی پر آ کر رک جاتا۔ یہاں مجھے ایک خوشبو آتی۔ موتیے کے پھولوں میں لپٹی ہوئی لالچیلوں کی خوشبو۔ یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز خوشبو تھی۔ معلوم ہوتا جیسے وہ چھوٹی سی سبز مسجد مانس لے رہی ہے۔

مذہب یہ اس مسجد کے مانس کی خوشبو تھی۔ میں ندی کے چھوٹے سے پل پر بیٹھ جاتا اور مسجد کے ساتھ مانس لینے لگتا۔ افسوس! میرا مانس چھوٹا تھا اور خوشبو بہت بڑی تھی۔ بہت وسیع تھی۔ سارے کہنی بارغ، ساری دنیا، ساری کائنات پر محیط تھی۔ اس وقت دل سہی چاہتا کاش میری ساری زندگی ایک مانس میں سمٹ آئے۔ جسے میں اس خوشبو کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لوں اور پھر کبھی اسے باہر نہ نکالوں۔ میں پلیا پر بیٹھا ندی میں بہتے پانی کی آواز سنتا سر۔ سرر ایک دھیمی۔ بہت دھیمی سی سرسراہٹ ایک خواب آلود سی سرگوشی۔ جیسے پچھلے پہر میں خاموشی میں ندی کا پانی کچھ کہہ رہا ہو۔ کچھ سنار رہا ہو اس پر جھکے ہوئے ام اور ناشپاتی کے درختوں کی شاخیں اور زیادہ جھک جاتیں۔ گویا جھک کر ہمہ تن گوٹ ہو کر ندی کی سرگوشیاں سن رہی ہوں۔ پانی کچھ بولتا ہو اگر جاتا اس کی لہروں پر تیرتے پھول بھی آگے نکل جاتے اور ان کی خوشبو ان کی دھیمی سرگوشیاں پیچھے رہ جاتیں۔

اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ آج یہ دھیمی خوشبو دار سرگوشیاں بھی آگے نکل گئی ہیں اور میں وقت کے پل پر اکیلا بیٹھا، بہتے دریا کو دیکھ رہا ہوں۔

پاکستان بننے کے بعد میں امرتسر گیا تو کہنی بارغ کی اس خوبصورت چھوٹی سی سبز مسجد چھوٹے سے سبز پھول کو اس حالت میں دیکھا کہ وہاں سوائے دو چار ٹوٹے پھولوں کے اور کچھ

نہیں تھانہ سبز جالیاں نہ سبز روشنیوں کے گوب اور نہ صبح کی شبیہی فضاؤں میں ابھرتی اذان کی آواز اور نہ اس مسجد کے سانس کی مقدس خوشبو۔ سبز پھول، پھری سانس لے کر مرجھا گیا تھا۔ اور ہوا اسے اڑا کر لے گئی تھی۔

لیکن امرتسر کی میری مسجدیں ان کی اذانیں ان کے سارے پھول ان پھولوں سے اٹھتی خوشبوئیں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ میں پانچوں وقت ان مسجدوں سے بلند ہوتی اذانوں کی آواز سنتا ہوں۔ مجھے ہر سانس کے ساتھ ان اذانوں کی جھک آتی ہے اور میں گلاب کے ہر پھول میں محرابوں سے پھوٹتی روشنیوں کی کرنیں دیکھتا ہوں۔ اندلس نہ رہا، قریطہ نہ رہا۔ لیکن مسجد قریطہ کی اذانیں تو ہمارے ساتھ ہیں ہمارے لئے تو ساری دنیا ایک مسجد ہے۔ سارا وطن پاک، ایک مسجد ہے اور اس مسجد کا صحن کس قدر کشادہ ہے۔ کتنے حسین ہیں وہ بارغ جو اس مسجد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں، کس قدر خوب صورت ہیں یہ ٹھنڈی چھاؤں والے درخت جن کی شاخوں کے پھول فالوس بن کر اس مسجد کی دیواروں پر جمبول رہے ہیں اور کتنی سحر خیز ہیں یہ اذانیں جو اس مسجد کے میناروں سے صبح و شام بلند ہوتی ہیں۔

وطن پاک خدا کا گھر ہے۔ خدا مجھے دنیا کی جنت سے نکال دے لیکن اپنے گھر سے کبھی نہ نکالے۔

امرتسر کا رمضان المبارک

(میری والدہ محترمہ) کے چلنے اور برتن اٹھانے رکھنے کی آواز آرہی ہے۔ سامنے والی مسجد میں باجی ٹوٹلی کھول کر وضو کر رہا ہے اور زور زور سے کھانس کر گلا صاف کر رہا ہے۔ کہیں کہیں مسلمانوں کے مکانوں سے پانی پینے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔

آپو جی نے باورچی خانے سے میری بڑی بہن سرور کو آواز دی ہے۔

”آج اٹھنا نہیں بانو!“

میری بڑی بہن کھمڑ پڑھتے ہوئے اٹھی ہے اور سر پر دوپٹے لے کر باہر نکل گئی ہے۔ کیوار گھٹنے سے بروت کی مانند ٹھنڈی ہوا میری ناک کو لگی ہے۔ میں آنکھوں پر سے لحاف ڈرا سا اٹھائے طاق پر چلتے ہوئے کڑوے تیل کے دیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ دیشے کی نو سرد ہوا میں ذرا سی کپکپا کر پھر سیدھی الف ہو گئی ہے۔ مجھے اس نویں روشنی و نور کی ننھی منی پر یاں ناچتی نظر آرہی ہیں۔

”وے حمید! وے اٹھ وے دہی لیا“

اب آپو جی نے مجھے آواز دی ہے۔ میری ڈیوٹی یہ ہے کہ میں دکان پر سے جا کر دہی لاؤں۔ دوڑ گونگے بگل والے کے بگل کی بے سُر آواز گونجی ہے۔ ساتھ ہی اُس نے اپنی گونگی زبان میں زور سے آواز لگائی ہے۔ گلی کے کونے میں غلام رسول علوانی کی دکان کے پاس حافظ جی نے اپنی نوبت بکائی ہے۔ اُن کے نوبت بجائے کا انداز یہ ہے کہ پہلے دو ہاتھ کھلے سما کر ایک ٹکے کے لیے رکتے ہیں اور پھر ایک منٹ تک دھڑا دھڑا بجاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نوبت ان کے گھے میں لٹکی ہوئی ہے۔ گھنی سیاہ ڈاڑھی، گنٹھا ہوا بدن بچاس برس کی عمر میں جوان لگتے ہیں۔ بینائی سے محروم ہیں لیکن رزقِ حلال کی دولت سے مالا مال ہیں سارا دن غلام محمد ہٹوانیہ کی دکان پر اٹھتے ہیں

کی بوریاں ڈھوتے ہیں۔ انہیں گلی مٹنے کے ایک ایک گھر کا پتہ ہے۔ کشمیری ہیں۔ دو ڈھائی من کی بوری کمر پر لا کر قرآن شریف کی آیات کا ورد کرتے گلی میں چل پڑتے ہیں اور سیدھے اسی گھر کا جا کر ورنہ کھٹکھٹاتے ہیں جہاں انہیں جانا ہوتا ہے۔ لاشی اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پسینے میں شرابور حافظ جی بوری کے ساتھ ٹیک لگا کر ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے اور لاشی دروازے پر مار کر آواز لگاتے۔

”خلیفہ جی آٹے کا بوری آیا“

رمضان شریف میں وہ گلی میں نوبت نکال کر مٹنے کے روزہ داروں کو سحری کے وقت جگایا کرتے انہیں سب معلوم تھا کہ کس مکان میں کون رہتا ہے، چنانچہ ہر گھر کے آگے جا کر نوبت بجاتے اور پھر لاشی مکان کے بند کیواڑوں پر مار کر اُس مکان میں رہنے والے کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ ہمارے دروازے پر نوبت بجا کر وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

”خلیفہ عبدالعزیز! اٹھو میاں اٹھو!“

ہماری گلی میں شیخ ستار کے مکان کے بالکل سامنے دو بھائی حلال دین اور کمال دین رہا کرتے تھے۔ انہیں فوت ہونے مدت ہو چکی تھی، لیکن حافظ جی سحری کے وقت اُن کے مکان پر جا کر ہمیشہ یہی آواز لگاتے۔

”حلال دین کمال دین مرحوم! اٹھو میاں اٹھو!“

حافظ جی کی نوبت اب ہمارے مکان تک پہنچ گئی ہے۔ آپو جی نے مجھے پھر آواز دی ہے میرا بڑا بھائی لحاف کے اندر ہی اندر مجھے ٹھوکے دے رہا ہے۔

”چل بمبئی اٹھ“

مجھے نیند بھی آرہی ہے، مگر سحری کے وقت گلی میں نکلنے کا شوق بھی ہے۔ اُن لوگوں کو دیکھنے کا شوق جو ڈھول تاشے بجاتے روزہ داروں کو جگاتے ہیں۔ بگٹی گلی کی طرف سے نعتیں گانے والوں کی ٹولی کی آواز آتی ہے۔

جلوہ گر جلوہ گر جلوہ گر ہو گیا

شاہ جن و بشر جلوہ گر ہو گیا

سامنے والی مسجد عیدالون کے باگھی نے سحری کے شروع ہونے کی نوبت بجا دی ہے۔ دھما

دھما دم دھما دم۔ اب میں لحاف سے آنکھیں مٹے ہوئے اٹھا ہوں اور باہر صحن میں آگیا ہوں۔ برف آٹن ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے میرے ماتھے کو چوم لیا ہے۔ باورچی خانے کے دروازے پر مندا پڑا ہے میں مندا اٹھا کر اندر جاتا ہوں۔ باورچی خانے کی فقنا گرم ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گرم شال اوڑھادی ہو۔ آپو جی نے دونوں چوہے جلا رکھے ہیں۔ دیواروں پر کٹڑیوں کے شعلوں کی چمک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک چوہے پر رات کا پکا ہوا گرم پالک کا ساگ گرم ہو رہا ہے اور دوسرے چوہے پر سبز چائے دم ہو رہی ہے۔ چائے کی خوشبو اڑ رہی ہے۔ آپو جی کا سرخ و سفید گول کشمیری چہرہ چائے کی خوشبو اور آگ کی روشنی میں دمک رہا ہے۔ میں وہی کا برتن اٹھا کر باہر جانے لگتا ہوں کہ آپو ڈانٹ کر کہتی ہیں۔

”فردے کے جادیں دے“

فرد یعنی گرم کشمیری شال اوڑھ کر جانا۔ میں فردے سے بڑا گھبراہٹا تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کی عمر ہوگی اور فرد بڑی تھی۔ وہ گلی میں مجھے سے سنبھالے نہیں سنبھالتی تھی۔ ویسے بھی اس عمر میں سردی کم ہی لگا کرتی ہے اور پھر ہم غریب محنتی ماں باپ کی اولاد تھے۔ سردیوں میں تنگ پیر ہی گیوں میں بھاگتے پھرتے تھے۔ کبھی زکام تک نہیں ہوا تھا۔ میں ٹھنڈا کٹورہ ہاتھ میں لیے گلی میں آگیا ہوں۔ آسمان پر چکیے ستارے بڑے بڑے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ گلی دور تک سنان ہے۔ مسجد کے کنوئیں میں سے برکت ماشکی بو کے نکال نکال کر مشک بھر رہا ہے۔ کنوئیں کی چرخ کی چیلوں چیلوں کی آواز گلی کی خاموشی فضا میں گونج رہی ہے۔ برکت ماشکی بچپن سے لوگوں کے گھروں میں پانی بھر رہا ہے۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمر ٹھک گئی ہے۔ ہاتھوں اور پنڈلیوں کی سبز رگیں پھول گئی ہیں۔ وہ کنوئیں میں سے پانی نکالتے ہوئے ساتھ ساتھ گا بھی رہا ہے۔

کدی میں دی مدینے جادواں۔

سیدہ کے گھر کی کھر کی بند ہے۔ روشن دان میں سے ہلکی ہلکی روشنی گلی کی کبر آلود فضا میں چھن رہی ہے۔ وہ سحری کے لیے اٹھی ہوگی۔ اُس نے لمبے سنہری بالوں کو پیچھے سے محکم کر سر پر جوڑا سا بایا ہوگا اور پرات میں آٹا گوندہ رہی ہوگی۔ چودھری نور دین کے مکان میں سے پراٹھوں کی خوشبو آرہی ہے۔

نیں لگی کے سرے پر پہنچا تو دھول والا بازار میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بڑے زوردار انداز میں
دھول کو خوب پیٹا۔ پھر آواز لگائی۔
جاگو اللہ کے پیارو! جلال دین آگیا!
سوتوں کو جگا گیا!

میں بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے دکان پر بیٹھے ہوئے میرے والد صاحب
سے پوچھا:

”خلیفہ جی کیہ وجہ لگیا ہے؟“

اور پھر دھول بجاتا تیز تیز قدموں سے اُگے نکل گیا۔ ڈاک خانے کے پاس گونگے کا تیز آواز
تین رنگ گونج اٹھا۔ پھر وہ نازن کی طرح اپنی گونگی آواز میں چیخ اٹھا۔ میں وہی برتن میں ڈلو کر واپس
لگی کی طرف مڑا تھا کہ گونگے کے رنگ کی آواز بہت قریب ہی گونجی۔ اب وہ بھاگتا ہوا ہاتھ میں رنگ
تھامے بازار میں نمودار ہوا۔ لگی کی طرف منہ کر کے اُس نے زور سے رنگ بکایا۔ نازن کی آواز میں،
ایک وحشی چیخ ماری اور اُگے کو نکل گیا۔ میں اپنے مکان کے پاس پہنچا تھا کہ سامنے سے نعت خوانوں
کی ٹولی کے گیس کی روشنیاں لگی میں جھلانیں۔ میں اپنے مکان کے سامنے مسجد کے قطرے پر
کھڑا ہو گیا۔ ٹولی سبز رنگ کے گونا گونا رنگے جھلاتے جھنڈے اٹھائے نعت پڑھتی آرہی تھی۔
وہ مسجد کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ نعت خوانوں نے سروں پر سبز صاف باندھ رکھے تھے۔
ایک آدمی نے گیس اٹھا رکھا تھا۔ گیس کی روشنی میں نعت خوانوں کے چہرے چمک رہے تھے
اور سردی میں گاتے وقت منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں فرد میں لیٹا۔ وہی کا کٹورہ ہاتھ میں
مسجد کے قطرے پر کھڑا گردن ایک طرف ڈھکائے آنکھیں ٹکیرے اُس ٹولی کو نعت پڑھتے دیکھتا
رہا۔ مجھے ان ٹولیوں کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اکثر وہ میرے سوتے ہی لگی میں سے نعتیں پڑھتی نکل
جایا کرتی تھیں۔ لیکن اگر میری آنکھ کھل جاتی تو میں بھاگ کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا یا لگی میں نکل آتا۔
مجھے یوں لگتا جیسے نعت خوانوں کی یہ ٹولیاں خیال کی دنیا سے آتی ہیں اور خوابوں کی سرزمین کو چلی
جاتی ہیں۔

ٹولی نعت کا پورا بند وہاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا اور پھر نعت پڑھتی ہوئی وہاں

سے نکل گئی۔ میں نے آنکھیں سے سیدہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ سیدہ جی ذرا سی اوپر اٹھاٹھائے نعت
خوانوں کو لگی میں سے گزرتے دیکھ رہی تھی۔ گیس کی روشنی میں سیدہ کی ناک کا سرخ نیل چمکا اور
پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

بالٹی مسجد کے رونٹ پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے قطرے پر کھڑے دیکھ کر کہا۔
”اوے! وہی لے کے گھر جا۔“

عمدو کا کانا بنائی کے تنور میں سے نارنجی رنگ کے شعلے نکل کر چھت کو چھو رہے ہیں۔
گرمی سینڈ و دونوں ہاتھوں سے میدے کے پیڑے بنا کر تختے پر ساتھ ساتھ جوڑے جا رہے ہیں۔ عمدو
کا کاکٹورے میں دودھ اور کھجوریں بھگور رہا ہے۔

بودی چوکیدار منہ سر لیٹے گرم فوجی برانڈی میں لیٹا پنچ پر ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا سگریٹ پی رہا
ہے اور اس کا بادامی رنگ کا کتا اُس کے پاؤں میں سگڑا بیٹھا ہے۔ بودی اپنی طرز کا واحد سپرے دار
ہے۔ وہ ساری رات بوٹ پیٹی کے منہ سر لیٹے پنچ پر دراز رہتا ہے۔ ادھر ادھر کہیں کوئی کھٹکا ہو تو
گتا جا کر خیر لاتا ہے۔ بودی اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہٹا۔ ایک دفعہ الیا ہوا کہ غزنی لگی کی جانب کسی شے
کے گرنے کی آواز آئی۔ رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ بودی نے کتے کو اشارہ کیا۔ کتا لپک کر دوڑاؤ
کوئی ایک منٹ بعد کتے کے بھونکنے اور چور کے شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوتوالی کے
پاس جا کر کتے نے چور کو گرایا۔ پھر بودی بڑے آرام سے اٹھا، برانڈی کی پیٹی کسی، ہاتھ میں ڈنڈا
تھاما، سگریٹ سٹگایا اور کوتوالی کے پاس جا کر چور کو اس حالت میں پکڑا کہ وہ نیچے سرک پر گرا ہوا تھا
اور کتا اس کی چھاتی پر چڑھا بھونک رہا تھا۔ بودی ہر فن مولا بھی ہے، محلے میں کسی کا پکھلا، گراموفون
مشین، بجلی کی امتری، تالہ چاہے کچھ خراب ہو بودی اُسے ایک دم سارا کھول کر دوبارہ ٹھیک کر دیتا۔
اب لگی کے ہر گھر کے باورچی خانے میں لیمپ روشن ہیں اور کہیں کہیں پر نالوں سے پانی
گرنے کی آواز آرہی ہے۔ میر صاحب بھی جاگ اُٹھے ہیں اور بڑی اونچی آواز میں کسی اہیت شریف
کا بار بار ورد کر رہے ہیں۔ بوڑھا جھکی ہوئی کمر والا گاما شکی کمر پر پانی سے بھری ہوئی مشک لیے
میرے قریب سے گزر گیا ہے۔ چمڑے کی گیلی مشک میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے
ہیں۔ اتنی سردی میں وہ صبح صبح لوگوں کے ہاں پانی بھرتا ہے خدا جانے اُسے سردی کیوں نہیں لگتی۔

میں دہی لے کر اپنے گھر آگیا ہوں۔ گھر میں سبھی بیدار ہو چکے ہیں۔ ایک اور نعت خوان ٹولی نعت گاتی ہوئی لگی میں سے گزر گئی ہے۔

تینڈی سواری یا نبی عرشی بریں آتے گئی لے دیکھ کے جلوہ طرتے موسیٰ نون ہوش درہی لے میں کھڑکی کی طرف بھاگتا ہوں۔ ٹولی گیس کی روشنی میں مہربز جھنڈے لہراتی لگی کا موڑ گھوم رہی ہے اُن دنوں ہمیں روزہ رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہم بڑے اشتیاق سے سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھاتے لیکن دوپہر کے بعد جب بھوک برداشت سے باہر ہو جاتی تو ہم پانی پی کر روزہ توڑ دیتے، مگر گھر میں کسی کو نہ بتاتے۔ افطاری کے وقت گھر پہنچ جاتے اور پھل وغیرہ رکابی میں رکھ کر یوں نوبت بچنے کا انتظار کرنے لگتے جیسے بڑے روزہ دار ہوں۔ کسی روز، روزہ رکھ بھی لیتے تھے۔ اس روز تو گھر کے علاوہ سامنے والی مسجد میں جا کر بھی افطاری کی مٹھائی اور پھل وغیرہ اڑاتے۔

میرے ہم جو لیوں نے ڈیوڑھی میں اگر مجھے آواز دی ہے۔ میں نے جلدی جلدی سحری کھائی ہے اور آدھے پرائے میں ایک بوٹی رکھ کر اپنے ساتھ لے کر نیچے آگیا ہوں۔ ہم بچے خیر دین گڈی والے کی بند دکان کے پھٹے پر ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں اور باتیں کرنے لگے ہیں۔ اب لگی میں سے نہ تو کوئی نعت خوانوں کی ٹولی آرہی ہے اور نہ موصول تاشے بجا کر جگانے والے آرہے ہیں۔ یہ لوگ بھی اب سحری کھانے میں مصروف ہوں گے۔ اب لگی میں اکا دکا فقیروں کی صدائیں آنے لگی ہیں۔ لگی کی ٹنگڑ پر اکتارے والا سائیں نمودار ہوا ہے۔ لمبی جٹائیں، سرخ آنکھیں، پر سوز آواز اور کندھے پر بیوند لگا کھیل۔ وہ اکتارے پر گاتا ہوا چلا آرہا ہے۔

تیرا ہو جائے گا باغ ویران

تے والی نے ٹر جاناں

مجھے یاد ہے میں اس کی آواز پر بڑا آداس ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا جیسے والی چلا گیا ہے اور باغ ویران ہو گیا ہے۔ درخت سوکھ گئے ہیں۔ ندی نالے خشک ہو گئے ہیں۔ گھاس پر زروند پتے بکھرے پڑے ہیں۔ ابراہیم عطار کے گھر کی جانب اس بوڑھے فقیر کی آواز گونجی ہے جو ہر مکان کے پاس کھڑا ہو کر حضرت بابا فرید گنج شکر کا یہ شعر پڑھتا ہے اور پھر آگے چل دیتا ہے۔

اٹھ جاگ فرید استیاری ڈارھی آیا بور • اٹھا نیڑے گیا، تے بچا رہ گیا دور

اُن دنوں میں اس شعر کے مفہوم سے بے خبر تھا۔ میں بوڑھے فقیر کی زبان سے اسے سنا تو مجھے یوں لگتا جیسے ایک بوڑھا آدمی ہے جس کی ڈاڑھی پر آم کا بور گر رہا ہے۔ مجھے اس بوڑھے کا چہرہ بڑا نوالی لگتا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈے نور کی روشنی سی سما جاتی۔

سحری کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ لگی میں چیل پہل شروع ہو گئی ہے۔ مکانوں کے دروازے، محل سے نکلتے ہیں۔ کوئی دودھ لے کر جا رہا ہے۔ کوئی دہی لے کر جا رہا ہے۔ گرم بچھونوں سے زبردستی اٹھوائی گئیں بچیاں سردی میں ٹھنکرتی، تیند بھری آنکھیں لیے تنور کے پاس رومال بچھائے بیٹھی ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہی ہیں۔ کسی کے مکان کا در کچھ کھلتا ہے اور کسی عورت کی آواز بلند ہوتی ہے۔

”کاکا جی! بڑی دیر ہو گئی۔ اذان ہونے کو ہے۔ لالی کو کچھے دے دیں اب۔“

کاکا عمدہ ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے تنور میں کچھے لگا بھی رہا ہے اور لوہے کی لمبی سلاخوں سے انہیں نکال بھی رہا ہے۔ گرم گرم بادھی اور سرخ رنگ کے خستہ کچھے، گردے تاخانیے تنور سے نکلتے ہی رومالوں اور ٹوکریوں میں سمٹ کر گلی محفلے کے مکانوں کو جا رہے ہیں سینڈ ورنے دہی کا پیالہ اپنے پاس ہی تختے پر رکھا ہے۔ وہ میدے کے پیڑے بھی گھڑ رہا ہے اور ساتھ دسی کچھ بھی کھا رہا ہے۔ یہ اس کی سحری ہے۔ میدے کی بور یوں کے پاس چوکی پر رکھے ہوئے ساداریں سبز چائے جوش کھانے لگی ہے۔ کاکا عمدہ اپنے کاربگر کو آواز دیتا ہے۔

”جیسے اونے۔ چائوں دیکھ۔“

سحری کا وقت ختم ہو گیا۔ لگی والی مسجد کی نوبت دھما دم بکنے لگی۔ ہم بھاگ کر مسجد میں گھس گئے اور بانگی کو نوبت بجاتے دیکھنے لگے۔ دل میں ہمیشہ یہ آرزو رہتی کہ ہمیں بھی نوبت بجانے کا موقع ملے۔ بانگی اونچا لمبا پورا کشمیری ہا تو تھا۔ وہ دھڑا دھڑا نوبت کو کوٹ رہا ہوتا۔ جب وہ خشک جاتا تو ہم باری باری نوبت بجاتے اور بڑے فوش ہوتے۔ بانگی پانی پی کر گلا صاف کرتا اور اذان دینی شروع کر دیتا۔ اُن دنوں مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر نہیں لگے ہوتے تھے، مگر مؤذنوں کی آوازیں بڑی صاف، روشن اور پاٹ دار ہوتی تھیں۔ ہمارے محفلے کی اذان بکرواں بازار میں جاتی اور واپس کی اذان کی آواز ہماری لگی میں آیا کرتی تھیں۔ اذان کی آواز کے ساتھ ہی ہم سارے بچے دھنکریوالی ٹونٹیوں کی طرف لپکتے۔ مؤذن جب اذان کے آخر میں اللہ اکبر کہتا تو ہم ٹونٹیوں سے منہ لگا دیتے

اور پیٹ بھر کر پانی پی لیتے۔ اس خیال سے کہ ہم نے روزہ رکھا ہے اور اب افطار کی تک پانی نہیں پینا یہ دوسری بات ہے کہ ہم اسکول کے نلکے پر چھپ چھپ کر پانی پی لیا کرتے تھے۔

مسجد کے خرابی دروازوں پر بندے گرے ہوتے۔ باہر ٹھنڈے فرش والے صحن میں سخت سردی ہوتی، لیکن مسجد کے اندر کی فضا نیم گرم ہوتی اور نمازی بڑے سکون سے عبادت کرتے۔ یہیں نماز پڑھنی نہیں آتی تھی۔ کچھ نماز پڑھنے کا شوق اور کچھ دسمبر کی ٹھنڈی رات میں مسجد کے اندر کی گرم فضا کا تصور ہمیں کھینچ کر مسجد کے اندر لے جاتا۔ سب سے پہلی قطار میں ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کیے کھڑے ہو جاتے اور کبھی کبھی آنکھ کھول کر دیکھ لیتے کہ نمازی کب رکوع میں جا رہے ہیں اور کب سجدے میں۔ — مجھے یاد ہے ایک بار مسجد میں شاید ستائیسویں کی رات تھی۔ تراویح کے بعد ختم شریف تھا۔ تمام نمازی مسجد کے اندر دھارے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ بیچ میں رکابیوں اور خوانوں میں قسم قسم کی مٹھائیاں، کھجوریں گلاب کے عرق سے بھری ہوئی گلاب دانیاں اور پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ اگر دانوں میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ فضا پھولوں، پھولوں، مٹھائیوں اور گرتیوں کی خوشبوؤں سے بوھل ہو رہی تھی۔ اس پر ملاحظہ کریں کہ باہر ہر دو منٹ کے بعد گلاب دانی اٹھا کر لوگوں پر گلاب کا عرق چھڑک دیتا۔ ہم عرق کے ٹھنڈے پھینٹوں سے بچنے کے لیے بازوؤں میں منہ چھپا لیتے۔ آخر ایک نمازی نے اسے منع کر دیا کہ وہ بار بار عرق نہ چھڑکے۔

ایک مقام ایسا آیا کہ بتیاں گل کر دی گئیں اور اندھیرے میں نمازی بندہ آواز سے بڑے ذوق شوق کے ساتھ ”یا معنی دیا قیوم“ کا ورد کرتے گئے۔ اندھیرے میں خدا جانے مجھے کیا سوچھی کہ میں نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ بیچ میں رکھی ہوئی شکر پاروں کی پلیٹ کی طرف بڑھا کر شروع کر دیا۔ جو نہی میرے ہاتھ نے پلیٹ میں رکھے ہوئے شکر پاروں کو چھوا، میں نے ڈر کر ایک دم ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ مجھ سے پہلے کسی کا ہاتھ شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچ چکا تھا اور ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے نے بھی اپنا ہاتھ ڈر کر کھینچ لیا ہوگا۔ اتنے میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بارش بزرگ کو بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے آج بھی اس بات کا یقین ہے کہ مجھ سے پہلے شکر پاروں کی پلیٹ تک پہنچا ہوا ہاتھ ان بزرگ کا نہیں تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد تراویح کا وقت ہوتا تو محلے بھر میں بڑی رونق ہو جاتی۔ کوئی اس مسجد میں تراویح پڑھنے جا رہا ہے تو کوئی اس مسجد میں۔ ان دنوں میں خوب نمازیں پڑھا کرتا اور تراویح تو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ آخری تراویح کے قریب پہنچ کر ٹھک جاتا، مگر جماعت نہ چھوڑتا تھا۔ خاص طور پر جب نمازی دو تراویح کے درمیانی وقفے میں ”یا ارحم الراحمین“ کا ورد کرتے تو نجم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں آنکھیں بند کر لیتا اور پھر تصور میں خوبصورت باغ گھنے درخت، درختوں پر کھلے ہوئے پھول، سنہری دھوپ میں نیلے آسمان پر اڑتے سفید کبوتر اور آلوچوں کے باغ میں سے ہو کر گزرنے والی شگ رختار نمایاں دیکھتا۔ — آج بھی رمضان المبارک کے مہینے میں میں جب کسی مسجد، یہ آواز سنا ہوں تو بعینہ بچپن کی اسی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں۔

شبینہ یعنی ستائیسویں کی رات کو شہر میں اور خاص طور پر ہمارے محلے میں بڑی رونق ہوتی۔ اس رات میرا خیال ہے شاید ہی کوئی شخص سوتا ہوگا۔ گلی گلی، محلے محلے لوگوں کی چل قدمی رات بھر جاری رہتی مسجدوں میں جہاز فانوس روشن ہوتے۔ میناروں اور گنبدوں پر لال پیل بتیاں روشن ہوتیں۔ مسجدوں کے دروازوں کو کیلے کے پتوں اور گیندے کے کیسری پھولوں سے سجایا جاتا۔ ان دونوں گیندے کے کیسری اور زرد پھولوں میں ایک عجیب قسم کی جھک ہوا کرتی تھی۔ اور یہ پھول امرتسر میں بڑا عام تھا۔ ویسے تو امرتسر کے باغوں اور کھیتوں میں سجاویزی رنگ کا گلاب بھی بڑی کثرت سے پایا جاتا تھا، لیکن گیندے کا دواغ زیادہ تھا۔ بیاد شادیوں پر گیندے کے ہار پہنے جاتے تھے۔ میں سروپوں کی ٹھنڈی صبح کو سیر کے لیے باہر کھیتوں میں جاتا تو چالیس کنوؤں کی جانب ٹوب ویل کے پھوڑے بٹالہ گورو اسپور کو جاتی ہوئی ریلوے لائن کے پاس کھیتوں میں گیندے کے پھول ٹھنڈی رخ شبنم میں بھیگے ہوتے۔ میں ذرا ہاتھ لگاتا اور میرا ہاتھ ٹھنڈی شبنم سے بھر جاتا۔ میں وہ ہاتھ آنکھوں پر لگالیتا۔ آج لاہور کی گرد و سرطکوں پر چلتے چلتے گیندے کے ان پھولوں کی یاد آتی ہے تو اپنا خالی ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیتا ہوں اور میرا ہاتھ آنسو کی گرم شبنم سے بھر جاتا ہے۔ دواغ! گیندے کی جھک! دواغ! گلاب کی جھک! دواغ! سبز چائے اور لونگ کی خوشبو! دواغ! رمضان المبارک کی خوشبو!

شبینے کا ہم بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتے اور ساری رات جگ کر گزارتے۔ ابھی مسجد عیدین میں نہیں تو ابھی مسجد جہان محمد میں — وہاں سے اٹھے ہیں تو مال بازار والی مسجد خیر الدین میں تبرک

کھا رہے ہیں۔ ایک مسجد کے روضہ پر بیٹھ کر نان اور طوطہ کھاتے۔ دوسری مسجد میں جا کر پیالوں میں تیز نمک والی سبز چائے پیتے۔ سبز چائے کے بڑے بڑے پتیلے ہر مسجد کی ڈیوڑھی میں آگ پر چڑھے ہوتے اور دو ایک بوڑھے ان کے پاس بیٹھے آگ تپ رہے ہوتے اور ساتھ ساتھ پتیلے میں پانی کے ڈونگے بھی اُٹھاتے جاتے۔ مسجد کے صحن سردی میں ٹھہر رہے ہوتے۔ مسجد کے خرابی دروازوں پر مندے گرے ہوتے اور اندر سے حافظ کے تیز ترانہ شریف پڑھنے کی آواز آرہی ہوتی۔ سردیوں کی رات کے کھڑے ہوئے آسمان پر ستارے بڑی آب و تاب سے جھللا رہے ہوتے۔ لوگ ٹٹھیوں کے ٹھنڈے پانی سے دھو کر تے اور جلدی جلدی بچ بستہ صحن عبور کر کے مندا اٹھا مسجد کے اندر چلے جاتے۔

افطاری کے وقت یوں تو محلے کی دوسری دکانیں بھی خوب اہتمام سے سجائی جاتیں، مگر کاکا عمو کی دکان کی سچ و سچ نرالی ہوتی تھی۔ پہلے روزے ہی کو وہ دکان کے آگے فرش سے لے کر دکان کی پیشانی تک لکڑی کے لمبے لمبے تختے جوڑ کر سیڑھیاں سی بنا دیتا۔ ان سیڑھیوں پر سفید چادریں ڈال دی جاتیں اور ان پر ورق لگی باقرعائیاں، بڑے بڑے ارا روٹ، شیر مال، کھنڈ کھوں کے تھال نمکین کھوں کی سینیاں، خشک شش لگے گردے تانٹانے اور کچے اس طرح سجادیے جاتے کہ کہیں کوئی جگہ نہ بچتی۔ کاکا عمو بوسکی کی قمیض، ریشمی تہجد اور کالا پپ شوپنے خوشی سے جھوم جھوم کر دکان کے اندر باہر پھر رہا ہوتا۔ وہ اپنا سماوار تخت پر لا رکھتا۔ افطاری کی ذیت بچتی تو وہ سبز چائے کا خوشبودار گھونٹ پی کر روزہ افطار کرتا۔ اس کا کارگر سینڈ وکابوں کو سودا دیتے میں مصروف ہوتا اور ساتھ ساتھ چائے بھی پیتا اور کاکا عمو کی آنکھ بچا کر ایک آدھ کھنڈ کچھ اٹھا کر اپنی پیالی میں بھی گرا لیتا۔ عاتقی حلوائی کی دکان پر بھی بجلی کے قمقمے روشن ہوتے اور تختوں پر انواع و اقسام کی ورق لگی مٹھائیاں سجلی کی روشنی میں چمک رہی ہوتیں۔ اس کا لکڑیگر بھی مٹھائی کے سرخ گلاب جانے میں بڑا ماہر تھا۔ یہ گلاب بالکل سرخ گلاب کے پتوں کی طرح مٹھائی کے ہر تھال میں ہاروں کی طرح سجے ہوتے۔ دور سے وہ اصلی گلاب کے ہار معلوم ہوئے۔ مٹھائی کے یہ سرخ گلاب بڑے پیارے لگتے۔ میں حیران ہوتا کہ لوگ اسے کس طرح کھا جاتے ہیں۔ گھر میں مٹھائی کی ٹوکی آتی تو میں گلاب کا پھول اٹھا کر اپنی الماری میں چھپا لیتا۔ دوسرے روز اس پر حیرتیاں چڑھی ہوتیں۔ میں پھونکیں مار مار کر جوتھیوں کو جھاڑتا، مگر وہ دو ایک روز میں مٹھائی کا آدھا گلاب کھا جاتیں۔ اب مٹھائی کے وہ گلاب نہیں بنتے

اب گلاب دیے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سرخ گلاب سے اب بیاہ شادی یا جنازے ہی پر ملاقات ہوتی ہے بیاہ شادی پر وہ موٹر کے پتے بونٹ پر ٹل رہا ہوتا ہے اور جنازے پر لوگوں کے پاؤں تلے کچلا ہوا رہتا ہے۔

امر تر کے رمضان المبارک کی سحری میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ سحری کا انتظار میں اس شوق سے کرتا گویا صبح عید ہے۔ تراویح کے بعد گھر کے سب لوگ سو جاتے، مگر میں جاگ رہا ہوتا۔ کان سحری کے وقت جگانے والی نعت خوانوں کی آوازوں یا ڈھول تاشوں کی دُور سے آتی صداؤں پر لگے ہوتے اسی انتظار میں میری ہلکی بوجھل ہو جاتی اور میں سو جاتا۔ آدھی رات کو کسی وقت آنکھ کھل جاتی تو چپکے سے کھات سے نکل سخت سردی میں باہر صحن میں آجاتا۔ آسمان پر ستارے موتیوں کی طرح چمک رہے ہوتے۔ میں نے چند ستاروں کا حساب لگا رکھا تھا کہ جب یہ آسمان کے ایک خاص حصے میں آجائیں تو سحری کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں بظنوں میں ہاتھ دیتے، سردی میں ٹھہرتا۔ آدھی رات کو مکان کے ٹھنڈے صحن میں اکیلا کھڑا آسمان کی طرف مندا اٹھائے اپنے مطلب کے ستارے تلاش کرنے لگتا، مگر وہ ستاروں کے عظیم جھرمٹ میں گم ہو گئے ہوتے اور مجھے کہیں نظر نہ آتے۔ پھر میں کھڑکی میں سے نیچے لگی میں جھانکتا۔ لگی کھینچی کے لمبوں کی دھیمی روشنی میں سنان ہوتی۔ پھر میں سانس روک کر بہہ تن گوش ہو کر دُور سے آنے والی کسی ڈھول کی آواز سننے کی کوشش کرتا۔ پھر بجلا رات کے ایک بجے کون جگانے آتا ہے! اب مجھے سردی لگنے لگتی اور میں نا اُمید ہو کر واپس اپنے کھات میں گھس جاتا اور گرم گرم کھات بہت جلد مجھے ایک بار پھر نیند کی دنیا میں لے جاتا۔ اور جب ڈھول تاشوں اور ٹولیوں کے نعتیں پڑھنے کی آواز پر آنکھ کھلتی تو یوں خوش ہوتا گویا کھویا ہوا خرد دل گیا ہو۔

رمضان شریف کی آخری سحری بڑی دل گداز اور آداس ہوتی۔ تراویح پڑھنے کے بعد روزہ دار ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے۔ حافظ اور سامع کو نذرانہ دیا جاتا۔ سر پر ٹپکا باندھا جاتا سحری کے وقت بہت کم ڈھول بجانے والے آتے۔ جن جن رمضان شریف کی آخری تاریکی قریب آتی جاتیں، ایک ایک کر کے سب بچھڑتے جاتے۔ صرف گونگا بگل والا، حافظ نوبت والا اور نعت خوان ٹولیاں باقی رہ جاتیں۔ نعت خوان ٹولیاں رمضان المبارک کی رخصتی کے گیت گاتے ہوئے آتیں۔

بہن ہون جہانیاں لگیاں نے

پچھلے پہر لگی کی ٹھٹھرتی ہوئی سنسان فضا انگلیں لہاؤں سا اور صلیتی۔ میں لگی میں اگر ایک ایک
نعت خوان کی صورت کو تکتا رہ جاتا۔ اب یہ شکلیں ایک برس تک دیکھنے کو نہ ملیں گی۔ کون کچھ رات
کو ستاروں کی چھاؤں میں اٹھتا ہے اور لگی لگی نعتیں پڑھتے ہوئے روزہ داروں کو جگاتا پھرتا ہے بھلا!
میں ان کے غم زدہ الوداعی گیت سن کر اداس ہو جاتا۔ بعض نعت خوانوں کی آنکھیں ابیدہ ہو جاتیں
جیسے یوں گنا جیسے لگی میں سے کوئی دلہن ڈول میں بیٹھ کر رخصت ہو رہی ہے باہل کے پیارے گھر
کو چھوڑ کر سسرال جا رہی ہے۔ مجھے سحری ایک دلہن کے روپ میں دکھائی دیتی۔ سرگیں آنکھوں او
تاروں جڑے آنچل والی دلہن! پچھلے پہر کی دلہن! آنکھوں میں آنسوئیں۔ باہل کی دلہن سے قدم نہیں اٹھ
رہے، مگر جانا ہی ضرور ہے۔ جدائی! جدائی! مقدور ہو چکی ہے۔ بوجھل دل لے کر ڈولی میں بیٹھ چکی
ہے۔ سسکیاں ہیں۔ سکھیں کی آہیں ہیں۔ محبت کرنے والوں کی نگاہیں دور تک تعاقب کر رہی
ہیں۔ ڈولی لگی میں سے ہونے ہوئے رخصت ہو رہی ہے۔ الوداع! الوداع! اسے عروس رمضان! الوداع!
تو نے گہر دم اٹھ کر ہمارے منہ شبنم سے دھلائے۔ یہاں ستاروں کی چھاؤں میں گیندے اور گلاب کے
باغوں کی سیر کرائی۔ ہم نے تیرے دامن کو تمام کر صبح کی شبنمی ہواؤں میں پرواز کی۔ ہم تیرا خیال دل میں
لے کر سوئے اور تیری یاد کو گے لگا کر چھ سے رخصت ہوئے۔ الوداع! الوداع! گلاب کے پھول! تھوڑے
کی خوشبو! دار چینی اور لونگ کی خوشبو! سبز چائے اور گیندے کی خوشبو!

میں نے گیندے کو ہاتھ لگایا تھا تو میرا ہاتھ پاکیزہ شبنم کے موتیوں سے چمک اٹھا تھا اور آج
میں جس پھول کو ہاتھ لگاتا ہوں مجھے کسی مردہ جسم کو چھونے کا احساس ہوتا ہے۔ آہ! خوشبو، میرے بازوؤں
میں پھول کی لاش چھوڑ کر اڑ گئی!

امرتسر کی عید

امرتسر کی عید کا خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایک بھولی بھالی معصوم بچی کی تصویر آ جاتی ہے۔
اس کے ریشمی کپڑوں پر گونا گونا گے سر پر جھلک کرتی چٹنی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہے۔ پیروں میں
لال گرگاہی ہے۔ لال پٹی چڑیاں کھٹک رہی ہیں۔ ایک ہاتھ میں غبارہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں ورق لگی
سوئیوں سے بھری ہوئی مٹھالی ہے جس پر کروشیے سے کاٹھا ہوا سفید رو مال پڑا ہے اور وہ لگی میں سے
گزر رہی ہے۔ لگی عید کی خوشیوں بھری صبح کے ساتھ بیدار ہو گئی ہے۔ غباروں کے ساتھ گلے باجوں کی
آوازیں آرہی ہیں۔ گھروں میں مائیں بچوں کو نہلا دھلا کر نئے نئے کپڑے پہنا رہی ہیں۔ گرم گرم سوئیوں سے
بھرے ہوئے مٹھتوں پر چاندی کے ورق لگا رہی ہیں۔ ہر گھر سے اصلی گھی ملی سوئیوں کی مہک کے
ساتھ جتا کے خطر، افغان سنو اور پاؤ ڈر کی خوشبوئیں آرہی ہیں۔ بچے لال گلابی داسکٹیں، ٹیلی پٹی ٹوپیاں اور
نئے جوتے پہن گھروں سے نکل کر اپنے بہن بھائیوں اور ہم جویوں کے ساتھ لگی میں عنایتی مٹھالی
والے، گاما گلیٹینوں والے، جان کھلوتوں والے اور عید دوہی بچے والے کی دکانوں کے باہر موڑھوں پر
بیٹھ کر کھاپی رہے ہیں اور بے دھڑک عیدی کے پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ سوئیوں کی مٹھالیاں
بچی سہائی بچیوں کے ہاتھوں ایک گھر سے دوسرے گھر کو جا رہی ہیں۔ لگی والی مسجد میں جتنے کے
ہر گھر سے سوئیاں پہنچ رہی ہیں۔ بانگی بھری ہوئی مٹھالی جڑے میں لے جاتا ہے اور خالی مٹھالی لے
کر باہر آ جاتا ہے۔ سوئیوں کے گھی سے اس کے ہونٹ چمک رہے ہیں۔ آج اس کی شہر مٹھلی
بھی دھلی دھلائی ہے اور ڈاڑھی میں تیل لگا ہے۔

سحری کے وقت ڈھول تاشے بجا کر جگانے والے لگی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ ہر مکان کے آگے
حاکم ڈھول بجاتے ہیں اور وہی آواز لگاتے ہیں جو رمضان المبارک میں سحری کے وقت لگایا کرتے

تھے۔ ایک بڑے سے جھولے میں وہ سوتیاں، پلاؤ، چاول، آٹا، گڑ کی ریوڑی جو کچھ ملتا ہے ڈالتے جاتے ہیں اور پھر اگلے مکان پر جا کر آواز لگاتے ہیں۔

خیر دین آگیا، سوتوں کو جگا گیا۔

ہم انہیں بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔ اچھا تو یہ وہ پراسرار ڈھول والے تھے جو روزوں میں پچھلے پیر کے اندھیروں میں ڈھول بجاتے گلی میں سے گزر جایا کرتے تھے۔ ایک طرف سے گونگا بگل والا نمودار ہوتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بگل بجا کر ٹانڈن کی طرح چیخ مار کر گلی میں سے گزر جاتا ہے۔

بازار میں سے سینما والوں کا جلوس گزر رہا ہے۔ دو آدمی دھڑا دھڑا ڈھول بجا رہے ہیں۔ ان کے چہرے سردیوں میں بھی پسینے سے تر ہیں۔ پرل ٹاکیو والا مشہور سکھ ترمی اچکن، چوڑی دار پا جامہ اور سیاہ جوتے پہنے ساتھ ساتھ ٹکی بجا رہا ہے۔ ٹکی بجاتے ہوئے ڈھول کی لے پر اس کا سر بھی ہل رہا ہے۔ پرل ٹاکیو میں بھی عید کی خوشی میں نئی فلم لگی ہے۔ گلی کے بچے جلوس کے ساتھ ساتھ ہولیتے ہیں اور جلوس کو اگلے محلے تک چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں، محلے کی دکانیں دھنوں کی طرح سب ہل رہی ہیں۔ کاکا عمو کی دکان کی تو آج سچ مچ ہی نرالی ہے۔ تخت پوش سے لے کر چھت تک ورق لگے اراروٹ، باقر خانیوں، کھنڈ قلیوں اور شیر مالوں کے تعال سبے ہوئے ہیں۔ عنایتی حلوائی نے قسم قسم کی مٹھائیاں بنا رکھی ہیں۔ لوگ کپاس کے سرکٹوں سے بنی ٹوکریوں میں سیر سیر دو دو سیر مٹھائی لیے اپنے رشتے داروں کے گھروں کو عید کی مبارک دینے جا رہے ہیں عنایتی نے آج کھلے نہیں بنائے۔ قتلے ٹرڈ کے دن بناتے جاتے ہیں۔ کوئی دکاندار ایسا نہیں جس نے تخت بچا کر دکان آدمی سر تک نہ بڑھالی ہو۔ کیسر سنگھ اور میر حسن منہاری والے کی دکان پر بڑی گاڑی ہے۔ بچیاں ابھی تک کپ، کانٹے، کبوترے، گونا اور رنگ برنگے ربن خرید رہی ہیں۔ نوجوان اپنی پسند کی جڑا بنیں دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی جھک کر اپنے بچے کی نیکر میں نئی پٹی ڈال رہا ہے۔ دوسرا اپنے ننھے بچے کو دکان کے تھڑے پر کھڑا کیے اس کے نئے بوٹ کے تسمے کس رہا ہے۔ دوست محمد تصانی کی دکان پر بھیڑ لگی ہے۔ وہ خود گوشت کاٹ رہا ہے۔ دوست محمد کا نورانی سفید ڈاڑھی والا سرخ و سپید چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں چھری اٹکا کر وہ بڑے انہماک سے گوشت بنا رہا ہوتا تو

اس کے ہونٹ بائیں طرف کو اپنے آپ لٹک جاتے اور زبان کا پتلا سیرابہر جھلکنے لگتا اس کا بڑا بیٹا حسین مشین چلا کر قہر تیار کر رہا ہے اور چھوٹا بیٹا نذیر عورت جیرا سری پائے بنا رہا ہے۔ جیرا میرا دوست تھا۔ منہ اندھیرے وہ اپنی دکان کھولتا تو ہم رات کا بچا ہوا گوشت اور چربی آگ جلا کر پکاتے اور مزے لے لے کر کھا جاتے۔ ایک بار وہ محلے بھرے والے کھوہ میں سری پائے جھنوائے گیا تو میں بھی اس کے ساتھ گیا۔ تنور میں سے آگ کے سرخ و زرد شعلے باہر نکل رہے تھے۔ ایک کالا بھونگ آدمی سامنے بوریے پر بیٹھا تھا۔ وہ بکسے کی سری کو سلاخ میں گاڑ کر تنور میں لے جاتا۔ گوشت اور بالوں کے جلنے کی بو کے پھلکے اٹھتے۔ وہ جلدی سے بھٹی ہوئی سیاہ کالی سری کو تنور سے باہر نکال کر دوسری طرف پھینک دیتا۔ میں آؤ جیرا اپنے سری پائے ٹوکری میں ڈال کر ایک طرف نکلے کے پاس بیٹھ گئے اور جھانوس سے انہیں کل کل کر دھونے لگے۔ میں جیرے کو منع کیا کرتا۔

یار ان کی آنکھوں پر جھانواں مت پھرو۔

اور جیرا ہنس کر کہتا۔

”اوتے، یہ تو میری ہوئی سریاں ہیں۔“

جیرا اور میں بڑے دوست تھے۔ ہم ایک ساتھ مل کر ہندو سکتوں کے محلے کے بجلی کے بیب توڑتے۔ اپنے محلے کی مرغیاں اٹھا کر قبرستان میں لے جاتے۔ وہیں ذبح کر کے انہیں خشک جھاڑیاں جلا کر پکاتے اور کھا جاتے تھے۔ سنا ہے جیرا آج کل کراچی کی لی مارکیٹ میں دکان کرتا ہے اور مجھے بہت یاد کرتا ہے۔

ابراہیم عطار اور بندر سنگھ پنہاری کی دکانوں سے لوگ چاندی کے مدق، چینی، شہر، چھوہارے، مہرے گری اور بادام خرید رہے ہیں۔ بھاری بھر کم بدن، ناٹاقد، سرخ رنگ اور عینک کے شیٹوں کے پیچھے جھلاتی آنکھیں۔ یہ ہے ابراہیم عطار۔ دکاندار کی سے زیادہ طب کی پڑائی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین۔ ایک روز صبح صبح آگر دکان کھولی۔ خربت کی بوتلوں پر پانی چھڑک کر تانبے کی ٹوپیاں آن پر ڈالیں۔ پوری جھاڑی پر بیٹھ گیا اور عینک صاف کر کے طب کی پڑائی کتاب کے مطالعے میں ڈوب گیا۔ اتنے میں ایک بچہ گلاس اتھ می لیے آیا اور بولا:

”حکیم جی! اتنی کہتی ہے ایک آنے کا بیزوری شربت دے دیں۔“

ابراہیم عطار نے بڑے غصے سے بچے کو دیکھا۔ کتاب بند کر کے گدی پر رکھی اور یہ کہہ کر شربت کی بوتل اٹھائی۔

عجیب مصیبت ہے۔ اور دکان کھولو، ادھر گاہک آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

گلی میں طرح طرح کے فقیروں کی صدائیں گونج رہی ہیں بٹے کئے گرز مارا ہتھوں میں کاٹے دار لوہے کے گرز اور شانے لیے ہر مکان کے آگے آواز دے کر خیرات مانگ رہے ہیں۔ کوئی خیرات دینے سے انکار کرے تو گرز اپنے سر پر مار کر لوہان ہو جاتے ہیں۔ ایک فقیر ہمیشہ ہماری گلی میں آیا کرتا۔ اُس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہوتی۔ اونچا لمبا اور حیرت انگیز فقیر دھسے دھلائے کپڑوں میں ملبوس ہوتا سر پر سرمئی رنگ کی سمور کی ٹوپی ہوتی۔ وہ پان کھا رہا ہوتا اور بڑی بڑی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بالوں کے تار چمک رہے ہوتے۔ وہ میٹر صانع کا رہنے والا تھا۔ اُس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ اس کا بچہ یہ مصرع یاد رہ گیا ہے۔

• بلا لے گیسوؤں والے •

اُسے دیکھ کر بچے ہمیشہ میکہ گور کی کے قازق کردار یاد آ جاتے تھے۔ اب گلی میں کمیاں یعنی کنول کے پھول بیچنے والی لڑکیاں نمودار ہو گئی ہیں۔ ان لڑکیوں نے سیاہ لمبی قمیضیں اور سیاہ تہمند باندھ رکھے ہیں۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں۔ کندھوں پر کنول کے لیے لیے ڈنٹھلوں والے پھول ڈالے ہیں اور گلی میں آوازیں لگاتی پھرتی ہیں۔

• کمیاں لے لو کمیاں •

عورتیں کنول کے پھول خرید کر ان کے گھنے بنایا کرتیں۔ عید کے روز یہ جس گھر میں پھول بیچنے جاتیں، وہاں سے ستیاں ضرور اپنے حملے میں بھر کر لاتیں۔

بھنگیوں سروں پر مثال اٹھائے ہر گھر میں جا رہی ہیں اور عید کی ستیاں اور عید کی وصول کر رہی ہیں۔ امرتسر میں عید کی تیاریاں ایک رات پہلے ہی شروع ہو جاتی تھیں۔ اُس رات کو حرفے کی رات کہا جاتا۔ حرفے کی رات میں خوشی سے نیند نہیں آتی تھی۔ تقریباً ساری رات جاگتے رہتے۔ حرفے کی رات کی خوشی بھی عید سے زیادہ ہوتی۔ یہ عید کی آمد کا اعلان تھا جس طرح دہلی کی زندگی میں شادی سے ایک روز پہلے کی رات، سہاگ رات سے زیادہ پُراسرار اور آنگوں بھری ہوتی ہے اس

رات کو حسین خوابوں کا محل تیار کیا جاتا ہے۔ سہاگ رات کو تو خواب ٹوٹ جاتے ہیں اور تعمیر کا سفر شروع ہوتا ہے یا زندگی کے دریا کے سرسبز کناروں پر خوشیوں بھری پک پک کا آواز اور یا عبور۔ عبور دریا نئے شور۔

حرفے کی رات کو ہمارے محلے میں منہاری، پنساری، سبزی والے، گوشت والے اور درزی کی دکانیں نصف شب کے بعد تک کھلی رہتیں۔ امرتسر کے کشمیری گھرانوں میں خاص طور پر یہ دستور تھا کہ حرفے کی رات کو شب دیگ اور ساگ مچھلی ضرور پکتی۔ شب دیگ کے لیے لال لال شلجم دوپہر ہی کو گھر میں آ جاتے۔ گوشت خاص طور پر گھر کا کوئی بڑا بوڑھا کھاتا۔ عشاء کی نماز کے بعد شب دیگ کو لکڑیاں جلا کر چولہے پر چڑھا دیا جاتا۔ دوسرے چولہوں پر ساگ مچھلی اور سفید چاول یعنی بھتہ پکنا شروع ہو جاتا اور گھر میں گرم سالوں کی تیز خوشبوئیں پھیل جاتیں۔ رات جگے کے لیے قبوہ تیار ہو جاتا اور ان سالوں میں درحلیوں اور بادیاں خطائی کی خوشبوئیں بھی شامل ہو جاتیں۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی، جھٹ بازار سے منگوا لی جاتی۔ مجھے یاد ہے میں دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ آدمی آدمی رات باورچی خانے میں بیٹھا رہتا اور آپو جی اور بڑی بہنوں کو مختلف ٹانڈیوں اور تیلیوں میں کفگیر چلاتے دیکھتا رہتا۔ دل میں اس خیال سے پھول کھل رہے ہوتے کہ بس ابھی کوئی دم میں عید کی صبح طلوع ہو جائے گی اور ہم نئے نئے کپڑے پہن کر گلی میں دوستوں کے ساتھ نکل جائیں گے۔ غبارے خریدیں گے۔ دہتی بھٹے کھائیں گے۔ ستیاں اڑائیں گے۔ خواہ مخواہ رشتے داروں کے ہاں جا دھکیں گے اور عیدیاں وصول کرتے پھریں گے۔ ویسے اُن دنوں رشتے دار بھی آپس میں بڑا پیار کیا کرتے تھے۔ اب تو سوئے اپنے بچوں کے دوسروں کے بچوں سے کوئی پیار ہی نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دور ہی محبت کا تھا، برکت کا تھا۔ اب ہر شے سے محبت اڑ گئی ہے۔ برکت جاتی رہی ہے ہم خوب بنے ٹھنڈے خالوں، پھوپھیوں کے ہاں جلتے۔ ہماری بڑی آؤ بھگت ہوتی۔ منہ سر چڑے جاتے نہ بڑتی ستیاں کھلائی جاتیں اور پھر عید کی دکانیں ہوتی۔ اُس روز ہم بڑے شاہ خرچ ہوتے۔ ہر دکان پر جا کر کچھ نہ کچھ ضرور کھاتے۔ اب تو عید کے دن میں وہ رونق نہیں رہی۔ حرفے کی رات تو بالکل ہی فتم ہو گئی۔

اُس رات ہر دکان پر گیس یا بڑے بڑے بلب جل رہے ہوتے لوگ خرید و فروخت کر رہے

ہوتے۔ گھروں میں مشینوں سے سویاں نکل رہی ہوتیں۔ سردی کے باعث درزیوں کی دکانوں کے کپڑے نیم داہوتے۔ اندر روشنی میں ماسٹر صاحب اپنے کاریگروں کے ساتھ بیٹھے عید کے کپڑے تیار کر رہے ہونے۔ ہماری گلی کے ماسٹر شفیق بڑے وضع دار ٹیلر ماسٹر تھے۔ کیا مجال جو کبھی دھڑے پر کسی کو قمیص یا شلوار دے دیں۔ ایک بار میں اُن کی دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور بولے "لایئے ماسٹر صاحب قمیص"

ماسٹر صاحب نے بڑے اطمینان سے حقے کا کش لگایا اور کہنے لگے "بس ذرا بٹن لگنے والے رہ گئے ہیں۔ آپ ایسا کریں گول ہٹی سے جا کر بٹن لے آئیں"

وہ صاحب بولے۔

"مگر ماسٹر صاحب میں تو ملیے پر جا رہا ہوں۔ آپ نے تو صبح کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے خواجہ صیب! آپ بٹن لائیں اور قمیص لے جائیں"

وہ صاحب سر جھکا کر بٹن لینے چل دیئے۔ اُن کے جاتے ہی ماسٹر صاحب نے حقے کی نئے پرے کی اور کاریگر کو پیچ کر کہا۔

"اے لیا اوسے خواجہ کی قمیص"

معلوم ہوا کہ قمیص صرف کٹی ہوئی ہے، سلائی ابھی نہیں ہوئی۔ لیکن آفرین ہے ماسٹر شفیق پر کہ جب تک خواجہ صاحب گول ہٹی سے بٹن لے کر آئے، قمیص سل کر تیار ہو چکی تھی۔

عنائی حلوئی عید پر منگوائی بنانے کے لیے دکان کے آگے سڑک کے کنارے نئی بھٹی بناتا۔

حرفے کی ساری رات بھٹی کو لینے پوتے اور دکان کے اوپر شامیانے تاننے میں گزار جاتی۔ شامیانہ

ہمارے محلے میں قریباً ہر تیسرا دکاندار ضرور اپنی دکان کے اوپر تان دیتا۔ اس کی وجہ سے محلے میں چھان

سی ہو جاتی جس کے نیچے سے گزرتے وقت بھی بڑی خوشی ہوتی۔ دوست محمد کی دکان میں گردن کٹے

بکرے اور دنبے لٹے لٹے ہوتے اور گھروں میں دھڑا دھڑا گوشت جا رہا ہوتا۔ چراغ سبزی

والے کو سر کھلانے کی فرصت نہ ہوتی میر حسن منہاری والا کبھی کوئی پکیٹ کھوتا، کبھی الماری

کھوتا، کبھی کسی گاہک کی فرمائش پر دیوار کے ساتھ چھت تک گئے خانوں پر سیر می لگا کر چرچہ

جاتا اور کبھی کسی بچی کو گز سے ربن ناپ کر دیتا۔ اسد جو نے شاد سنار کی دکان کے تختے پر اپنا سامان

کر رکھا ہوتا۔ قدیم روسی جہاز رانوں ایسی بڑی بڑی مونچھوں کے اندر اس کے دانت چمک رہے ہوتے اور ہ سموسہ کوٹ میں لپٹا لپٹا یا چائے کی چٹکیاں لے رہا ہوتا۔ بوری چوکیدار بجلی کے کھمبے کے نیچے اپنے پنج پر برائٹکی اوڑھے بیٹھا پنڈلیوں پر گرم خاکی پٹیاں لپیٹ رہا ہوتا۔

اب حرفے کی رات ادھی کے قریب گزر گئی ہے۔

بچے عید کی مسرتوں کے خواب آنکھوں میں سمائے بچھونوں میں دُکب گئے ہیں۔ ایک بچے کے بعد محلے کی دکانیں بند ہو گئی ہیں صرف ماسٹر شفیق کی دکان کے بند کیواڑوں کے پیچے سے سنگ مشین چلنے کی آواز آرہی ہے۔ کسی وقت ماسٹر صاحب اقبال کا کوئی شعر گنگانے لگتے ہیں۔ وہ عام طور پر کپڑے پر بحیہ مارتے ہوتے یہ شعر گایا کرتا ہے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بجز ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مستری عبداللہ حقے کا کش لے کر اسے ضرور ٹوکا کرتا۔

"ماسٹر! گھوڑے تو ہم نے ضرور دوڑاے تھے پر اب ہم مسلمان کیا کر رہے ہیں!

اوجیز عمر کا ختنشی ڈاڑھی والا مستری عبداللہ معمار تھا، لیکن وہ ہر فن میں ٹانگ اڑا دیا کرتا۔

سکھپے کا کشتہ بنانے کی بات ہو رہی تو مستری عبداللہ ضرور پیچ میں بول پڑتا۔

"جیب تک اُپلوں کی آگ میں دھرن بوٹی کا بڑا وہ نہ جھپکا جائے سکھیا کبھی

تعبی نہ پڑتا"

ایک بار ماسٹر شفیق نے کہا:

"سننا ہے جرمین کی فوجیں لندن کے اس پاس پہنچ گئی ہیں؟

مستری عبداللہ جھٹ بولا:

"جرمنی والوں نے ایک ایسا لوہے کا چھینکا ایجاد کر لیا ہے جسے وہ جرمین میں مکانوں کے

اوپر پھیلا دیتے ہیں۔ اوپر سے جو بم آتا ہے وہ چھینکے میں ہی گر کر رہ جاتا ہے اور پھٹتا نہیں"

مستری عبداللہ ہمیشہ گائے کا دودھ پیتا۔ دکان پر اگر وہ ایک پیسے کا دودھ پیا لے میں ڈالتا

دودھ کے برابر پانی ڈالتا اور ایک ہی گھونٹ میں چڑھا جاتا۔ وہ اکثر کہا کرتا۔

”گو کے دودھ میں ماں کے دودھ کی تاثیر ہوتی ہے۔“

ایک بار وہ دلی گیا۔ واپس آیا تو دلی کے علاوہ بہتی کے فرضی سفر کی داستان بھی سنا ڈالی۔ معمار وہ بڑا زیرک اور پائے کا تھا۔ یونہی چلتے چلتے کسی مکان کے سامنے گھڑا ہو جاتا۔ دو قدم ادھر، دو قدم اُدھر جا کر، گردن ٹیڑھی کر کے اُس مکان کو اوپر سے نیچے دیکھتا اور پھر اپنے ساتھی سے اتنا کہہ کر آگے چل پڑتا۔

”مکان کی کرسی ٹیڑھی رہ گئی ہے۔“

حرفے کی رات ڈھل رہی ہے اور عید کی صبح طلوع ہونے والی ہے۔

امرتسر میں عید کی صبح کو اذان کے وقت لوگ قبرستان میں اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی کو جایا کرتے تھے۔ ہمارے آبا و اجداد کی قبریں بھی امرتسر کے گھی منڈی والے قبرستان میں تھیں۔ میں اپنے آبا جی کے ساتھ منہ اندھیرے قبروں پر جاتا۔ امرتسر کا یہ قبرستان ہمارے محلے سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ دروازہ وہاں سنگھ سے باہر نکلتا تو واسپنے ہاتھ کو باغ کے ساتھ ساتھ کئی سڑک سکرتی باغ کو جاتی تھی۔ بائیں ہاتھ کو دھوبی گھاٹ اور بھرج پھولا سنگھ آجاتا۔ یہاں سے ایک کچا راستہ قبرستان کو جاتا تھا۔ یہ قبرستان لاہور کے قبرستانوں کی طرح دیران اور خاک آلود نہیں تھا۔ یہاں امر و لوکاٹ اور آلوپے کے باغ تھے، بلکہ قبرستان ان سرسبز باغوں کے بیچ میں آگیا تھا، ان باغوں میں ٹھنڈے اور شفاف پانی کے نالے بہتے تھے جن کے کناروں کی بہری گھاس میں نیلے پھول کھلے رہتے۔ بڑی نہر سے نکل کر دریا صاحب کو جانے والی ہنسلی اسی قبرستان سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہاں گیندے کے کیسری پھولوں کے کھیت بھی تھے۔ بری دسمبر کی نیم گرم چکلی دھوپ میں ان پھولوں پر تتلیاں منڈلایا کرتیں اور سنہری فضا میں گیندے کے پھولوں کا کیسری رنگ اڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اسی قبرستان میں حسین شاہ صاحب کا دربار غوثیہ بھی تھا جس کے سبز گنبد کے عقب میں چھوٹا سا چڑیا گھر تھا اور داہنے ہاتھ کو پچے گلاب کی کھیتی تھی۔ گرمیوں کی دوپہروں کو اس کھیتی کی طرف سے گلاب کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ قبرستان کے باہر پھلیرے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگائے۔ بیٹھے ہوتے۔ صبح کی مہکی مہکی نیلگوں روشنی میں ان ٹھنڈے پھولوں پر شبنم کے موتی

چمک رہے ہوتے۔ آبا جی پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے۔ میں یہ رومال اُن سے لے لیتا اور قبروں پر جاتے جاتے ان پھولوں کی ٹھنڈی گہری خوشبو کوئی بار سوگھتا قبرستان میں داخل ہوتے ہیں ادھر ادھر سے قرآن مجید کی تلاوت کی آوازیں آتی شروع ہو جاتیں۔ قبروں پر جگہ جگہ موم بتیاں اور کھڑے تیل کے دیئے ٹھارے ہوئے۔ فضا میں اگر بیتوں اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوتی۔ کہیں کہیں دیوں اور موم بتیوں کی روشنی میں قرآن پڑھتی عورتوں اور مردوں کی شکلیں نظر آ جاتیں، پچھلے پہر کے آسمان پر سردیوں کے ٹھنڈے ستارے چمک چمک کر ماند پڑ رہے ہوتے۔ رومال بندھے ہوئے گلاب کے پھول ٹھنڈے ہو جاتے۔ امر و کے جھنڈوں کے عقب میں ہمارے اجداد کی قبریں تھیں ہم ان پر چاول بکھیرتے قبروں کے سر ہانے پڑے مٹی کے پیالوں میں تازہ پانی بھرتے، اگر بتیاں ملگاتے آبا جی قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہتے اور میں درختوں پر سے اوس گرتی دیکھتا رہتا۔ مشرق کی طرف آسمان پر نیلی روشنی کا غبار سا بلند ہوتا شروع ہو جاتا اور میرا دل اس خیال سے لبریز ہو جاتا کہ ابھی گھر جا کر نئے پھولوں کا عید کی ملے گی اور دوستوں کے ساتھ خوب مزے اڑائیں گے۔

جب ہم واپس ہوتے تو دن نکل آیا ہوتا۔ عید کا دن۔ عید کی صبح — حسین اور خوبصورت صبح — محلے میں داخل ہوتے ہی ننھی ننھی بچیاں گونے کناری والے کپڑے پہنے سہیلیوں کے ساتھ ہنسی کھیلتی دکھائی دیتی۔ گاما رنو گر کہنی باغ کی طرف آتا نظر آتا۔ اُس نے سرخ رنگ کی شال اوڑھ رکھی ہوتی اور ہاتھ میں گلاب کے دو ایک پھول ہوتے۔ مٹی میں آتے تو جان اپنی چھوٹی سی دکان سمجھا رہا ہوتا۔ اُس نے مکان کے باہر تخت بچھا کر اوپر سفید چادر ڈالی ہوتی۔ دوغنی پیالوں کے بیچ میں گن دان میں پھول مسکرا رہے ہوتے۔ دیوار کے ساتھ کھلونوں کی قطار لگی ہوتی۔ وہ نہا دھونے کپڑے پہن گدھی پر بیٹھا ایک ایک پیسے دو دو پیسے میں مٹی کے کھلونے بیچ رہا ہوتا۔

مسجد کے سامنے گاما گنگنیاں والا بیٹھا تھا۔ تانبے کے نیچے والا حقہ قریب ہے۔ بالٹی میں مٹی کی پیالیاں رکھی ہیں۔ اونچا لمبا، ادھیر دم، دھلا پتلا گاما گنگنیاں والا ہر روز صبح کو چھ بڑی میں سودا سجا کر حقہ ہاتھ میں لیے گھر سے نکلتا اور اتنا کہہ کر گلی گلی سودا بیچنے چل پڑتا۔

”چل اونے گامیابل دی دے بتھے لگن نوں۔“

اُس کا لباسی ہمیشہ یہ ہوتا۔ سر پر بغیر کلاہ کے پگڑی، لمبی قمیص، دھوتی، پاؤں میں جڑی

اور تیسے والے باوامی بوٹ۔ ہم بڑے شوق سے اس کی چھاڑی کے اگے بیٹھ جاتے۔ وہ مٹی کی پیالی میں اُبلتی ہوئی گنگنیاں ڈالتا۔ اس میں بارہ مسالے ملاتا۔ کھٹا انڈیتا اور پھر ٹین کی پتلی سی چمچی رکھ کر پیالی تھما دیتا۔ گرمیوں سردیوں صبح کے وقت ہر روز گلی میں اس کی یہ صدا گونجا کرتی۔

گنگنیاں دی کھاؤ گی گنگنیاں بھی کھاؤ گی

گائے کا ایک بھائی فیروز اپنے گھر پر قالینوں کا رفو کیا کرتا۔ کام کا مندا پڑا تو اس نے اپنے مکان میں ایک کھڈی لنگالی اور کھیس بن کر بیٹھے لگا۔ وہ کام بھی نہ چل سکا تو فیروز نے نعت خوانی شروع کر دی۔ اب ہر عید میلاد اور جمعے کو گلی والی مسجد میں اس کی کانپتی ہوئی آواز لرزاکرتی۔

عید کی صبح کو گائے کی بچ مچ نرالی ہوتی۔ لال صافہ باندھ رکھا ہے۔ تھکے کی تے پر گیند سے کار پڑا ہے۔ چھاڑی میں جگہ جگہ گلاب اور گیندے کے پھول سج رہے ہیں۔ بچوں کو سودا دے رہا ہے۔ سر کھانے فرصت نہیں۔ برکت پنہاری نے دکان کے تخت بچا کر منیاری سجا رکھی ہے۔ کھٹی مٹھی گولیاں ہیں۔ بادام کی گولیاں ہیں۔ دل بہا رہی ہیں۔ کپڑے کے ڈنک ہیں جن کے اندر سرخ پانی بھرا ہے اور شیشے کی تھنی سی مچھلی تیر رہی ہے۔ لٹری کی پڑیاں ہیں۔ ایک پیسے کی چاہ ہے جو کسی پڑیا لے لو۔ اگر خوش قسمت ہیں تو ایک آنے کی چیز نکل آئے گی۔ نہیں تو دوسری دھیلے والی سیٹی یا انچور کی پڑیا۔ کو کونٹ کے بسکٹ ہیں اور انڈے کی خٹائیاں ہیں۔

گو سینڈو نے اپنے مکان کے آگے تخت پر ڈانس رگ رکھا ہے۔ ایک آنہ دے کر بھنھری انگلی سے گھاؤ۔ سوئی کسی نمبر پر رکے تو اتنے پیسوں کا کوئی کھلونا۔ کوئی اندی پن، کوئی نقلی گھڑی یا زنجیری والی سیٹی لے لو، اگر صفر نمبر پر رکے تو کھیل ختم آنہ بھنھم۔ گو سینڈو نے چھ مین میں سے کوئی پُرزہ نکال رکھا تھا۔ سوئی ہمیشہ صفر پر ہی رکتی۔ حاجی احمد شاہ سامنے مسجد کے رونٹ پر بیٹھا سوتیاں کھاتے ہوئے سینڈو کو سرزنش کر رہا ہے۔

”گلو! یہ جو آ ہے۔ اس سے باز آ جا۔“

اس کے جواب میں گو سینڈو صرف ہنس دیتا ہے۔ کیا مجال جو حاجی صاحب کے سامنے گستاخی سے پیش آئے۔ دراصل وہ زمانہ ہی بڑے ادب آداب کا تھا۔ گولیاں کھیتے بچے بڑوں کو دیکھ کر ادھر ادھر ہلک جاتے۔ اب تو سینہ تان کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، بلکہ بزرگوں کو بھی گولیاں کھیلنے کی دعوت دیتے

ہیں۔

عید کی نماز پڑھنے میں گھر والوں کے ساتھ رام باغ والی عید گاہ میں جاتا۔ عید گاہ کی مسجد کا صحن جلد ہی بھر جاتا۔ لوگ مسجد کی چار دیواری کے باہر والی گراؤنڈ میں اپنی اپنی دریاں اور قالین کے ٹکڑے بچھا کر نماز پڑھتے۔ اعلیٰ اس کے درختوں کے نیچے چوتروں پر ادھر ادھر ٹکڑے کھڑے ہو جاتے۔ لاؤڈ سپیکر والے مکان دونوں رواج نہیں تھا۔ مسجد کے اندر سے انڈا کبر کی آواز آتی تو چوتروں پر کھڑے ٹکڑے کے بعد دیگرے اسی آواز کو دہراتے چلے جاتے۔ نماز کے بعد عید گاہ سے باہر نکلتے تو گزر مار، نقل کنگے، فقیر اور فقیر نیاں چمٹ جاتیں۔ خیراتی اداروں کے کارکن چندہ مانگ رہے ہوتے۔ غبارے اور بھنھیریاں بک رہی ہوتیں۔ ہر طرف بے سبائے خوش و خرم چمکتے بچے بچیاں اپنے بزرگوں کی انگلیاں تھامے، ہنستی ہسکراتیں، بلجے بجاتیں، غبارے پھلاتے نظر آتیں۔ عید گاہ سے واپسی پر گلی محلوں میں عید کی رونقیں اپنا رنگیں آنچل پھیلا دیتیں۔ میں نے چرچر کرتے جوتے نئی قمیص، نئے کوٹ اور نئی جرابیں پہنے کوٹ کی جیب میں ریشمی روٹل بچائے اپنے دوستوں کے ساتھ گلی گلی میر کرنے نکل کھڑا ہوتا جس محلے میں جاؤ عید کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ گھروں میں عورتیں پہلے بچوں کو تیار کرتی اور سب سے آخر میں خود تیار ہوتیں۔ گھر میں ہر آنے جانے والوں کو سوتیاں، مشب ویک پلاؤ اور ساگ مچھلی سے تواضع ہوتی۔ ریکھ اور بندر کا تماشا دکھانے والوں نے محلے محلے سجا جھاڑ رکھی ہوتی۔ ڈگ ڈگ بج رہی ہے بندر ناچ رہا ہے۔ بچے تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ بڑے بوڑھے بھی بندر کی مضحکہ خیز حرکتوں پر ہنس رہے ہیں۔

عید کے روز سینا گھروں کو بھی رنگ برنگ جھنڈیوں سے خوب سجایا جاتا۔ ہر سینا گھر میں عید کی خوشی میں چار شو ہوتے۔ پہلا شو صبح دس بجے شروع ہو جاتا، امرت ناکیز، ریا لٹو، راکل ناکیز، نشا سینا اور پرل ناکیز میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ سینا گھروں کے باہر تھو فتاتیں لگی ہوئیں اور مٹھائی، پان بکریٹ کی دکانیں بھی ہوتیں۔ دوپہر کو ہم کہیں باغ میں سیر کو نکل جاتے۔ گھاس کے تھتوں میں پھول کھلے ہوتے۔ حوتی میں سرخ مچھلیاں تیر رہی ہوتیں۔ سیر کرنے والی ٹولیاں باجے بجاتیں، ہنس مذاق کرتی روٹوں پر گھوم رہی ہوتیں۔ پردہ کلب کے باغ میں لڑکیاں جھولے جھول رہی ہوتیں۔ باغ میں آن کے مسرور تھکتے کوچ رہے ہوتے۔ وہ پینک اوپر چڑھاتیں تو جھاڑیوں کی دیوار کے اوپر ان کے ریشمی اڑتے آنچلوں کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔

گول بارغ میں سرکی اور کھیل تماشے دکھانے والوں نے ڈیرے جمار کھے ہوتے۔ پردے کی چار دیواری کے اندر شیخ پر عورتیں سُرخ پوڑ تھوپے ناچ رہی ہوتیں۔ زمین کھود کر دریاں بچھا دی گئی ہیں۔ اُن کے پیچھے بچے رکھے ہیں۔ باہر بانس کی مچان پر مسخرہ چارلی چلن ایسا علیہ بنائے اوجھل کود رہا ہے اور لوگوں کو تعییر دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ ایک پل کے لیے سامنے کا پردہ اٹھا دیا جاتا۔ سامنے شیخ پر لمبے لمبے بالوں والی عورتیں ناچتی نظر آتیں۔ لوگوں کا اشتیاق دیکھ کر فوراً پردہ گرا دیا جاتا۔ سرکس تہوڑوں کے اندر سے شیر کے گرجنے کی آواز آرہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی آدمی گھڑے میں منہ ڈال کر شیر کی بولی بول رہا ہے دھوتو والے گراموفون چیخ رہے ہیں۔

لال بازار میں سبکھوں نے بھی پھولوں کی دکانوں کو عید کے لیے سجا رکھا ہے۔ فالوورے والا سکھ دھلے دھلائے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ کٹوے چمک رہے ہیں۔ پتیل کی طشتریوں میں رتن جو کے پھول پڑے ہیں۔ امرتسر میں رتن جو کا پھول عام طور پر مندروں اور گردواروں میں چڑھایا جاتا تھا۔ مسلمان گلاب اور گیندے کو پسند کرتے تھے۔ صبح صبح ہندو لالے دکان کھولتے تو اندر پتوں میں لپٹا ہوا رتن جو کا پتلا سا بار پھول والا پھینک گیا ہوتا۔ وہ سب سے پہلے رتن جو کا بار دکان میں لگی کرشن جی کی تصویر کو پہناتے اور پھر کاروبار کو شروع کرتے۔ مسلمانوں کے ہاں تہواروں عید میلاد کی محفلوں اور بیاہ شادیوں پر گیندے اور گلاب کے پھول استعمال کرنے کا رواج تھا۔

جوں جوں عید کا دن گزرتا جاتا، میں آداس ہونا شروع ہو جاتا۔ کاش! عید کا دن کبھی نہ گزرے! تیسرے پہر جب سائے لمبے ہو جاتے تو اس خیال سے دل کو حوصلہ ہوتا کہ چلو کل ٹرڈ کا میلہ دیکھیں گے۔ ٹرڈ کا میلہ امرتسر میں عید کا لازمی جزو تھا۔ ٹرڈ کے میلے کے بغیر آپ امرتسر کی عید کا تصور نہیں کر سکتے۔ امرتسر کی عید گزرتی، مگر اس کی خوشبو ٹرڈ کے میلے میں موجود رہتی۔ عید کی رات کو ہم ٹرڈ کے میلے کے خواب آنکھوں میں لے کر سو جاتے اور ٹرڈ کی صبح میلے کی خوشیاں اپنے دامن میں سے گر پڑتی۔

یہ میلہ امرتسر کے سکتری بارغ میں لگا کرتا۔ یہاں اونٹنے لمبے درخت ہوا میں جھوما کرتے۔ ایک جگہ نیم دائرے کی شکل میں لڑکی کی جالیوں سے جافری سی بنی تھی۔ اس جافری کو عشق بیچاں کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اندر دو چار میز پر رکھی تھیں۔ یہ سکتری بارغ کی لائبریری تھی۔

بارغ کے لاؤڈ سپیکر پر شام کو ریکارڈنگ ہوا کرتی۔ ”نگتی“ فلم اُن دنوں امرتسر میں بڑا ریش لے رہی تھی۔ میں اور میرا دوست شانتی سرورپ اس بارغ میں بیٹھ کر کانن بالا کا یہ گیت بڑے وجد کے عالم میں سنا کرتے۔

سپنوں میں کوئی آتا ہے

کچھ چکے سے کہہ جاتا ہے

شانتی سرورپ منہ سے ستار بجانے میں بڑا ماہر تھا۔ وہ شعر و ادب اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اور میرا بڑا پکا یار تھا۔ فسادات کے دنوں میں وہ ایک روز اچانک ہماری گلی میں آنکلا۔ ہر طرف قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”شانتی! تم کیوں آگئے ادھر؟“

”تمہاری خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔“

حالات کی سنگینی کا شانتی سرورپ کو بھی احساس نہ تھا۔ میں اُسے بڑی مشکل سے اپنے محلے سے نکال کر باہر کو وال کی طرف لے گیا اور ملکہ کے بٹ کے پاس پہنچ کر گیا۔

”شانتی یار! تم نے تو کمال کر دیا۔ خدا کے لیے ابھی ادھر نہ آیا کرو۔“

شانتی اپنے مخصوص انداز میں سر کو جھٹک کر ہنس دیا۔

”یار حمید! کیا اب ہم اپنے دوستوں سے بھی نہیں مل سکتے؟“

اس کے بعد شانتی سرورپ سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہاں سے بارغ رامانند کی طرف نکل گیا۔ پھر اُس سے کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ سکتری بارغ کے ساتھ ہی ایک گراؤنڈ تھی۔ اس گراؤنڈ میں ٹرڈ کا میلہ لگتا تھا۔ ایک روز پہلے ہی دکانیں لگا دی جاتیں۔ قنائیں تن جاتیں۔ میلے کے روز یہاں بڑا ہجوم ہوتا۔ بارغ کی بڑی روش پر دونوں طرف کھلونوں بیچنے والوں کی قطاریں لگی ہوتیں۔ فضا میں رنگ برنگے غبارے لہرا رہے ہوتے۔ لڑکی کے رنگدار پنکھڑوں کی چپیں چپیں گونج رہی ہوتی۔ قتلے تلے جارہے ہوتے لوگ قتلے خرید کر گھاس پر درسی بچھا کر وہیں اپنے بچوں کیساتھ بیٹھ جاتے اور کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔ مٹھائی کی عارضی دکانوں پر لوگوں کا رش ہوتا۔ ایک طرف چند منچے نوجوان بینک بڑھا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ٹولی تمکناریوں پر گیت گاتی

گودھی ہے۔ شہر سے میلہ دیکھنے والوں سے لدے ہوئے تانگے آکر باغ کے باہر رکتے اور میلے کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔

سورج ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میلے کی رونقیں ماند پڑنے لگتی ہیں بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر تنگاریاں بجاتے مٹی کے کبوتر، کوتے اور طوطے اور ہلتے سر والا سفید ریش مٹی کا باوا تھلے گھر کو چل پڑتے۔ واپسی پر میلے سے قلمہ اور حلوہ ضرور لاتے۔ میلے میں بڑا خاص قلمہ ملتا تھا۔ اس لیے کہ یہاں حلوائی دیہاتوں سے نہیں آتے تھے، بلکہ شہر کے نامور اور مشہور حلوائی اپنے کاریگروں سے میلے میں دکانیں کھولایتے تھے۔ گلی میں آتے تو وہاں میلے سے واپس آتے والے بچے ایک دوسرے کو اپنے اپنے کھلونے شوق سے دکھا رہے ہوتے۔ جگہ جگہ تنگاریاں بچ رہی ہوتیں عنایتی حلوائی کی دکان پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ لوگ قلمے اور مٹھائیوں سے ٹوکریاں بھر بھر کر اپنے گھروں اور رشتے داروں کے گھروں کو لے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھو چہرے پر خوشی کی چمک ہے۔ ہونٹ حلوے کے گمی سے تر ہیں۔ آنکھوں میں سزمہ لگا ہے۔ بالوں میں تیل چمک رہا ہے۔ لوگوں کی مانگ میں میٹھل بھری ہے جو بجلی اور گیس کی روشنی میں دمک رہی ہے۔ جتنا کہ عطر کی گرم خوشبو ہر سمت اڑ رہی ہے۔ ہاتھوں میں گیندے کے کیسری پھولوں کے گجرے ہیں۔ ہتھیلیوں میں مہندی لگی ہے مہندی میں امرتسر کے باغوں کی مہک ہے۔ گیندے، گلاب اور مولسری کی مہک ہے اور عید کا سورج، میلے کا سورج غروب ہو رہا ہے۔ اندھیرے کی چادر پھیل رہی ہے ہجر کی دیوار کھڑی ہو رہی ہے۔ ہجرت کا سفر شروع ہو رہا ہے، قطرہ سمندر سے، کرن سورج سے خوشبو پھول سے اور گوشت ناخن سے جدا ہو رہا ہے۔

اتنے برسوں بعد آج امرتسر کی عید کو یاد کرتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی عمر رسیدہ بیوہ اپنے جہیز کا پرانا صندوق کھولے اپنے سہاگ کا خستہ حال عروسی جوڑا دیکھ رہی ہو۔ کہاں چلے گئے؟ کہاں چلے گئے وہ جتنا کی خوشبوؤں میں بے ہوئے ریشمی رمال، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے سچے موتی اور پھولوں بھری بیج پر سوئے ہوئے چمکتے، دھکتے، روشن اور پرمست دل۔ میرے امرتسر! میرے یر وشم! میرے قریبہ اتیرے معبودوں کی ترقیبیں ویران ہو گئیں۔ تیری سرخ نصیلوں کے برج کھنڈر بن گئے تیرے المراؤں کے شیشین خون سے بھر گئے اور تیرے جالی مادہ سرریں جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے۔

امرتسر کی ایک درگاہ

دروازہ مہان سنگھ سے باہر نکلیں تو سیدھی سرک آرٹ سکول کے پہلو سے گزرتی دائیں جانب بوڈی شاہ کے تیکے کو اور بائیں طرف پاتھی گراؤنڈ کو پیچھے چھوڑتی سامنے تحصیل پورے کی طرف نکل جاتی ہے۔ تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتے ہی دو طرفہ لوکاٹ کے گہری سبز چھاؤں والے باغوں کے بیچوں بیچ ایک تنگ سا کچہ راستہ جالندھر ٹالر ریلوے لائن کی طرف نکل جاتا ہے۔ اس کچے راستے پر کھٹے کے پودوں نے چھت بنا رکھی تھی۔ مارچ اپریل کے دنوں میں جب کھٹے کے جھاڑوں میں سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ مہک جاتا۔ میں صبح کی سیر کو جاتے یہاں سے لمبے لمبے سانس لیتا، آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا۔ اور سفید پھولوں کو — لیکن یہ میں کہاں نکل آیا؟ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو مجھے ایک پل میں کہاں سے کہاں لے کر نکل گئی۔ میں واپس دروازہ مہان سنگھ میں آتا ہوں۔

دروازہ مہان سنگھ ہمارے محلے کا دروازہ تھا۔ اُن دنوں مجھے کبھی یہ احساس نہ ہوا تھا کہ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ بھید ہندو مسلم فسادات کے بعد کھلا۔ اس دروازے سے باہر نکل کر آپ دائیں طرف سرک گھوم جائیے۔ ایک طرف ٹیشم کے سایہ دار درختوں کی قطار دُور تک چلی گئی ہے اور دوسری طرف گلاب، ڈیلا اور چنیل کے پھولوں سے مہکتا باغ سرک کے ساتھ ساتھ دروازہ گھی منڈی تک چلا گیا ہے۔ اس باغ میں یو کلپش کے نو عمر چہرے درخت ہوا کرتے تھے۔ جن کی لمبوتری تینوں دلی ٹہنیاں گرمیوں کی صبح کی ٹھنڈی ہوا میں جھومنا کرتی تھیں۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی خون آلود، دھواں دھواں، دہشت زدہ دوپہر کو جب ہم افراتفری کے عالم میں دروازہ مہان سنگھ سے نکل کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بھاگے تو گورداسپور ریلوے لائن کے بادلوں میں آگ کی سرخ زبانیں لپک رہی تھیں اور اس باغ کے نو عمر یو کلپش کے

درختوں کی لمبی تازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ساکت و جامد تھیں۔ جیسے وہ پتھر ہو گئی ہوں۔

قیام پاکستان کے پانچ سال بعد جب میں امرتسر گیا تو ان درختوں نے مجھے دُور سے آتا دیکھ کر اپنی شاخیں ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ مجھے اپنی بے زبانی میں خاموش آوازیں دیں۔ اپنی ہونقی خوشبو کی آواز میں میرا نام لے لے کر پکارا۔ اور جب میں اُن کے پاس گیا تو وہ چُپ ہو گئے۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ درخت کی ایک ٹہنی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ یہ محبت کی تال تھی۔ ہم گہرا، ہمداوست، ہمراز اوست، ہمہ تن ساز، ہمہ تن گوش کبھی نہ بھلائی جانوالی، کبھی نہ یاد آنے والی محبت کی تال۔ کسی نہ چڑھنے والی کبھی نہ اُترنے والی شراب کا نشہ کبھی نہ طلوع ہونے والے، کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کی روشنی! میں اور درخت کتنی ہی دیر تپتی کرتے رہے۔ اُس نے کہا۔

”تم بھی مجھے چور کر چلے گئے؟“

میں نے کہا۔

”سبھی چلے گئے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ امرتسر تو مسلمانوں کے لئے جہنم بنا دیا گیا تھا اور مسلمان جہنم میں نہیں رہا کرتا۔ لاہور کے چیرنگ کلاس اور سمن آباد میں کچھ یوکیٹس کے درخت ہیں۔ میں اُن سے تمہارا حال پوچھ لیا کرتا ہوں۔ ویسے بھی مسجد میں جب سمن آباد کی مسجدیں اذان کی صداؤں سے گونجتی ہیں اور میں نیم روشن صحن میں ٹٹلتے تاروں بھرے آسمان تلے اگر گہرے سانس لیتا ہوں تو مجھے تمہاری خوشبو آتا کرتی ہے۔ تمہارے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دیا کرتی ہیں۔“

یوکیٹس کی ٹہنیاں خوشی سے لہراتے لگیں اور۔۔۔۔۔

معاف کیجئے گا۔ میں پھر اپنے موضوع سے ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ ہٹ گیا۔ میری اور درخت کی باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ سلسلہ تو موت کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اُن۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں یہ باغ ختم ہوتا ہے وہاں اکالی سکھ یعنی نہنگوں کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے بڑج پھولا سنگھ کہتے ہیں۔ سکندر حیات کی وزارت میں سکھوں

نے اپنے گرد ورسے کے پاس اس کی تعمیر شروع کی تو امرتسر کے مسلمانوں نے حکومت پنجاب سے شدید احتجاج کیا۔ جیسے ہوئے۔ سرسکند کے پاس مسلمانوں کے وفد گئے۔ لیکن کچھ نہ بنا اور قلعے کی تعمیر شروع رہی۔ قلعہ بن گیا۔ اس قلعے میں سکھوں نے اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ ہم اپریل ۱۹۴۷ء کو سکھوں نے اسی قلعے کے سوراخوں سے گئی منڈی اور بہان سنگھ دروازے کے مسلمانوں پر اندھا دھند فائرنگ کی۔ ہمارے محلے کا جوان جید اٹال دالا انہی سکھوں کی گولی لگنے سے شہید ہوا۔

اس قلعے کے سامنے ایک چھوٹی سی پختہ سڑک نیچے کو اترتی ہے۔ کونے پر ایک مسجد ہے کنواں اور اکھاڑہ ہے۔ ذرا اُگے جا کر پہلی آجاتی ہے اور پھر قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ جس درگاہ کے بارے میں، میں لکھنے والا ہوں وہ اسی قبرستان میں واقع تھی۔ ہم سب نے ایسی بہت سی درگاہیں دیکھی ہوں گی جو صدیوں سے آباد ہیں اور جن کی رونقوں اور جگمگاہٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن امرتسر کے قبرستان والی یہ پہلی درگاہ تھی جو میری آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی۔ برقی قمقموں سے بے نقہ درخت، اس کی فضائی بیدم وارثی کے عارفانہ کام سے گونجیں، وہاں دودھ کی نہریں بہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ اُجڑ گئی۔ لوگ اس کے برقی قمقموں اور ٹوٹتیاں اتار کر لے گئے اور دودھ کی نہروں میں مکڑیوں نے جالے بنائے۔ یہ درگاہ امرتسر کی ہماری کشمیری برادری کے ایک قریبی عزیز خواجہ صاحب نے اپنے نانا کی قبر پر بنائی تھی۔ میں اُن دنوں ایم اے او بانی سکول میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب کے پاس اچانک کہیں سے بہت سی دولت آگئی۔ انہوں نے فوراً قبرستان میں اپنے نانا کی قبر پر (جیسا کہ والدہ مرحومہ اور خالہ جان ہمیں بتایا کرتی تھیں) ایک عظیم الشان درگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ درگاہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ دُور دراز سے کاریگر معماروں کی خدمات حاصل کیں۔ میرے خالہ زاد بھائی رشید لال نے وہاں بجلی کی ساری فٹنگ خود کی۔ میں آج بھی چشم تصور میں اُسے بیچ کس دانتوں میں دبائے میٹر بھی پر جھک کر تاروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا دیکھ رہا ہوں۔ درگاہ کے گنبد کے اندر جو روشنیاں لگیں وہ سبز انگوروں کے گچوں کی شکل میں لٹک رہی تھیں اگر وہ دلی اور لکھنؤ سے نہایت قیمتی اور حسین جھاڑ فانوس منگوا کر اندر لٹکائے گئے۔ گنبد کے اندر تین قبروں کے تعویذ تھے۔ ایک خواجہ صاحب کے نانا کی قبر کا تعویذ تھا۔ دوسرا خالہ اُن کی نانی صاحبہ کی قبر کا تعویذ تھا

اور میرا تعویذ اُن کی اپنی قبر کا تھا جو تعویذ کے نیچے تہہ خانے میں کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ مرنے کے بعد انہیں وہیں تہہ خانے میں دفن کیا جائے۔ ایک دفعہ میں تہہ خانے میں اُتر گیا۔ چھوٹا سا لحد تہہ خانہ تھا۔ چھت اور دیواروں پر سینٹ کیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ چمکتی بریکٹوں والے دو دھیا غبارہ نماب لب لگے تھے۔ وہاں مرنے کے بعد خواجہ صاحب کی قبر تعمیر ہونی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ امرتسر کا یہ قبرستان بڑا خوبصورت تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاہور میں مسلمانوں کے ننگے قبرستانوں پر گر میوں میں چمکتی دھوپ پڑتی ہے اور سردیوں میں گہرا گر تاپ ہے۔ جب کہ لاہور ہی میں عیسائیوں کے قبرستانوں میں سایہ دار درختوں کے جھنڈ ہیں اور قبروں کے کتبے پھولوں سے ڈھکے رہتے ہیں۔ امرتسر کا ہمارے محلے کے باہر والا قبرستان لاہور کے گورا قبرستان سے بھی زیادہ شاداب اور پُر سکون تھا۔ دراصل یہ قبرستان آم، لوکاٹ اور امرود کے باغوں کے بیچ میں اُگ رہا تھا۔ یہاں کوئی قبر ایسی نہ تھی جس پر کسی نہ کسی درخت کا سایہ نہ ہو۔ اور پہلو میں گلاب یا گیند کے پھول نہ کھلے ہوں۔ ہم رات کو بھی قبرستان میں بے دھڑک چلے جاتے۔ یہیں کبھی کسی قسم کا خوف یا دہشت محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ یوں لگتا کہ واقعی ان قبروں کے اندر بڑے ہی نیک لوگ نحو خواب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بچے ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی چوٹی سے چھوٹی قبر پر بھی پاؤں نہ رکھا تھا۔ یہاں پھلدار باغوں میں ندی کے مٹیا لے ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے۔ برسات میں ان نالوں میں درختوں سے نیچے ہوئے آم اور امرود بہا کرتے جنہیں ہم بیک کسی پیا پر بیٹھ کر مزے لے لے کر کھاتے۔ برسات میں گھنگھور گھٹائیں برستیں اور ہم یہاں امرود کے درختوں پر چڑھ کر دھڑ دھڑ پاؤں پھانے امرود توڑ توڑ کر نیکر کی جیبیں بھر کرتے۔

عید کی صبح کو منہ اندھیرے لوگ قبرستان جا کر فاتحہ اور قرآن خوانی کرتے میں بھی اپنے چھوٹے آرٹسٹ بھائی کے ساتھ ضرور جاتا۔ ہم لوگ گھی منڈی داے دروازے سے نکل کر کونے والی مسجد کے پاس آتے تو ہمیں نیچے گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوتی۔ سڑک کنارے گلاب کے پھول نیچتے والے بیٹھے ہوتے۔ بڑی بڑی چنگری سرخ گلابوں اور اُن کی پتیوں سے بھری ہوتیں۔ دو پیسے میں وہ ڈھیر سارے پھول جھولی یا رومال میں ڈال دیتے۔ ہم بھی دو پیسے کے پھول لے کر رومال میں باندھ لیتے اور گرم کشمیری شالوں میں دیکے ٹھنڈی سردی میں قبرستان

میں داخل ہو جاتے۔ اُن دنوں بڑی سخت سردی پڑا کرتی تھی۔ ہمارے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور بات کرتے وقت منہ سے بھاپ نکلا کرتی۔ اوپر نیلے آسمان پر طلوع آفتاب سے پہلے کی روشنی میں ٹمٹماتے تارے زرد ہو رہے تھے۔ چھوٹی سی سڑک کی دونوں جانب خانہ بدوش قسم کے فقیر جھولیاں پھیل گئی تھیں۔ ان کے پیچھے امرودوں اور اناروں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھایا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے دھیمی اثر انگیز آواز میں قرآن شریف کی تلاوت کی آوازیں سنائی دینے لگتی۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر مٹی کے دیئے اور موم بتیاں جلا رہے ہوتے پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ کہیں کہیں اُن کے اداں چہرے چرخوں کی پھڑپھڑاتی روشنی میں ابھرتے اور پھر غائب ہو جاتے۔ مٹی جون کی تپتی سندان دوپہروں میں یہاں سے گزرتے ہوئے گلاب کے پھولوں اور کیکر کے پیلے پھولوں کی گرم خوشبو آیا کرتی۔ ذرا پرے ایک نہر بہتی تھی ادھر سے جو بھاتی اُس میں بھنگ کی جھاڑیوں کی مرطوب بو ہوتی۔

اس قبرستان کا جو حصہ جاندھر کی طرف جاتی جی ٹی روڈ کو لگتا تھا ادھر یہ درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر پلا عرس ہوا تو امرتسر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر قد آدم اشتہار چسپاں ہو گئے۔ ان اشتہاروں پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا۔ "امرتسر میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔" اس کے بعد درگاہ کے بائیں میں تفصیل درج تھی اور اس بات کا اعلان تھا کہ عرس شریف تین روز تک جاری رہے گا۔ پہلے روز کی محفل سماع کی صدارت حضرت سیدم وارثی فرمائیں گے۔ دکانداروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ میلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں آکر اپنی اپنی دکانیں سجائیں۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتا نا پڑے۔ قوالوں میں تاجا قوال اینڈ پارٹی کے علاوہ محمد علی فریدی قوال اینڈ پارٹی کا نام بھی درج تھا۔ میرے خالوجان مرحوم یہ اشتہار جھولے میں ڈال کر ہمارے گھر لائے اور سب کو پورے کا پورا پڑھ کر سنایا۔ پھر بوئے۔

میں اس درگاہ کے عرس کے خلاف ہوں۔ یہ سب جھوٹ کا کھیل ہے۔ خالوجان صاحب پینتھ برس کے دیوتا مت بھاری بھر کم اونچے بلے بزرگ تھے۔ لمبی دڑھی کھٹا گندمی رنگ۔ لمبا کھدر کا کرتہ کھدر کی دھوتی۔ لال چمڑے کی جوتی۔ ہاتھ میں موٹا عصا۔ بازار بکروانا کی روٹیاں والی مسجد کے پیش امام تھے۔ تحریک خلافت میں میری والدہ سمیت اپنے سب

گھر بار والوں کو لے کر کابل چلے گئے جہاں سے انتہائی کسی پر سی کے عالم میں واپس امرتسر آئے۔ کابل میں مہاجر مسلمانوں کی حالت ناز کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا کرتے۔ انہیں ایک بات کی بڑی خوشی تھی کہ انہیں کابل میں شہنشاہ ہابر کے مزار کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہابر کے سنگِ مزار پر لکھی ہوئی فارسی رباعی بڑے جوش و خروش سے پڑھ کر سنایا کرتے۔ کشمیری بزرگوں کی طرح ڈٹ کر کھاتے۔ میلوں پیدل چلتے۔ جمعے کے جمعے ہر عزیز اور رشتے دار کے گھر خیر خیریت معلوم کرتے جاتے۔ ڈیوڑھی میں ذرا کھنکار کر گھر کے کسی فرد کا نام لے کر پکارتے۔ جن دنوں میں فلمینگ روڈ پر رہا کرتا تھا خالوجان کی پاٹ دار آواز پر جمعے کی صبح کو مکان کی ڈیوڑھی میں گونجتی۔

• بابو عبدالحمید — ۱ •

خالوجان کی سب سے بڑی خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ اُن میں ظرافت کی جس بڑی تیز تھی۔ بڑے یلفے سناتے۔ بات کو خوب مزہ مسالہ لگا کر پیش کرتے۔ اسی بات پر خوب کھل کھلا کر بچوں کی طرح ہنستے۔ ایک روز میں خالو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ ہم نو عمر لڑکوں کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر ہمارے پاس آئے اور عصا دیوار سے لگا کر تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

• دو بھئی آج تمہیں عبدالرحمان جن کا قصہ سناتا ہوں •

وہ مجھے خود بھی کبھی کبھی جن لگتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا قد۔ بھاری جسم۔ رعب دار آواز اور قدیم یونانی فلاسفوں ایسا بھرپور چہرہ۔ لیکن اُس روز انہوں نے ہمیں جس جن کے بارے میں سنایا وہ اُن کی مسجد کے حجرے میں رہتا تھا۔ کہنے لگے۔

• دو بھئی دوستو! کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک روز میں نے اُن بچوں کو جو میرے پاس قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں کہا کہ میرا بدن دابو۔ میں پہلو بدل کر لیٹ گیا اور سارے بچے میرے بدن پر ملکی ملکی مارنے لگے۔ مجھے کچھ ایسا مزہ آیا کہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو سارے بچے جاچکے تھے صرف عبدالرحمان نامی لڑکا میری پنڈلیوں پر ٹکیاں مار رہا تھا۔ حجرے میں کافی پرے طاق میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے عبدالرحمان سے کہا کہ بیٹا دیا گل کر دو اور تم بھی جا کر آرام کرو عبدالرحمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے پھونک مار کر دیا بجا دیا۔ پس پھر کیا تھا۔ میں وہیں اٹھ کر فوراً عبدالرحمان کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ سچ بتا تو کون ہے؟ عبدالرحمان گھبرا گیا۔ جب میں نے کلائی نہ چھوڑی تو

بوللا۔ میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے یہاں آپ کے پاس قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ لو بھی دوستو! اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری اتار لاکر کھلاتا ہے۔ پس چٹکی بجاتا ہے اور سرخ قندھاری اتار اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ درگاہ کے بارے میں بھی دوستو! اب وہ جن میرا بار ہے اور مجھے کبھی کبھی کابل کے قندھاری اتار لاکر کھلاتا ہے۔ بھی خالوجان نے میرے والد صاحب کو کھلے لفظوں میں کہہ دیا۔

• مجھے عبدالرحمان جن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ عبدالعزیز! خواجہ نے وہاں درگاہ کی عمارت تعمیر کر کے اچھا کام نہیں کیا۔ عمارت کے نیچے کئی نیک آدمیوں کی قبریں آگئی ہیں۔ یہی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی •

لیکن درگاہ کے پہلے عرس میں خالوجان پیش پیش تھے۔ درگاہ کے پچھوڑے اپنی نگرانی میں زروے بریانی کی دیگیں دم کر رہے تھے۔ مہنتی نائی کو کام کرتے ہوئے بار بار ٹوکتے۔

• زروے میں سنگترے کے ترخ ڈال دیئے •

• مہنتی! بجولے کی آگ تیز لگتی ہے مجھے •

• بریانی تیار ہو گئی ہو تو ایک بُر کی چکھانا مجھے •۔۔۔۔۔

پہلے عرس پر درگاہ کے اندر باہر بڑی رونق تھی۔ شہر سے زیادہ تر لوگ دودھ کی نہروں کاٹن کرائے تھے۔ دودھ کی نہر درگاہ میں ایسے چلائی گئی تھی کہ سیمنٹ کے سینچے ایک لمبوترے ٹینک کو کچے دودھ کی لسی سے بھر دیا گیا۔ تانبے کا ایک پائپ گنبد کے گرد گرد چاروں طرف لگا تھا جس میں ٹونٹیاں تھیں۔ لوگ ٹونٹی کھول کر گلاس، پیاسے اور ڈول بھر بھر کر دودھ کی لسی پیتے اور حیران ہوتے کہ واقعی خواجہ صاحب نے دودھ کی نہر پر چلا دیں۔ درگاہ کے سامنے سروس کے کٹے ہوئے کھیتوں میں بموقعاتیں لگا کر لوگوں نے دکانیں کھول رکھی تھیں۔ قتلے تلے جا رہے تھے۔ جھوٹے لگے تھے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل گرج رہی تھی۔ درگاہ رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی تھی۔ شہر کے علاوہ دیہات سے بھی عورتیں بچے بوڑھے اور جوان بھاری تعداد میں عرس میں شرکت کو آئے تھے۔ گنبد کی مرمریں جالیوں سے لگی عورتیں، بچے بوڑھے اور جوان دعا مانگ رہے تھے۔ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جالیوں میں اثیاں باندھ کر منتیں مانگ رہے تھے۔ میں نے

ایک جالی کی ٹھنڈی آنکھ میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ تینوں قبروں پر پھولوں کے ڈھیر لگے تھے اس قبر پر بھی جس کی جلد میں ابھی خواجہ صاحب دفن نہیں ہوئے تھے۔ لوگ اُن کی جالی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

ہماری امرتسر کی ساری کشمیری برادری، سارے رشتہ دار عرس پر جمع تھے۔ جہاں تک بچے یاد آتا ہے کسی نے بھی درگاہ کے تقدس کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مقبرے میں کون دفن ہے۔ چنانچہ اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو مقبرے کی جالیوں کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے نہیں دیکھا۔ ان بھنڈا را کھانے میں وہ سب سے آگے تھے۔ پلاؤ سے لبالب بھرے ہوئے قابوں پر وہ چن چن کر قورے کی بوتلیاں رکھوا رہے تھے۔ پھولدار قاتوں کے پاس دریوں پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے وہ جن بھوتوں کی طرح خود بھی کھا رہے تھے اور اپنے بال بچوں کو بھی مار مار کر کھلا رہے تھے۔ رات کو گیس کے مہنڈوں کی تیز روشنی میں قوالی شروع ہوئی تو ہمارے ایک رشتے دار کو حال آگیا۔ وہ لوگوں کو ٹکری مارنے لگا۔ وہ کسی کے قاب میں ہی نہ آتا تھا۔ بڑی مشکل سے چھ آدمیوں نے پکڑ کر اسے رستوں سے باندھا اور گھر چھوڑ کر آئے۔ اگلی صبح اُس کی رستیاں کھولی گئیں تو وہ پھر حال کھیلنے لگا۔

قوالی کی انہی محفلوں میں، میں نے پہلی بار مشہور شاعر حضرت بیدم وارثی کو دیکھا۔ پڑ سکون دلا چہرہ۔ مصیحا ملائم چمک والی آنکھیں۔ زرد رنگ کی چادر اوڑھے اگلی قطار میں خاموش بیٹھے تھے قوال اُن ہی کا عارفانہ کلام گا رہے تھے۔ محمد علی فریدی قوال اُن دنوں جو بن پر تھے۔ درگاہ کے کونے کونے میں اُن کی پُرسوز آواز گونج رہی تھی۔ میں اپنے خاندان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ تنہاؤں کے نیچے اُس حصے میں بیٹھا تھا جو عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ صبح کے نیچے تازہ بنا ہوا اینٹوں کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ قوالی میں میرا الکل جی نہ لگا۔ میں اپنے بھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مقبرے کے گنبد کے پاس آگیا۔ یہاں دالان کے کونوں کھدروں میں لوگ کھیل اوڑھے سو رہے تھے۔ گنبد کے اندر جہاز فالوں روشن تھے۔ بے شمار اگر بتیاں سنگ رہی تھیں جن کی بھاری خوشبو سے بہن بوجھل ہو رہا تھا۔ درگاہ کے اپنے چڑیا گھر سے موروں کے کونے کی آواز کی آہی تھیں۔ ایک۔ بوڑھی عورت مقبرے کی جالی سے منہ لگائے، آنکھیں بند کئے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دالان کے مغربی حصے میں سجادہ نشین نائب سجادہ نشین متنی، خزانچی اور سیکرٹری سجادہ نشین کے کمرے تھے جن کے باہر اردو میں اُن کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں گھومتے گھومتے ادھر کو نکل گئے ہم نے جالیوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ خواجہ صاحب گاؤں کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ بلب کی روشنی میں بڑی بڑی مونچھوں والا اُن کا سرخ و سپید بارعجب چہرہ چمک رہا تھا۔ کچھ لوگ بڑے ادب سے اُن کے سامنے بیٹھے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ ساتھ دلے کمرے کی جالیوں سے اندر جھانکنا تو ایک پھولی ہوئی توند والا موٹا تازہ آدمی گرم کشمیری شال کی ٹنگل مارے قالین پر اکیلا آلتی پالتی مارے بیٹھا زردہ اڑا رہا تھا۔ ہم یہاں سے نکل کر درگاہ کے پھولدارے چڑیا گھر کی طرف آگئے۔ دس بارہ مرے زمین کے گرد باڑھ لگا کر اندر مختلف خانوں میں مور تیر لڑے، کبوتر اور دو تین ہرن چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں بھی اوپر وسط میں ایک بڑا سا بلب روشن تھا۔ روشنی میں جانور کچھ بے چین سی دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں جنگل کے پاس اٹھا دیکھ کر ہرن آہستہ آہستہ چلتے ہمارے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی بڑی بڑی چمکتی آنکھیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ہم بڑی دیر تک اُن سے کھیلتے رہے۔ قوالی کی آواز یہاں بھی آ رہی تھی۔ اچانک پیچھے آہٹ سی ہوئی ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے امرود کے جھکے ہوئے درختوں کے گہرے سایوں میں قبریں ہی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ڈر گئے۔ اور وہاں سے بھاگ کر دالان کی رونق اور روشنیوں میں آگئے۔

رات، بجے کے بعد محفل سماع ختم ہوئی۔ خالوجان اپنا عصا لے کر ہمارے خاندان کی عورتوں اور بچوں کی ٹولی پیچھے لگے گھر کی طرف چل پڑے۔ سارا رستہ قبرستان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ مجھے بڑا ڈر آ رہا تھا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لگا چل رہا تھا۔ اور دل کو ایسی خیال سے طاقت دے رہا تھا کہ خالوجان ساتھ ہیں اور جی بھوت چڑھائیں اُن کی مطیع ہیں۔ درختوں پر اندھیرا اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت کوئی آواز نہ آئے گا اور فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہو جاتی۔ عورتیں اونچی آواز میں باتیں کر کے اپنے خوف کو دور کر رہی تھیں۔ بے تڑنگے خالوجان موٹا عصا زمین پر بار بار مارتے، بار بار کھٹکارتے کوئی بیس قدم آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی وقت بلند آواز سے وہ کلمہ شریف کا ورد کرنا شروع کر دیتے۔ خدا خدا کر کے قبرستان کا رستہ ختم ہوا ہم دروازہ گھی منڈی سے نکل کر بازار بکرواناں میں آگئے۔ اگلے روز خالوجان نے ایک من گھڑت کہانی مشہور کر دی۔ کہنے لگے۔

”رات اگر میں تم لوگوں کے ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ تم لوگوں کو قبرستان سے لے کر گزر رہا تھا کہ کھانی کے پاس پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چڑیل پل پر بیٹھی ہے اس کے بال کھلے ہیں۔ ہاتھ پیرا لٹے ہیں۔ دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی ہیں۔ مجھے دیکھ کر جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اسلام علیکم پیر جی!“

یہاں پہنچ کر خالو جان باقاعدہ اٹھ کر چڑیل کی نقل اتارتے۔ ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر چہرے پر لجاجت بھری مسکراہٹ لاکر چڑیل کے سلام کرتے کا انداز بتاتے۔

”میں نے عصا اٹھا کر چڑیل سے کہا۔ او نامراد! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے! تجھے خبر نہیں کہ چچے میرے بچے آرہے ہیں! چل دفع ہو جا میری آنکھوں سے۔ اٹھ! بھاگ! — اور چڑیل ہی ہی ہی ہی ہی ہی سلام پیر جی! کہتی اُٹنے پاؤں بھاگ کر امرودوں کے درختوں میں غائب ہو گئی۔“

رشتے دار عورتوں نے سنا تو انہیں قبرستان والی رات یاد کے پینے آگئے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد میں دوپہر کے وقت بھی قبرستان جاتے گھبرانے لگا۔

عرس کے علاوہ بھی ہم دن میں اکثر کھینے اور پتنگ اڑانے درگاہ پر جا کرتے تھے۔ باغوں میں گھس کر کچے کپے امرود توڑتے۔ کھیتوں میں جا کر مولیاں اکھاڑتے اور انہیں درگاہ کے حوض پر لاکر دھوتے اور تنک مرچ لگا کر کھاتے۔ میرے دادا جان سردیوں کی دوپہر میں عام طور پر درگاہ پر ہی گزارتے۔ وہ مقبرے کے پاس فرش پر درسی بچھا کر بیٹھ جاتے روٹی کے بھورے کر کے چڑیوں کو ڈالتے۔ پانی سے لبالب بھرا ہوا کٹورا پاس رکھ لیتے۔ چڑیاں وہاں آکر بڑی آزادی سے دانہ دُکھا چتھیں اور کٹورے پر بیٹھ کر چونچ ڈبا ڈبا کر مزے سے پانی پیتیں۔ وہ دادا جان سے ذرا بھی نہ گھبراتیں۔ دادا جان بھی ان سے بڑا پیار کرتے تھے۔ انہیں پانی پینا دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کسی وقت ان سے باتیں کرتے گئے۔ ہم دونوں بھائی گڈی اور مٹھے کرتے تو وہ انہیں سدھ کرتے۔ گڈی میں ڈور ڈالتے۔ جب ہماری گڈی یا پتنگ سرسوں کے کھیتوں کے اوپر نیلے آسمان کی ٹھنڈی ہواؤں میں لہرانے لگتی تو دادا جان ماتھے پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اُسے دیکھتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

”شاباش! ڈھیل مت دینا۔ ہوا تیز ہے۔ ڈور کس کر رکھنا۔ میرا خیال ہے انہیں طرف کتنی کھاتی ہے۔۔۔۔۔۔“

درگاہ پر دو یا تین عرس ہی ہوئے تھے کہ اُس کا زوال شروع ہو گیا۔ ایک روز میں سکول سے بستے لے کر گھر میں داخل ہوا تو خالہ جان میری والدہ کے ساتھ رانڈاری میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے بستہ ایک طرف پھینکا چنگیر میں سے روٹی نکالی ہانڈی میں سے ایک آلو ایک بوٹی نکال کر اُس پر رکھی اور وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ خالہ جان اور والدہ محترمہ کی باتوں سے معلوم ہوا کہ درگاہ شریف واسے خواجہ صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ امرتسر سے اپنا تک غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دی، مگر چونکہ والدہ فکر مند تھیں اس لئے میں بھی فکر مند ہو گیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ خواجہ صاحب کے ساتھ ضرور کوئی افسوسناک حادثہ ہوا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے بہت جلد مل گیا، کیونکہ درگاہ اُجڑنا شروع ہو گئی۔ چوکیداروں کو تنخواہ نہ ملی تو وہ درگاہ چھوڑ کر چلے گئے۔ خواجہ صاحب کے بڑے لڑکے خود پریشان تھے وہ درگاہ کی حفاظت پوری توجہ سے نہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حوض کی ٹوٹیاں اور دودھ کی نہروں واسے تانبے کے پائپ اکھاڑ کر لے گئے۔ رشید لالہ اگر مقبرے میں سے جھاڑ فانوس اتار کر خواجہ صاحب کے گھر نہ پہنچائے تو لوگ وہ بھی اتار کر لے جاتے۔ سجادہ نشین، نائب سجادہ نشین، خزانچی اور متولی کے کمروں سے حالی دار دروازے بھی راتوں رات چوری ہو گئے چڑیا گھر کے کبوتر، طوطے اڑ گئے۔ موروں کو قبرستان کے جنگلی بٹے کھا گئے۔ کیونکہ اب رات کو ان کی چوکیداری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا ایک روز دونوں برن کھول کر گھر لے گیا۔ دروازے ان کا پچنا بھی محال تھا۔ خواجہ صاحب کی درگاہ اور ان کے خاندان پر زوال آگیا۔ میں کبھی کبھی ان کے گھر جاتا تو وہاں والدین میں سناٹا مچا یا ہوتا۔ دو منزلہ بڑا اونچا لمبا حالی دار دروازوں اور نیم روشن ٹھنڈے کمروں پرانے دکھوڑے صوفوں اور جہریوں قد آدم آئینوں اور پرانی طرز کی روغنی تصویروں والا گھر تھا۔ کبھی وہاں کشمیری عورتوں اور لڑکیوں کی مسرور کھانسی گونجا کرتی تھیں اور اب وہاں خاموشی طاری ہوتی۔

ایک روز دوپہر کو میں ڈور پتنگ سے کر درگاہ پر گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ سامنے کھیتوں میں پہلی بکلی سرسوں بھولی ہوئی تھی۔ درگاہ کے مکن میں دیران مقبرے کے پاس درسی کا ٹکڑا بچھائے دادا جان اُسی طرح بیٹھے چڑیوں کو روٹی کے بھورے ڈال رہے تھے۔ چڑیاں شور مچاتی ان کے کندھوں، سر اور زانوں پر آکر بیٹھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ سے بھورے چھین کر لے جا رہی تھیں۔ اور دادا جان ہنس ہنس کر ان کے تکیوں پر ان میں باتیں کر رہے تھے۔ سامنے کی طرف سجادہ نشین اور نائب سجادہ نشین کے اُجڑے ہوئے ٹھنڈے بچے کمروں کے باہر دھوپ میں خواجہ صاحب کا بڑا لڑکا چنگیر میں تنور کی روٹی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک

ہاتھ میں مونی تھی۔ وہ خشک مولیٰ سے تور کی روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس بات کو جانے کتنے برس بیت گئے ہیں۔ لیکن یہ عبرت انگیز منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ وہ نائب سجادہ نشین تھا جو سرس کے موقوفوں پر اپنے ہاتھ سے پلاؤ اور بریانی کے ٹٹت بھر بھر کر رشتے داروں کے گھر پہنچا یا کرتا تھا۔ اُس کا چہرہ بھرا بھر گول مٹول ہوتا تھا۔ اب وہ چہرہ اتر گیا تھا۔ رخساروں کی بڑیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا۔ میں ڈورا اور پتنگ ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز بڑی مشکل سے روٹی کے خشک ٹوٹے نگل رہا تھا۔ ایک چڑیا چوں چوں کرتی میرے سر پر سے اٹتی ہوئی دادا جان کے کندھے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دادا جان کی یہ عادت تھی کہ جب چڑیا اُن کے کندھے یا سر پر آگ بیٹھتی تو وہ ساکت ہو جاتے اور زیادہ نہیں ہلا جلا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا دادا جان بہت بنے بیٹھے ہیں۔ اور بڑے مکیوں سے چڑیا کو دیکھ دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔

آج پچیس برس بعد مجھے اُس چڑیا کی یاد آئی ہے۔ کیا وہ گندمی چوڑے اور بھولے بھالے چہرے والی معصوم چڑیا زندہ ہوگی؟ وہ تو مجھے بھول گئی ہوگی، لیکن میں نے اُسے نہیں بھلایا۔ شاید وہ بھی مجھے نہیں بھولی ہوگی۔ پرندے کبھی محبت کرنے والوں کو نہیں بھولتے۔ وہ انہیں زندگی میں بھی یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کا انتظار کرتے ہیں۔ کسی حیرت انگیز بارغ میں۔ اُس بارغ کے حسین ترین دھڑکن میں۔ شفاف پانی والی نہروں کے کنارے۔ ان دیکھے سفید پھولوں کی دایلوں میں اور۔۔۔ تم اشد کی کن کن نعتوں کو جھٹلاؤ گے؟ درگاہ کے عرس، اُس کی رونقیں اُس کی روشنیاں بکھریں گیں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں کو اُس کے صحن میں گھبرایاں دوڑتی ہوئی اور اُس کے سجادہ نشینوں کے تاریک دیوان خانوں میں لپکتے جانوں والی چتروں کے نیچے منگ چرس، بھنگ پی کر رہتے۔ وقت اس درگاہ کے ایوانوں میں زوال کے جالے بنتا گزرتا چلا گیا۔

پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ ہر ترس کو بھڑکتے شعلوں کے پیر و کر کے اپنے نئے شہر، نئے وطن میں آگئے۔ چھ یا شاید پانچ برس بعد یوم اقبال کے موقع پر جاتہ صبر میں پاکستانی اٹنی کشن کی جانب سے ایک زبردست شاعر ہوا جس میں لاہور کے معروف شعرا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ لوگ میرے دوست تھے پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ جاتہ صبر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ دل میں یہ خیال تھا کہ جیسا کہ میرا اُسے امرتسر کے کمپنی بارغ، ریا لٹو سینما، مینگو پارک اور دروازہ مہان سنگھ کے باہر والے بارغ کے یوگپش کے درخت سے ملتا ہوا جائے گی۔ جاتی دفعہ ہم لاہور سے سیدھا جاتہ صبر چلے گئے۔ واپسی پر جاتہ صبر سے امرتسر آتے ہوئے بس

تحصیل پورے کے پاس پہنچی تو میں وہیں اتر گیا۔ جانے کس شاعر نے کہا۔

”اے حمید! تمہیں راستہ معلوم ہے ناں؟“

میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ قیوم نظر کی آواز آئی۔

”یہ اُس کا اپنا شہر ہے۔ وہ راستے کیسے بھول سکتا ہے؟“

میں جلتے کتنی دیر سگریٹ پر سگریٹ پیتا، دیران، اور اجنبی امرتسر کے بازاروں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مہان سنگھ دروازے والے یوگپش کے درخت سے ملا۔ اس تاریخی ملاقات کا حال میں اس مضمون کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔ تیسرے پہر میں برنج پھولا سنگھ کے قریب سے ہو کر قبرستان کی سڑک پر اتر گیا۔ قبروں پر پل پھیر دیا گیا تھا۔ جہاں کل قبروں پر اگر تیاں سلگتی تھیں۔ چراغ جلتے تھے، آج وہاں مکئی کے کھیت تھے اور بعض جگہوں پر سننے مکانوں کی بنیادیں کھڑی تھیں۔ لوکاٹ اور امرود کے بارغ اُجڑ گئے تھے، کیونکہ امرتسر میں باغبانی مسلمانوں کے پاس تھی۔ میں نے کسی ہندو اور کسی سکھ کو باغبانی کرتے نہ دیکھا تھا۔ اب میں درگاہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس کھائی کے پاس سے گزرا جہاں خالو جان مرحوم کے بیان کے مطابق انہیں اُلٹے ہاتھ پاؤں والی چڑیل ملی تھی۔ اس کھائی کا پل آدھا ڈھس گیا تھا۔ اُن ندی نالوں کا نام نشان تک باقی نہ تھا جو تاشپاتی اور امرود کے باغوں کی آبیاری کیا کرتے تھے۔ اسی قبرستان میں ایک عورت کی قبر تھی جس پر سنگ مرمر کی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہ خوبصورت قبر مرمر کے خاوند نے بڑی محبت سے بنوائی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محبت کرنے والے خاوند نے سنگ مرمر پر اپنی بیوی کی یاد میں بڑے ہی درد انگیز شعر کندہ کرائے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُجڑے ہوئے قبرستان میں یہ سنگ مرمر کی بارہ دری والی قبر جوں کی توں موجود تھی۔ اب میں درگاہ کی طرف چل پڑا۔ اب میں درگاہ کے سامنے تھا، لیکن وہاں درگاہ نہیں تھی۔ نہ والان۔ نہ چہترہ۔ نہ کمرے نہ سجادہ نشینوں کے دیوان خانے اور نہ مقبرہ۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے گیند کی آدمی دیوار تھی جس پر تھاپیاں نیچے سے اوپر تک لگی ہوئی تھیں۔ جہاں سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک گائے بندھی تھی۔ جہاں نائب سجادہ نشین کا کمرہ تھا وہاں ایک جٹا دھاری سادھو بیٹھا، انگ بھجوت رماے چرس کے سوتے لگا رہا تھا۔ اور جہاں کبھی دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں وہاں آگ اور تھوہر کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ دیکھا گیا۔

ہاں۔۔۔ پلٹے ہوئے میں نے ایک نظر اُس طرف دیکھا جہاں دادا جان درمی پر آلتی پالتی مارے

بیٹھے چڑیوں کو بھڑے ڈالا کرتے تھے۔ چڑیوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ اور جیب کوئی چڑیا اُن کے کندھے پر بیٹھ جاتی تو اُس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ وہاں کوئی چڑیا نہیں تھی۔ کوئی داوا جان نہیں تھے، لیکن ایک بڑی ہی پیاری آنکھوں والی گھری، شیشم کے پتوں پر بیٹھی، سورج کی تابناک روشنی میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

الوداع! میری پیاری گھری! میری پیاری چڑیا! میری پیاری بہنو!

امرتسر اور سیب کا درخت

میں نے اپنی نہر کے کنارے گنجان ٹاہلیوں کے سائے میں کھڑا ہوں۔ میری بائیں جانب ڈھلان پر اینٹوں کا وہ چبوترہ ہے جہاں میجر عزیز بھٹی ٹینک کا گولہ لگنے سے شہید ہوا تھا۔ میں اس نہر پر پہلے بار آیا ہوں۔ آج سے انیس بیس برس پہلے میں نے پاکستان ٹائمز میں اس نہر کی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں لاہور کے طلباء، دیہات کے لوگ اور شہر کی کڈالیں اور بھاڑے چلاتے اس نہر کی کھدائی کر رہے تھے۔ ٹی ٹاؤس میں بیٹھے ہوئے دوستوں نے اس نہر پر معمولی سا تبصرہ کیا اور پھر ڈورس ڈسے کی سحر انگیز آواز اور ولیم فاکز کے تازہ ترین ناول پر باتیں شروع ہو گئیں۔ دوسری دفعہ میں نے اس نہر کو اُس وقت دیکھا جب میں پاسپورٹ جیب میں رکھے امرتسر جاتے ہوئے اس کے پل پر سے گزر رہا تھا۔ چوڑی چمکی لبالب، سست رفتاری سے بہتی ہوئی ایک پر وقار نہر۔ میں اس سے بڑا متاثر ہوا اور مجھے امرتسر کی بڑی نہر یاد آگئی۔ ام کے گنجان درختوں کی دورویہ قطاروں کے بیچ میں سے گزرتی ٹھنڈے پہاڑی چشموں کے پانی سے بھری ہوئی نہر۔ جہاں پر مٹی جوں کی چھلکتی دوپہروں میں نہانے جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی امرتسر نہروں سے بھرا پڑا تھا اور ہمارا بچپن نہروں میں چھلایا لگاتے گزرا تھا۔ بڑی نہریں، چھوٹی نہریں اور پھر اُن سے نکلے ہوئے نالے جو اکوچے، تارخ اور لوکاٹ کے ٹھنڈی چھاؤں والے باغوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ میں امرتسر کی بڑی نہر یاد کرتا ہی اُنہی کے پل سے گزر گیا اور بی آر بی کو بھول گیا تھا۔ میرا دل امرتسر کی یاد سے لبریز تھا۔ وطن سے ہجرت کرنے کے بعد پہلی بار امرتسر عا رہا تھا۔ امرتسر جو کبھی میرا وطن تھا۔ جس کے گلی کوچوں کی خاک میں ابھی تک میرے پاؤں کے نشان تھے اور جس کی خاموش فضاؤں میں کھنڈر بنی مسجدوں کی آوازیں کی آوازیں مچو خواب تھیں۔ جس کے مکانوں کی نیم تاریکی ڈیوڑھیوں میں پہنائی یادوں کے سائے

لہذا رہے تھے۔ جس کے ہاتھوں کے درخت اپنی شاخیں ہلاتے ہوئے آج بھی ہماری یاد میں بے قرار ہیں اور ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ امرتسر۔ جہاں کبھی سورج ہمارے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ سچے گلاب کے پھول بھی کپنی بارغ میں داخل ہوتے دیکھ کر کھل اٹھا کرتے تھے کہ ہم چلا نگیں لگا کر انہیں پکڑ لیں۔ میری بس داگہ چیک پوسٹ کی طرف آگے نکل گئی اور بی آر بی جیسے رہ گئی۔ امرتسر سے واپسی پر میں ایک بار پھر بی آر بی کے پٹی پر سے گزرا اور بس کی کھڑکی میں سے سگریٹ سگاتے میں نے یونہی ایک سرسری نظر سے نہر کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ جس طرح ریل میں بیٹھا مسافر اس چھوٹے سے شیش کی عمارت کو دیکھتا ہے جہاں ریل رُکے بغیر تیزی سے نکل جاتی ہے، لیکن آج بی آر بی نہر ایک زندہ پُر نور اور برگزیدہ ہستی کی طرح میرے سامنے سے گزر رہی رہی ہے اور کھڑی بھی ہے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ایک عظیم ماں کے حضور میں کھڑا ہوں جس کی وجہوں نے مامتا بھری بانہیں پھیلا کر اپنے بیشتر بچوں کی خون آلود مقدس لاشوں کو اپنے سینے سے لگایا ہے۔ ماں کی آنکھیں اُداس ہیں، مگر چہرے پر ایک جلال ہے، بڑا شکوہ عظمت ہے۔ گویا ایک روشن ترین سورج ہے جو رات کو طلوع ہو رہا ہے۔ میں بی آر بی نہر کے کنارے، عظیم ماں کے حضور میں سر جھکاٹے کھڑا ہوں اور — اور نہر کی طرف سے آنیوالی ٹھنڈی ہوا میں ماں کے پیار کا لمس محسوس کر رہا ہوں ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اس خاموشی میں نہر کا پانی ایک دھیمی سی سرسراہٹ کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے گویا پُر جلال نورانی چہرے والی ماں مجھ سے خاموشی کی زبان میں باتیں کر رہی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو اپنے اتم میرے کنارے چپ چاپ کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا تم نے اس روز مجھے دیکھا تھا جب بھارتی ٹینکوں اور توپوں کے گولے آگ برساتے میرے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جب میرے بچے اپنی ماں کے ناموس کو بچانے کے لیے حملہ آور دشمن کے ٹینکوں سے ٹکرا گئے تھے۔ ماں! میں نے اپنے بچوں، پاک فوج کے غازیوں کے جھگمگاتے نورانی چہرے دیکھے ہیں۔ میں نے دشمن کے آگ و آہن کے طوفان میں چلا نگیں لگاتے ہوئے آن کے اللہ اکبر اور یا علیؑ کے نعرے سنے ہیں۔ میں نے موت کو اُن کے آگے بھاگتے دیکھا ہے اور آسمان سے اُن پر پھولوں کی بارش برستے دیکھی ہے۔ وہ ماں کے لعل تھے۔ بہنوں کے ہیرے موتی تھے۔ بیویوں کے سہاگ تھے اور اپنے بچوں کے پیارے ابو تھے۔ اُن کے سروں

کے سائے تھے، لیکن اس وقت وہ اللہ کے خیر تھے۔ کاش، تم نے دشمنوں کے جنگل میں اُن شیروں کی دل ہلا دینے والی دائیں سنی ہوتیں۔ وہ اللہ کے سپاہی تھے۔ کاش، تم نے اُن اللہ کے ہی سپاہیوں کو اللہ کے دین کی عزت، غیرت اور حرمت پر شہید ہوتے دیکھا ہوتا کہ بندہ مومن کا لائق اللہ کا لائق کیسے بنتا ہے اور پھر اُس کی ضرب کا رکشا، غالب و کار آفریں کیسے ہوتی ہے، مگر تم تو محض نہر کو دیکھ رہے ہو۔ اُس روز اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے بھی دیکھتے۔ اُس پاک جہیں مقدس ماں کو دیکھتے جس کی حرمت کے لیے پاک فوج کے نرود کی آگ میں بے خوف و خطر جھپٹتے مسکراتے۔ اللہ اکبر اور یا علیؑ کے فلک شکاف نعرے لگاتے گزر رہے تھے۔ اُس روز تم اس عالم فانی کا سب سے بڑا معجزہ دیکھتے۔ تم آگ کو گزرا میں بدلتے اور موت کو زندگی کا روپ دھارتے دیکھتے۔ تم دیکھتے کہ قرآن کے اوراق میں جب بندہ مومن کا خون گردش کرنے لگتا ہے تو دشت و جبل اُس کی ہلکارت کی طرح تھر تھرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی عجیب گھڑی تھی۔ وہ بڑی عظیم گھڑی تھی تاریخ کے چودہ سو سال سمٹ کر میدان بدر اور میدان کربلا میں چلتی تواروں کے سایوں میں آگئے تھے ایک جانب وہی جبر و استبداد کی یلغار تھی اور دوسری جانب وہی ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن کی عظمت کی ہلکارت۔ ایک طرف شرار بولہبی کا جہنم تھا اور دوسری طرف چراغ مصطفویؐ کی قلم و استبداد کے اندھیروں کو بھاڑ دینے والی ضیا پاشیاں۔ کفار کی عبرت انگیز ہلاکت تھی اور بندہ مومن کی ایمان افروز شہادت مشین گنوں اور رائفوں پر جیسے ہوئے ہاتھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والی تلوار اپنے چودہ سو سالہ نیام میں سے کوندے کی طرح لپک کر باہر نکل آئی تھی اور کفر و الحاد کی گھاؤں کو پاش پاش کر رہی تھی۔ قرآن کی تلاوت کی باجبروت آوازیں تھیں اللہ اکبر اور یا علیؑ جیدر کے نعرے تھے مجھے اپنے آپ پر نہر فرات کا گمان ہونے لگا تھا جس کے کنارے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے دین کا پرچم سر بلند کرنے کے لیے کفر کی طاقتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ میں نہر فرات کی ریگ کے ایک ذرے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں نہر فرات نہیں تھی، مگر میں نے تیرے مومنوں کو تیرے نام کی عظمت کی خاطر پُر سکون، پُر جلال، پُر نور چہروں کے ساتھ شہید ہوتے ضرور دیکھا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور و کشائی

لیکن میرے بیٹے اُس روز تم کہاں تھے؟

اور میں نے سوچا کہ میں چھ ستمبر کو کہاں تھا! چھ ستمبر کی صبح کا سورج میں نے کوہ مری کی پہاڑیوں میں طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنے سنی بینک والے کالج سے نکل کر محکمہ ترقی اثمار کے ذخیروں کی طرف آگیا تھا۔ اس محکمے نے پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ ہسپانوی، ملائکہ اور فرانسیسی سیب کے درخت لگا رکھے ہیں۔ میں نے نیچے گڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے اکثر ان درختوں کو ڈھیلان کے ساتھ ساتھ دیکھا تھا۔ شاخوں میں لال لال سیب دھوپ میں چمکتے نظر آیا کرتے تھے اور مجھے بے اختیار گالز روڈ کی کاٹول "سیب کا درخت" یاد آجاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نرم گرمی آواز اور پرسکون باغیاں آنکھوں والی میگوں کا خیال بھی جس نے ایشرسٹ سے محبت کی ریشٹ اور میگوں چٹنے کے پاس سیب کے درخت کے نیچے چاندنی راتوں میں ملا کرتے تھے۔ میگوں کے تھے منے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے اور ایشرسٹ انہیں چوم کر گرم کیا کرتا اور پھر ایشرسٹ اُسے چھوڑ کر شہر چلا گیا بیٹھ ہمیشہ کے لیے۔ میگوں اُسے نہ بھلا سکی۔ وہ چاندنی راتوں میں سیب کے درخت سے جا کر گھڑی ہو جاتی اور چٹنے کے پانی میں چاند کو طلوع ہوتے دیکھتی رہتی اور پھر ایک روز گاؤں والوں کو اسی سیب کے درخت کے نیچے میگوں کی لاش ملی۔ وہ چٹنے کے سرو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے نہری ریشی گیلے بال کافی زدہ پتھروں میں الجھے ہوئے تھے۔

گڈنہ روڈ پر سے گزرتے ہوئے میں جب بھی اوپر ڈھلان کی طرف نگاہیں اٹھا کر سیب کے درختوں کو دیکھتا تو مجھے یوں لگتا جیسے مجھ سے دالی پاک دل میگوں سیب کے درخت کے ساتھ لگی آداس نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

چھ ستمبر کی صبح کے لیے میں نے پنڈی جانے والی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس میں سیٹ بک کر دار کھی تھی۔ میں ستمبر میں مری مزدور جاتا ہوں۔ یہی وہ دن ہوتے ہیں جب مری کے خوشبودار میٹھے سیب چلتے ہیں۔ ٹائر سُرخ ہو جاتے ہیں ٹکوں میں بے دھڑک پانی آجاتا ہے اور مری کی سڑکیں زرد رو عبرت انگیز چہروں والے لوگوں سے خالی ہو جاتی ہیں۔

یہ چھ ستمبر کی صبح تھی۔

پو پھٹنے والی تھی۔ موسم سرد تھا۔ میں جانے سے پہلے سیب کے درختوں سے مزور ملنا

چاہتا تھا، چنانچہ میں نے پل اوڑھ بیٹھا اور کمرے کے دروازے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا چیرٹھ کے درختوں میں گھری ہوئی پہاڑی پگ ڈنڈی پر چل پڑا۔ مکنی کے کھیتوں کے گرد باڑھ لگی تھی اور مکنی کے بند بھٹوں پر سے اوس کی بوندیں گھاس پر گر رہی تھیں۔ مشرق کی جانب کچھ دیر بعد طلوع ہونے والے سورج کی ہلکی ہلکی چٹکیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ آسمان پر ستارے چاندی کے پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک بے حد روشن نہری بڑا سا ستارہ چیرٹھ کے جھنڈ کے بالکل اوپر دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ درختوں کے اوپر چمک کر نیچے کچھ دیکھ رہا ہے۔

اُس وقت بھارت کی فوجوں نے پاکستان کی سرحد پر پانچ گنا بڑی طاقت کے ساتھ حملہ کر دیا تھا اور اُس کی بکتر بند گاڑیاں بہتے دیہاتیوں پر گولیاں پلاتی پاکستان کے سرحدی گاؤں میں گھس آئی تھیں۔

ذخیرے والے سیب کے درختوں میں اندھیرا تھا۔ اسی ذخیرے کی طرف سے شبنم اُلوو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے جن میں سیب کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی تھی۔

میں اُس درخت کے نیچے اکر کھڑا ہو گیا جہاں میں نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے اکثر جھوٹے میگوں کو دیکھا تھا۔ یہ درخت دوسرے درختوں سے پھیلاؤ میں بڑا تھا اور اُس کی مکنی شاخیں سُرخ سُرخ سیبوں سے لدی تھیں۔ تنے پر انگریزی میں لکھی ہوئی ایک تختی لگی تھی جو اندھیرے میں پڑھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے میگوں کو یاد کر کے آنکھیں بند کر لیں اور گہرا سانس لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں میٹھے سیب کی سرلوب خوشبو پی رہا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر سیب کے درخت کا گمان ہونے لگا اور پھر میں نے اپنے تھے پر میگوں کے پاکیزہ جسم کا گرم لمس محسوس کیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں مجھے یقین تھا اگر میں چند لمحوں آنکھیں نہ کھولتا تو میرے جسم سے ہری ہری شاخیں پھوٹ پڑتی اور سیبوں کے گلابی شگونے کھل اُٹھتے۔ میں نے درخت کے تنے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ میگوں نے اپنے ننھے منے ٹھنڈے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اُس کی ہتھیلی چوم کر گوشی میں کہا۔

"الوداع میگوں!"

اُس وقت پاک فوج کے جیالے سپاہی وطن پاک کی حفاظت کے لیے دشمن کی آگ لگتی

توپوں اور ٹینکوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

والداع میگن! میرے پیارے سیب کے درخت! میرے سرخ سرخ سیبوں کے لرے ہوئے درخت تو نے میرے وطن کی مٹی سے منحاصل کی ہے۔ میرے وطن کے سورج سے رنگ لیا ہے اور میرے وطن کی راتوں سے شبیم کی شیرینی لی ہے۔ تو سدا بھلا بھولا رہے۔ اگلی بہار تک کے لیے والداع! میں پھر آؤں گا۔ جب تیری ٹہنیاں گلابی شکوفوں سے لدی ہوں گی اور سیاہ بھنورے اپنا مٹھا رنگ الاپ رہے ہوں گے۔

مشرق کی جانب سورج کی اولین سنہری روشنی نمودار ہو رہی تھی اور پھر ایک بے حد روشن کرن شعاع نور بن کر آسمان پر پھیل گئی اور سینی بینک کے درختوں، مکئی کے لہلہاتے پودوں کے سرے ڈنٹھل اور ڈھلاؤں پر آگی ہوئی گھاس اور گھاس میں بکھے ہوئے بنفشہ کے پھول تصویر بن کر سامنے آ گئے۔ میں پہاڑ کی شفاف، ہنرے اور پھولوں کی جھک سے لبریز پاکیزہ ہوا میں سانس لیتا واپس اپنے کاٹھ کی طرف چل پڑا۔ صبح ہو چکی تھی اور مری کے پہاڑی کاٹھ سفید دھوپ میں چمک رہے تھے کہ میں بس کے انتظار میں سینی بینک پوسٹ آفس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں بس آگئی اور میں ہنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اُس وقت لاہور توپوں اور بموں کے دھماکوں سے ہل رہا تھا، لیکن مری کے قرب وجوار میں مکئی کے کھیت صبح کی دھوپ میں لہلہا رہے تھے۔ یہاں کسی کو ابھی تک کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی اس سے پہلے آزاد کشمیر کی مجاہد فورس کی فتوحات کی خبریں لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ لیکن بھارت لاہور پر حملہ کر دے گا، یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس راولپنڈی کی طرف آڑی جا رہی تھی۔ بس بولے بولے گرم ہونا شروع ہو گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی شاندار بھول کے ایئر کنڈیشننگ کے بیٹھے ہوں کہ اس کا ایئر کنڈیشنر خراب ہو کر بند ہو جائے اور کمرے کی ٹھنڈی فضا آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گئی ہو۔ کمپنی بارخ اور ٹریٹ سے نیچے اتر کر بس میدانوں میں آئی تو گرنی اپنے پودے جو بن پر آگئی۔ میں نے اپنے بیگ کے اندر پرانے کپڑوں میں ہاتھ ڈال تو وہ ابھی تک ٹھنڈے تھے۔

بس راولپنڈی پہنچ گئی۔ یہاں بھی ابھی تک کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ میں اپنے دوست کی تلاش

میں دو گئی لی ہاؤس پہنچا۔ ہم نے چلے پی۔ مری اور لاہور کی باتیں کیں اور پھر ریوے سٹیشن پر آ گئے میں دوپہر کو پنڈی سے لاہور جانے والی ریل کار میں سیٹ بک کرانا چاہتا تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ لاہور سے ابھی تک وہ ریل کار بھی نہیں آئی جسے صبح آنا تھا۔ بنگلہ کرک نے بتایا کہ دھونکل شریف کے سٹیشن پر بھارت کے ہوائی جہاز نے ریل گاڑی پر بم گرایا ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کی آمد و رفت رگ گئی ہے۔

اب بھی کچھ تشویش ہوئی۔ جس وقت ہم واپس صدر رہنچے تو سارے راولپنڈی شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اور صدر پاکستان ابھی چٹلچوں میں قوم سے خطاب کرنے والے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے فلمی گانے بند کر دیئے گئے تھے اور ملی ترانے بجائے جا رہے تھے۔ ہم چوک میں ایک پنوڑی کی دکان کے آگے کھڑے ہو گئے لوگوں کا بے پناہ ہجوم جگہ جگہ ریڈیو کے گرد جمع تھا۔ پھر صدر پاکستان نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کے بعد قوم کو بتایا کہ بھارت نے رات کے اندھیرے میں یزدلوں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ اس نے کس قوم کو لٹکا رہا ہے۔ ہم کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن کی یلغار کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کر بڑھیں گے اور اُس وقت تک بڑھتے چلے جائیں گے جب تک کہ دشمن کی توپوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا نہیں کر دیتے۔

صدر پاکستان کی تقریر کے بعد پنڈی کی فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ میں نے دیکھا کہ پنڈی کے لوگوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر جوش اور دشمن کو طامیٹ کر دینے کا عزم تھا۔ اب میرا لاہور پہنچنا بڑا ضروری ہو گیا تھا۔ ریڈیو پاکستان کو میری ضرورت تھی۔ لاہور کو میری ضرورت تھی۔ وطن پاک کو میری ضرورت تھی۔ بڑی مشکل سے مجھے لاہور جانے والی ایک بس میں سیٹ مل گئی۔ بس ساڑھے پانچ بجے پنڈی سے روانہ ہوئی۔ پانچ بجے کی خبروں میں شکیل احمد نے گرجدار آواز میں بتایا تھا کہ حملہ آور دشمن کا لاہور پر حملہ پا کر دیا گیا ہے اور وہ لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹے پر مجبور ہو گیا ہے۔ میرا دل ایک عجیب پُر جوش جذبے سے لبریز ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۷ میں مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت میں اپنے لیے ایک علیحدہ وطن پاکستان حاصل کیا تھا۔ برسوں کے سینے پر اُس وقت سے سانپ لوٹ رہا تھا۔ سترہ سال کے بعد اس نے

اپنے زعم میں پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لیے حملہ کر دیا تھا اور پاکستانی قوم کی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔

”خدا ہمیں اس آزمائش میں سرنج رو کرے۔ آمین!“

میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ ہم انشا اللہ اس آزمائش میں پورے اتریں گے ہم نے پاکستان لاکھوں جانوں کی قربانی سے حاصل کیا ہے ہمارے بچے پڑے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں اور مکانات کی دہلیزوں اور کھیتوں اور میدانوں میں ابھی تک ہمارے عزیزوں بھائیوں اور ماؤں بہنوں کا خون جما ہوا ہے ہمارے کانوں میں ابھی تک ہندو سکھوں کی تلواروں سے شہید ہوتے ہوئے معصوم بچوں کی چیخوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کے مکانات سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان شعلوں میں ہمارے بچوں کی لاشیں جل رہی ہیں۔ ہم نے اپنے بچے قربان کر کے پاکستان حاصل کیا ہے۔ ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے، مگر پاکستان پر حق نہ آنے دیں گے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اللہ کے نام پر، اس کے دین کی بقا کے نام پر بنا ہے۔ ہم اسلام اور اللہ کے دین کی حفاظت کریں گے۔ زندہ رہے تو غازی۔ مر گئے تو شہید۔

بس لاہور کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

گوجران سے آگے نکلے تو اندھیرا بڑھنے لگا۔ شام غروب ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر طرف بلیک آؤٹ تھا۔ گوجران سے کوئی سات میل آگے آئے ہوں گے پولیس نے بس روک لی اور راولپنڈی جانے کو کہا، کیونکہ پوری جی ٹی روڈ پر نہ صرف بلیک آؤٹ تھا بلکہ کرفیو بھی لگا تھا۔ مسافروں کے چہرے لٹک گئے۔ ایک کاروباری آدمی اپنی بیوی کیساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ لاٹ پور روڈ کی طرف سے لاہور چلے، پٹرول کا سارا خرچہ وہ خود ادا کرے گا، مگر ڈرائیور رخصت نہ ہوا۔ بس والی گوجران کے اڈے پر آکر کھڑی ہو گئی ڈرائیور نے گوجران تک کے پیسے کاٹ کر باقی پیسے سواروں کو واپس کر دیئے۔ میں نے سوچا کہ گوجران ریلوے اسٹیشن سے کوئی ٹرین پکڑ کر لاہور پہنچ جاؤں گا، چنانچہ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کہیں کسی جگہ بھی کوئی لائٹن یا بجلی کا بلب نہیں جل

رہا تھا۔ ایک پراسرار، خفیف سی دہشت چاروں طرف اندھیرے میں منڈلا رہی تھی۔ لوگوں کے حوصلے بلند تھے، لیکن بہر حال دشمن نے ملک پر حملہ کر دیا تھا۔ قوم پر امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ شہادت کا وقت آگیا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں، کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔

بلنگ لڑکے اوٹ میں سختی سی موم بتی جلا کر کھڑکی میں بیٹھا۔ اس نے مجھے لاہور کا ٹکٹ دیا۔ کوئی گاڑی کب لاہور کو جا رہی تھی؟ کچھ خبر نہ تھی۔ میں پلیٹ فارم پر آکر ٹھہرنے لگا۔ تمام بچے رُکے ہوئے تھے۔ آسمان پر تارے چمکنے لگے تھے جی کی دھیمی روشنی میں ریلوے لائن دُور تک اندھیرے کے غار میں گم ہوتی نظر آرہی تھی۔ ایک مٹری ایکسپریس آئی اور بغیر رُکے لاہور کی طرف تیزی سے نکل گئی۔ اب اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر بیٹھے جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ٹی ٹال پر میں نے چائے کے ساتھ دو سلائیس کھائے اور سگریٹ سلا کر ٹھہرنے لگا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ میں تھک گیا اور ایک کھبے کے ساتھ لگ کر پلیٹ فارم پر جا بیٹھا مجھے نیند آنے لگی اور میں پلیٹ فارم ہی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے ۱۹۴۷ کے وہ دن یاد آگئے جب ہم ہاجرین کرامتسر سے لاہور آئے تھے اور میں نے ایک رات وزیر آباد کے ریلوے پلیٹ فارم پر سو کر گزاری تھی۔ میرا حوصلہ اُس وقت بھی بلند تھا۔ مجھے اپنی بہادری پر کامل یقین تھا اور اپنی فوج کی شہادت سے بھی میں بے خبر نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ برصغیر کی مسلمان قوم ایک جبری اور بہادر قوم ہے، کیونکہ وہ سوائے خدا کے اور کسی سے نہ ڈرتی ہے اور نہ محبت کرتی ہے۔ میں نے اپنی بہادر فوج کے جوانوں کو برما، العالمین اور طبروق کے فرنٹ پر بہادری کے جوہر دکھاتے دیکھا تھا اور آج تو وہ دشمن کے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کا عزم ہے کرواہہ فرنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آج تو قوم کا بچہ بچہ سپاہی تھا اور محاذ پر جا کر اپنی آن پر مرنا چاہتا تھا۔

پونے بارہ بجے کے قریب راولپنڈی کی جانب سے ایک ٹرین آئی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں کافی رش اور اندھیرا تھا۔ گاڑی تھوڑی دیر رُکنے کے بعد لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند بنگالی سپاہی بھی ہمارے ڈبے میں سوار تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے

سے جنگ میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک بنگالی جوان نے اونچی آواز میں نعت پڑھنی شروع کر دی نعت کا بھیدیوں کھلا کہ وہ ہر بار گاتے گاتے شعر کے آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ضرور کرتا۔ جہلم پہنچتے پہنچتے ہماری گاڑی کئی بار رکی اور فوجی گاڑیوں کو راستہ دینا پڑا۔ اب دن نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے جنگلی جوانوں کو دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس مہنس کر لطیفہ بازی کر رہے تھے۔ اب جو میں نے جی روڈ کی طرف نگاہ کی، کاروں، ٹیکسی کابوں، سکوتروں اور لیوں کا ایک ہجوم پنڈی پشاور کی طرف نرواں تھا۔ میں سمجھ گیا لاہور کے سرمایہ دار اپنی کوٹھیاں اور عالی شان بیڈ روم چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔

گاڑی دھونکلی سٹیشن پر سے گزری ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں بھارت کے ہوائی جہاز نے مسافر گاڑی پر بم گرایا تھا۔ اور جس میں مس طوسی شہید ہو گئی تھی۔ وہاں لائن ٹیرھی ہو گئی تھی اور زمین میں سیاہ گڑھا پڑ گیا تھا۔ گوجر توالہ کے قریب میں نے دیکھا کہ ایک مسافر گاڑی لاہور سے چلی آ رہی ہے جس میں اس قدر رش ہے کہ اس کی چھت پر بھی لوگ سوار ہیں۔ یہ سرحد کے ان دیہات کے لوگ تھے جنہیں بھارتی حملہ آوروں نے تباہ کر دیا تھا۔ گاڑی ہمارے قریب سے گزری تو میں نے ڈبوں میں ایک دوسری کے اوپر بیٹھی ہوئی دیہاتی عورتوں کے پسینے بھرے زرد چہرے دیکھے اور گرمی اور حبس کے مارے روتے بچوں کو دیکھا۔ مجھے وہ مہاجرین ٹرینیں یاد آ گئیں جو ۱۹۴۷ء میں امرتسر جالندھر لدھیانہ روہتنگ اور جھسا سے لاہور آیا کرتی تھیں۔ جن پر راستے میں سکھ اور ہندو غنڈے حملہ کر دیتے تھے اور لاہور سٹیشن پر عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نہتے جوانوں کی خون میں نہائی ہوئی کٹی پھٹی لاشیں ڈبوں میں سے نکالی جاتی تھیں۔

مجھے آج بھی وہ منظر یاد ہے۔ میں لاہور سٹیشن کے اندر پلیٹ فارم نمبر چار اور پانچ کے پل پر کھڑے نیچے دیکھ رہا تھا۔ فیروز پور سے مسلمان مہاجرین کی ایک گاڑی ابھی ابھی آ کر رکی تھی اور اس میں سے مسلم لیگ کے رضا کار عورتوں اور بچوں کی لاشیں باہر نکال رہے تھے۔ میں نے ایک مسلمان عورت کو دیکھا جس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو تھوڑے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ نیم جان تھی اور بار بار اپنا زرد ماتہ اٹھا کر ڈبے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد خون میں تریہ ڈبے میں سے اُس کے شیر خوار بچے کی لاش بھی باہر نکالی گئی اس معصوم بچے کی لاش کا حال میں

بیان نہیں کر سکتا۔ یہ دنگل زد، دل خراش منظر جب بھی آنکھوں کے سامنے آتا ہے میرا یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے لیے ہم نے جو بے بہا قربانیاں دی تھیں، وہ ہرگز ہرگز مایاں نہیں جائیں گی۔

لاہور سٹیشن میں گاڑی داخل ہوئی تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ باڈرائیریا کے دیہات سے آئے ہوئے بے سرو سامان لوگ پلیٹ فارموں پر جگہ جگہ ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ ڈبوں میں مسافر بٹھائیں بھرے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کی چھتوں پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اب میرے دل میں سن سنالیس کی تلخ یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہی مناظر اپنی تمام اندوہناکیوں کے ساتھ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ لاہور کے انہی پلیٹ فارموں پر میں نے مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مہاجرین کو فستہ حالی اور بے سرو سامانی کے عالم میں پڑے دیکھا تھا۔ پھر زبردست بارشوں اور سیلابوں کے بعد بیماریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم نمبر ایک پر مسلمان مہاجروں کو دم توڑتے دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک جگہ زمین پر پڑا ہوا کسان دم توڑ رہا تھا اور ایک ڈاکٹر اور پولیس والا جھک کر اس کا نام اور گاؤں کا نام پوچھ رہے تھے۔ اس کا گاؤں۔۔۔ ہوشیار پور، گورداسپور، پٹھانکوٹ یا جتوں کی کسی پرسکون ندی کے کنارے ام اور نیم کی گھنٹی چھاؤں میں گھرا ہوا اس کا پیارا گاؤں۔۔۔ جہاں وہ کھیل کود کر جوان ہوا، جہاں اس نے شادی کی، بچوں کا باپ بنا اور پھر اسی گاؤں میں اپنے بچوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کی لاشیں چھوڑ کر دم توڑنے کے لیے لاہور کے ٹھنڈے سنگین پلیٹ فارم پر آ گیا۔

میں جلدی جلدی لاہور ریلوے سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اب مجھے دھماکوں کی دھیمی دھیمی گرج سنائی دے رہی تھی جو داگہ کی جانب سے آرہی تھی۔ لاہور سٹیشن کے باہر پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ لوگ پریشان ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کو سامان اٹھائے بدحواسی کے عالم میں سٹیشن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ لاہور چھوڑ رہے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا۔ میں نے ایک واقف کار سے پوچھا۔

”کیوں بھئی، لاہور چھوڑ چلے؟“

وہ ذرا ہنسا اور بولا:

”نہیں یار، بچوں کو پشاور چھوڑنے ہار رہا ہوں۔“

میں نے رکشا کیا اور اسے فلمنگ روڈ چلنے کو کہاں۔ رکشے والے نے تین روپے مانگے۔ میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ رکشا پٹرول لینے کے لئے پٹرول پمپ کی طرف مڑا۔ وہاں رکشوں اور ٹیکسیوں کی قطار لگی تھی۔ اب محسوس ہوا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ کوئی آواز گھنٹے بعد جاری ہاری آئی۔ میکوڈ روڈ پر لوگ تاگوں اور ٹیکسیوں پر سامان لادے ریوے سٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ فلمنگ روڈ پر بڑی ہماہمی اور پرجوش ماحول تھا۔ رضا کار روڑیاں پہنے پھر رہے تھے۔ ہمارے محلے میں مجھے داروں کے ناموں کا اندازہ کیا جا رہا تھا۔ وارڈن پوشیں وجود میں آ چکی تھیں۔ کوئی دس منٹ گھر میں گزارنے کے بعد میں سیدھا ریڈیو پاکستان کی طرف چلی پڑا۔

اب شام ہو رہی تھی مغرب ہوتے سورج کی لالی نے ایبٹ روڈ پر شیشم کے درختوں کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ اب توپوں کے دھماکے زیادہ سنائی دیتے تھے ریڈیو سٹیشن کے گیٹ پر فوج کا پڑھا تھا۔ ایمپرس روڈ سے دو فوجی ٹرک گزرے لوگوں نے اپنے بہادر جوانوں کو دیکھ کر اللہ اکبر اور یا علی اور پاک فوج زندہ باد کے پرجوش نعرے لگائے۔ میں نے فوجی نو جوانوں کو دیکھا۔ ان کے چہرے گردا گرد تھے۔ لیکن آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں حملہ آور دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا آہنی عزم متا رہا تھا۔ ریڈیو سٹیشن میں ہر شخص پرجوش پرجوش تھا۔ دلوں میں ایک نیا دلولہ جاگ اٹھا تھا۔ شہر کے تمام شاعر، ادیب، آرٹسٹ، فنکار، گلوکار، موسیقار اور علماء کرام جمع ہو گئے تھے۔ دلولہ انگیز تقریریں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ پرجوش جنگی ترانے لکھے جا رہے تھے ان کی دھنیں بنائی جا رہی تھیں۔ ان دھنوں کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ صادق علی مانڈو ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کی طرف جاتے جاتے ترانے کی طرز بنالیتا اور ایک گھنٹے بعد ریڈیو سے جنگی ترانے کی آواز گونج اٹھتی۔

پاک فوج کو سلام
سیالکوٹ تو زندہ رہے گا۔
گجری داتا کی۔

اسے ہوا کے راہیوا
رودھا میرا شہر۔

زندہ ہے لاہور۔

سٹوڈیو نمبر ۳ میں ملک ترم ترانہ ریکارڈ کر رہی ہے۔
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو۔

مجھے یاد ہے۔ ایبٹ پٹر ہٹاں تے متیں دکھ رہے۔ کیہ لہجہ دی ایسی وچ بازار کڑے۔ ریکارڈ کرواتے وقت میڈم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ یہ ترانہ انہوں نے میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے اگلے روز ریکارڈ کر دیا تھا۔ سٹوڈیو میں ملک ترم کے ساتھ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھر جب دشمن نے قصور پر حملہ کیا اور اسے محیم کرن سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تو ملک ترم نے اسی روز ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹوڈیوز میں یہ ترانہ ریکارڈ کرایا۔

نی میرا سوہنا شہر قصورنی
ایدیاں دھماں دور دورنی
ایہ شہر اے شاہ عنایت دا
ایتے جتھے شاہ دا ڈیرا اے
ایتے رات نوں دن دا چان لے
ایتے رہندانت سویرا اے
نی میرا سوہنا شہر.....

ناصر کاظمی انبالے سے ہجرت کر کے جب پہلے پہل لاہور آیا تو آج سے بائیس برس پہلے ہمدی پاک ٹی ماؤس میں ملاقات ہوئی۔ وہ انبالے کی پر باتوں کی باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے جھنڈ سادہ کی لمبی جھڑیاں، کوئل کی پکار، سبزے کے فرش، انہوں میں پڑے جھوٹے سترہ برس بعد ہجرت نے پاکستان پر حملہ کیا تو وہ ارضی پاک کے تحفظ کے جذبے سے صبر دکھا اٹھا۔ اب انبالہ نہیں، سرگودھا اس کا شہر تھا۔ اس کے قلم نے لکھا ہے
زندہ دلوں کا گہوارہ

سرگودھا میرا شہر

جنگ کے دوران میں ریڈیو پاکستان پر جتنے بھی فنکار، گلوکار، علماء کرام اور شعرا

آئے، انہوں نے ایک پیسہ بھی معاوضے کے طور پر قبول نہ کیا، چنانچہ ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سٹوڈیو میں گلوکار جنگی ترانہ گارہے یا کوئی عالم دین تقریر کر رہا ہے اور ڈیوٹی روم میں اس کے نام کا کوئی چیک نہیں جانا ہوا۔ جن کے چیک بعض دفتری تقاضوں کے تحت بنتے بھی تھے وہ انہیں وصول کرنے کی بجائے دارفنا میں دے دیتے تھے۔

سات ستمبر کو میں نے لاہور میں ایک نئی قوم ابھرتے دیکھی۔ ایک ایسی قوم جس کا دل زندہ نگاہ بیدار اور یقین محکم تھا۔ چھ ستمبر کی شام والی افراتفری اور بے نظمی مفقود ہو چکی تھی۔ اب کسی بھی پٹرول پمپ پر کوئی قطار نہیں لگی تھی۔ آپ جہاں سے جتنا چاہیں پٹرول لے سکتے تھے۔ راشن ڈپوؤں پر کھانے پینے کی ہر شے دافر مقدار میں موجود تھی۔ ملک میں چوری، ڈکیتی، قتل و غارتگری اور اغوا کی وارداتوں کا وجود تک باقی نہ رہا تھا۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ بڑائی مار کٹائی یا فائرنگ کا واقعہ نہیں ہو رہا تھا۔ اخباروں میں جرائم کی ایک بھی خبر نہیں آ رہی تھی۔ ریڈیو سٹیشن پر دن میں ہزاروں فون آتے تھے۔ لوگ پوچھتے تھے کہ ہم ملک اور قوم کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ ہمیں بتایا جائے۔ لوگ فوجی ٹرکوں کو سڑکوں پر سے گزرتا دیکھ کر جوش میں آجاتے۔ وہ حلق بھاڑ بھاڑ کر اللہ کے نعرے لگاتے۔ باغبانپورہ سے پاکستان مرٹ تک لوگوں کا تاننا بندھا تھا۔ وہ نماذ پر اپنے فوجی جوانوں کے چہروں پر جلال تھا۔ سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر کفار سے جہاد کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر جنگ بدر کی یاد تازہ کر دی تھی۔ ان غازیوں صف شکن، خدا کے شہیدوں، اللہ کے سپاہیوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں نے دشمن کو ہر محاذ پر کس طرح ذلت آمیز شکست دی۔ کس کس طرح جو انہودی اور بلند ہمتی سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے خود شہید ہو گئے، لیکن دشمن کو ارمین پاک پر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس کے بارے میں آپ بہت کچھ پڑھ چکے ہیں اور دنیا کا ہر ملک پاک فوج کی بہادری اور شجاعت کا معترف ہے۔ میں ان سنہری کارناموں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ ہو سکتا ہے میں انہیں بیان کرتے ہوئے فوجی نقطہ نگاہ سے ان کارناموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکوں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہماری پاک فوج کے جیالوں نے سترہ دن کی جنگ میں یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام زندہ ہے۔ مسلمان زندہ ہے اور اللہ کے اس آخری دین کا جب بھی حیا

ہو تو اس عظیم نشاۃ الثانیہ کا مرکز پاکستان ہوگا۔

جنگ ستمبر کے دو تین سال بعد بھارت سے آئے ہوئے کچھ ہمنہ وادہ سکھادیوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے جنگ ستمبر کی باتیں شروع کر دیں اور کہا کہ یہ ایک سیاسی جنگ تھی جو بعض غیر ملکی طاقتوں کے ایما پر شروع ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے بین الاقوامی انسانیت اور ادیب کی انسانیت پرستی کا تذکرہ شروع کر دیا۔ میں نے ان سے کہا۔

اے میرے دوستو، پہلی بات تو یہ ہے کہ بین الاقوامی انسانیت کا نام ہی اسلام ہے اور جب بھارت کی سرکار نے مقبوضہ کشمیر کو ہاتھ سے نکلنا دیکھ کر پاکستان پر حملہ کیا۔ تو اس نے بین الاقوامی انسانیت ہی پر حملہ کیا تھا۔ ہماری غیرت کو لگا رہا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں انسانیت پرستی کا لحاظ رکھتے ہوئے بھارتی حملہ آوروں کی یلغار کا مقابلہ نہ کرتا اور وہ لاہور پر قابض ہو جاتے تو کیا وہ محض اس بنا پر مجھے معاف کر دیتے کہ میں بین الاقوامی انسانیت کا پرستار ہوں اور یہ کہ راجندر سنگھ بیدی میرا دوست ہے اور الہ آباد کے امپریل ہوٹل والا افسانہ نگار بلونت سنگھ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ جب کسی ملک کی فوج فاتح بن کر کسی ملک میں داخل ہوتی ہے تو وہاں کے افضل ترین انسان کو ذلیل ترین انسان بنا دیتی ہے اور یہ بین الاقوامی انسانیت کے خلاف ہے، اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اسلام ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ غیرت حقیقت اور خود داری کی تعلیم دیتا ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تنگ و دو میں

پہنائی ہے درویش کو تاج سردارا

میں جب بھارتی حملہ آوروں کے مقابلے میں سیہ پلائی دیوار بن کر ڈٹ گیا تھا تو میں نے بین الاقوامی انسانیت ہی کی اخلاقی اقدار کو پامال ہونے سے بچانے کی کوشش کی تھی میں تمہارے ناگ پور، کلکتہ، دلی، جہانسی، مدارس اور لکھنؤ سے پیار کرتا ہوں اور وہاں کے رہنے والوں سے دشمنی نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اسلام مجھے امن اور محبت کا درس دیتا ہے، لیکن اگر تمہارے شہروں کے رہنے والے مشین گنیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں لے کر میرے امن پسند شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے حملہ کر دیں گے تو یاد رکھو تمہارے ناگ پور، لکھنؤ، کلکتہ اور جہانسی کا سینہ

چھلنی کرنے کے لیے سب سے پہلا گولہ میرے ٹینک میں سے نکلے گا۔ بھارتی ادیب خاموش ہو گئے وہ جواب کیا دیتے۔ وہ میری بات سمجھ بھی نہ سکے تھے۔ حیرانی مجھے اُس وقت ہوئی جب خود ہمارے پاکستان کے دو ایک افسانہ نگاروں نے چائے کی پیالی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو یار، جنگ ستمبر تو محض ایک سنٹ تھا۔ ہم ادیب ہیں۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیے۔ ہمیں تو ساری انسانی برادری سے پیار کرنا چاہیے۔ ہمیں جنگ سے نفرت کرنی چاہیے۔ میں نے ایک ادیب سے پوچھا۔

”میرے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار دوست، تم انسانی برادری سے پیار کرتے ہو اور جنگ سے نفرت۔۔۔ مجھے بتاؤ تم اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ایک سڑک پر سے گزر رہے ہو اور چند غنڈے تمہاری بیٹی کو اسٹاکر ٹیکسی میں ڈال کر فرار ہو جاتے ہیں تو کیا تم انہیں کچھ نہ کہو گے؟ کیا تم اپنی بیٹی کی پیٹھ دیکھ سکتے رہو گے اور انسانی برادری سے محبت اور جنگ سے نفرت کا پرچار کرتے رہو گے معاف کرنا اگر تم ایسا کرو گے تو تم جانور سے بھی ارنل ہو گے، کیونکہ یہ بے غیرتی ایک جانور بھی گوارا نہیں کرتا۔“

میرا افسانہ نگار دوست قہقہہ لگا کر ہنس دیا اور بولا:

”تم جذباتی ہو رہے ہو۔ پھر کبھی بات کریں گے؟“

اس نے پھر کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے بات کر بھی نہیں سکتا۔ وہ نہ کفر سے باخبر ہے نہ اسلام سے وہ اچھا مسلمان کیا بنے گا وہ ایک برا کافر بھی نہیں

”زمانے کی قسم انسان گھائے میں ہے۔۔۔۔۔“

ہاں۔۔۔ مگر جن کو خدا توفیق دے۔ حکمت کی، ایمان کی سلامتی کی، تم اپنے رب کی کن کن

نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

بنی آربی نہر پر شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں میجر عزیز بھی شہید کی شہادت گاہ پر کوئی اگر بتیاں سنا گیا تھا وہ مجھ گئی ہیں۔ اگر بتیاں سمجھ جاتی ہیں، لیکن اُن کی خوشبو باقی رہ جاتی ہے۔ شہاد گاہیں مٹ جاتی ہیں، مگر شہید زندہ رہتے ہیں۔ بنی آربی نہر کا پُر سکون پانی بڑی سبک دھڑی

سے بہا چلا جا رہا ہے۔ کنارے کے درختوں کا عکس پانی میں گہرا سبز ہو گیا ہے۔ سورج مغرب افق میں غروب ہو رہا ہے نہر کے پانی میں ایک بھی لہر نہیں اٹھ رہی۔ اپنے شہیدوں کی یاد کو سینے سے لگائے وہ ابدی سکون کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے۔ میں میجر عزیز بھی شہید کی شہادت گاہ کی بجلی ہوئی اگر بتیوں اور سوکھے ہوئے پھولوں کو دیکھتا ہوں اور مجھے سیب کے شگوفوں کا خیال آ رہا ہے۔۔۔۔۔

دُور کسی گاؤں کی مسجد سے شام کی اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔

”میں گواہی دیتا ہوں کوئی نہیں معبود سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اُس کے

رَسُول ہیں۔“

اور میں شہید ہوں۔

امرتسر کی ایک ہولناک ات

یہ واقعہ فیہ کامریڈ موہن سنگھ بھل نے سنایا۔

کامریڈ بھل آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا ممبر تھا۔ پارٹی کا دفتر ہال بازار میں سندھو اور شکر پور ہوٹل کے سامنے مسجد خیر الدین کے پہلو میں تھا۔ نیچے گراموفون دیکھاڑوں کی دکان تھی جہاں سے دن بھر کسی کلا جھریا، کسی اختر کی بائی فیض آبادی، کبھی پیارو قوال اور کبھی سگی، کانن اور چنگ کے گیتوں کی آواز آیا کرتی۔ اسی دکان کی بغل سے تنگ سیرٹھیاں اور پارٹی کے دفتر کو جاتی تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ہی امرتسر تانگہ ڈرائیور یونین کا دفتر بھی تھا جس کا سکریٹری کامریڈ چین اور جنرل سکریٹری ظہیر کا شمیری تھا۔ نانے قد اور گھٹے ہوئے بدن والا کامریڈ چین کو جوانوں کے چاندے کی شراب پی کر شام کو پارٹی کے دفتر میں اگر خوب اودھم مچاتا، کامریڈ اللہ رکھا ساجد جناح کیپ اور گھر کی بھلی شور قیغ میں بڑا مخلص معلوم ہوتا۔ وہ پنجابی کا شاعر بھی تھا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتا۔ ایک روز میں اور احمد راہی دفتر کی باکونی میں کرسیاں ڈالے بیٹھے ہال بازار کی رونق دیکھ رہے تھے کہ کامریڈ ساجد ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بازار میں ہندو سکے لڑکیاں بڑی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ غالباً اُس روز کوئی تہوار تھا۔ کامریڈ ساجد پہلے تو ان لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”کامریڈ ایک شعر ہو گیا ہے اردو میں۔ عزم کیا ہے کہ۔“

ہے بات کیا جو بھڑ ہے اتنی لگی ہوئی

کچھ دیکھ رہا ہے آج یہ ہال بازار میں۔“

ظہیر کا شمیری نے پارٹی دفتر کے اوپر والے کمرے پر قبضہ جہاں رکھا تھا۔ چادوں طرف کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ در کی پر ایک صندوقی رکھی تھی۔ کونے والی میز پر سیاہ پتھر

کا ایک چورس ٹکڑا پڑا تھا جس پر ٹیگور کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ کامریڈ ساجد، کامریڈ بھل، کامریڈ شریف متین۔ کامریڈ چین اور کامریڈ کنول۔ یہ لوگ سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظہیر کا شمیری خانساں یونین اور تانگہ ڈرائیور یونین کے لئے کام کرتا۔ میں اور احمد راہی کبھی کبھی اس دفتر میں جا کر گپ بازی میں وقت گزارا کرتے۔

مجلس احرار کا ان دنوں امرتسر میں بڑا اندر قلعہ مسجد خیر الدین اور انجن پارک کی فضا میں سید عطا اللہ بخاری اور شیخ حسام الدین کی جو شبلی بھڑکسی تقریروں سے گونجا کرتی تھیں۔ اس جماعت میں بڑے مخلص کارکن بھی تھے مگر حکومت الہیہ کے پروگرام کی تفصیلات کو یہ واضح صورت میں امرتسر مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ میرے خیال میں اس جماعت کا سارا جوش شعلہ فشاں تقریروں ہنگامہ خیز جلسوں، پُر ہجوم جلوسوں اور فلک شکن نعروں میں صرف ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا امرتسر کی سیاسی فضا کو پُر جوش، گرم اور بیدار رکھنے میں مجلس احرار بھی بڑا کام کر رہی تھی۔ اس فوج کو بعد میں ڈاکٹر سید الدین کچلو کی نئی پوش تحریک نے بھی خوب گرمایا اور جب مسلم لیگ پاکستان کا مہم لے کر سامنے آئی تو امرتسر مسلمانوں کو پہلی بار اندھیرے کے سمندر میں روشنی کا ایک منار ٹٹٹانا دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام کا پروگرام ایک بڑا واضح اور مثبت پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی قیادت ایک پُر عزم، بے لوث اور مرد آہن کے ہاتھ میں تھی جس نے برہمنی سامراج کے مکرو فریب کے پردے کو چاک کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں اور خاص طور پر امرتسر کے مسلمان سیاسی طور پر ۱۹۵۶ء سے لے کر اُس وقت تک سیاسی بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے تھے۔ ہندوؤں کی تہذیب، کلچر اور مذہب الگ تھا۔ اُن کے ساتھ مل کر وہ رہیں سکتے تھے۔ اُن سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ امرتسر میں ہر خرم اور عید میلاد پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ پٹ رنگوں کا تعزیر گورو بازار میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ جو کہ ہندو سکھوں کا گڑھ تھا۔ غیر مسلم اُس تعزیرے پر پتھر پھینک کر بھاگ جاتے۔ ایک بار خرم پر کرموں ڈیوڑھی کے ہندو علوانی نے کھوتا ہوا گھی مسلمانوں پر پھینک دیا۔ جس کا بدلہ اُسی وقت ہندو علوانی کی دکان کو تندر آتش کر کے لے لیا گیا۔ امرتسر کا مسلمان بہادر ولیہ اور نڈر تھا۔ ہندو سکھ ہمیشہ اُس سے دُوب کر رہتے تھے۔ پھر بھی غیر مسلم اپنی فرقہ وارانہ شرارتوں سے

دوسرے مسلمان گھروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی مسلم لیگ اور پاکستان کا چرچا رہتے
 لگا۔ ہمیں اور تو کچھ علم نہیں تھا۔ ہاں اتنا ضرور معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک
 مل جائے گا۔ جس میں وہ آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں گے۔ اور ایک مسلمان کے لیے آزادی
 اور عزت سے بڑھ کر اور کوئی شے اس دنیا میں نہیں ہے۔ شہر میں لیگ کے جلسے منعقد ہونے
 اور جلوس نکلتے شروع ہو گئے۔ ایک بار انجمن پارک میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ میں اپنے

چنانچہ اسی تذبذب اور عدم الینان کے عالم میں جب پاکستان کی قرارداد سامنے آئی تو مسلمانوں کو پہلی بار اپنی منزل کا سراغ ملا اور انہوں نے اس منزل درخشاں تک پہنچنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دینے کا عزم بالجزم کریں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ابھی تک ہندو لیڈروں کے رام میں گرفتار تھے اور کانگریس کی برہمنی جماعت کو ہی ہندوستان کی واحد جماعت سمجھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب برہمنی سامراج اور مسلم دشمنی کے شعلے اُن کے گھروں تک پہنچ گئے تو اُن پر ہندو کا منافقانہ اور اسلام دشمن انداز فکر کھل کر سامنے آگیا۔ میں ان دنوں مبرک کامتحان دے رہا تھا۔ لیکن میری خانہ بدوشیاں مجھے اتنی عمر میں ہی بیٹی سے کھلتے، ناگ ہرے، مدراس، ترخیا پٹی، رامیشورم اور وہاں سے لنکا اور پھر وہیں سے رنگون تک گھٹا پھر لائی تھیں۔ میں نے مدراس کے دوپے مسلمانوں کو اسلامی شکار پر انتہائی پابندی سے غل کرتے دیکھا تھا۔ میں نے وزیگا پٹم میں مرہٹے مسلمانوں کو سرخ آنکھیں لئے سلطان

چھوٹے بھائی مقصود کے ساتھ جلسہ سننے گیا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب راجہ غفتر علی خان تقریر کے بعد تالیوں کے شور میں شیخ سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک لگی کارکن نے نعرہ لگایا۔

”راجہ غن ظفر علی خان — زندہ باد“

اور میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ لفظ اصل میں غفتر ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ جنگ شروع ہو کر ختم ہو گئی اور شہر میں سیاسی ہنگامے زیادہ تیز ہو گئے گول بارغ، انجمن پارک، مسجد خیر الدین، سکری بارغ اور مسجد جان محمد میں ہر جمعے کو جلسے ہونے لگے۔ شاید انہی دنوں لندن سے کینٹیشن آیا۔ شملہ کانفرنس ہوئی۔ پاکستان کی منزل قریب آرہی تھی اور امرتسری مسلمانوں میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ عورتوں کے جوش پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے لگتا شروع ہو گئے۔ پولیس ان پر آنسو گیس پھینکنے لگی۔ امرتسری کوئی دکان، کوئی ہوٹل، کوئی پیشک ایسی نہ تھی جہاں پاکستان اور قائد اعظم کے بارے میں بات نہ ہوتی ہو۔ مارکیٹ حکم سنگھ میں صوفی غلام محمد ترک کا ترک ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل امرتسری شاعر ادیبوں اور دانشوروں کے ٹی ماؤس اور کافی ماؤس تھے۔ یہاں صبح و شام گرم بجشیں ہوتیں سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی پاکستان زندہ باد کے نعروں کی گونج پہنچ چکی تھی۔ ایک روز مجھے کامریڈ موہن سنگھ بھلی نے کہا۔

”یار تم لوگ تو معلوم ہوتا ہے پاکستان بنا لو گے۔ لیکن ہمارا کیا بنے گا؟“

ہم لوگ ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزارا کریں گے؟“

میں نے کہا۔

”بہر حال اسلام کے مقابلے میں تم لوگ ہندو مذہب کے بہت قریب ہو۔“

تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔“

اس پر کامریڈ موہن سنگھ بھلی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور اس کے بالوں بھرے ادھیر عمر کے پچھلے سے چہرے پر لگی عینک کے شیشے ماند پڑ گئے تھے۔ کامریڈ بھلی بڑا مخلص سکھ تھا۔ اسے نہ اسلام سے دلچسپی تھی، نہ ہندو ازم سے اور نہ سیکھ مت سے۔

مگر کڑا کرپان وہ ضرور پہنتا تھا اور کیس بھی اس نے رکھے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت اس زمانے میں ہی میرے تجربے میں آچکی تھی کہ ہندو اور سکھ کمیونسٹ ہو کر، دہریہ ہو کر بھی اپنے مذہبی شعائر پر کسی نہ کسی طور قائم رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے رام گڑھیا لائی سکول میں ہمارا حساب کھاسٹر ہونا سکھ تھا۔ اور دہریہ تھا۔ یعنی اس نے ڈارمی مونچھ اور بال مات کر رکھے تھے پھر بھی وہ صبح کے وقت شبہ گیر تن بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر سنتا اور ہر بات میں گورو نانک اور گورو ارجن کے کسی قول کا حوالہ ضرور دیتا۔ اور اندر ہی اندر وہ دین اسلام کا کٹر دشمن بھی تھا۔

لیکن کامریڈ موہن سنگھ بھلی بڑا مرغیاں مرغی سکھ تھا۔ جب امرتسری ۱۹۴۷ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی پھر بھی کامریڈ بھلی کرفیو کھلنے کے بعد پارٹی کے دفتر کا ایک چکر ضرور دگاتا۔ پارٹی کا دفتر مسلم اکثریت کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہم نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ یوں کھلے بندوں نہ آیا کرے مگر اس نے ہر بار مسکرا یہی کہا۔

”کامریڈ! مجھے مار کر کوئی کیا لے گا۔“

مگر لاہور اسمبلی ہال کی سیرٹھیلوں پر ماسٹر تارا سنگھ نے تنگی تموار لہرا کر اعلان کر دیا تھا کہ سکھ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے اور مسلمان ہر وقت پر پاکستان بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور امرتسری کے لگی کوچے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے بھر رہے تھے۔ چنانچہ ایک روز کامریڈ موہن سنگھ بھلی پر حملہ ہو گیا۔ کامریڈ بھلی نے بڑی مشکل سے جان بچا کر پارٹی کے دفتر میں آکر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے ہال بازار میں دفتر کی طرف آنا بند کر دیا۔ موہن سنگھ بھلی محلہ بے والا کھوہ میں تاروں والے باغ کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا۔ یہ محلہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا۔ اس سے آگے جا کر چوک لوہگرہ آتا تھا جہاں دروازہ لوہگرہ کے اس پاس دو چار محلے مسلمانوں کے تھے۔

جو واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بھلی نے سنایا اس کا تعلق اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر سے ہے۔ یہ بڑے آگ اور خون لہریں ہونے والے دن تھے۔ کٹر مذہبی سکھ چوک گول ہٹی سے لے کر پچم والے بازار تک اور وہاں سے لے کر مسجد قاصداں تک سارے کا سارا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ ادھر بازار راگڑھیاں، کٹر مذہبی سکھ، بازار سرے، بازار بھنگیاں، محلہ

ابوایاں اور ہندو اکثریت میں گھیرے ہوئے اسی قسم کے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوستان نے مکانات پر ترنگے لہرا دیئے تھے۔ وہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خالی مکانات کو ٹوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ ہندو محلوں سے مسلمان محلوں پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ امرتسر کے گھو کوہوں، بازاروں، پارکوں، باغوں اور نالوں میں پڑی ہوئی لاشوں کو گدے اور کتے نوچ رہے تھے۔ مسلمان اپنا سب کچھ لٹوا کر مہاجر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے شہر کی چار دیواری سے لٹختے سیاہ دھوئیں اور سرخ شعلوں کو تنگ رہے تھے۔ شریف پورہ کی مسلم آبادی کو مہاجر کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے باہر ہماری مشہور بوج رجنٹ مشین گنیں لئے بیٹھی تھیں۔ اُسے جی ٹی روڈ عبور کر کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ شہر میں گورکھا، ڈوگرہ اور سکھ رجمنٹوں کا راج تھا۔ سوائے ہمارے محلے کٹرہ جہان سنگھ کے امرتسر کی ساری زخم خوردہ مسلم آبادی کیمپوں میں کوچ کر گئی تھی۔ کٹرہ جہاں سنگھ کے مسلمان سمٹ سٹا کر ہماری گلی کوچہ ڈبگراں میں آگئے تھے اور ہم اُن لوگوں کا انتظار کر رہے تھے جو ہمیں اُس گلی سے اٹھا کر شریف پورے کے کیمپ میں پہنچانے والے تھے۔ کرفیو کے کھٹے اور گنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سوائے ہمارے محلے کے سارا امرتسر ہندو فوج کی تحویل میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں رہنے والی مسلم اکثریت کے مکانات کو ٹوٹ ٹوٹ کر آگ لگا کر ہندو سیکہ تھک چکے تھے۔ ہماری گلی کے منہ پر لوہے کا مضبوط دروازہ چڑھا دیا گیا تھا۔ پتی گلی، کیسری باغ، محلہ بکرواناں، چوڑا کھوہ، پیلا ہسپتال اور کوچہ انگریزاں کے سارے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں پناہ لے چکے تھے۔ یہ لوگ سنگے سرانگے پاؤں اپنے مکانات سے بھاگتے تھے۔ ہندو فوج نے دستی بموں اور سٹین گنوں سے ان کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی کا سارا خاندان سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ تو کسی کے جوان بچے کے سینے میں گولی مار دی گئی تھی۔ کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا تو کوئی اپنے شہید ہو چکے باپ کو رو کر آوازیں دے رہا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے مشہور آرٹسٹ اور پاکستان کے نامور باکسر محمود بٹ کا بڑا بھائی حامد بٹ میرا کلاس فیلو تھا۔ اونچا لمبا جوان خوبصورت اور بالی کا بہترین کھلاڑی۔ اُس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جب ہندو فوجیوں نے اُن کے محلے پر حملہ کیا تو اُس نے ایک پل کے لئے

کھڑکی کی چٹاٹھا کر باہر دیکھا۔ تھری ناٹ تھری کی ایک گولی اُس کی گردن پر آکر لگی اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ اُس جنگام قیامت میں غم نصیب گھروا لے حامد کی لاش بھی اپنے ساتھ نہ لاسکے۔ حامد بٹ اگر زندہ رہتا تو آج ہماری قومی ہاکی ٹیم کے اہم ستونوں میں سے ہوتا۔

پیر احمد شاہ کشمیری کڑیل جوان تھا۔ سرخ و سپید رنگت۔ چہرے پر شرعی ڈاڑھی مونچھے۔ پانچ وقت کا نمازی۔ پرہیزگار۔ نیک سیرت۔ اور خوب صورت۔ ہماری گلی سے یہ پتہ کرنے لگا کہ کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان آگئے ہیں یا نہیں۔ درباری پنساری کی دکان کے سامنے چوک میں ہندو تھانیدار بہتر نے اُسے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اُس کی لاش بھی وہیں پڑی رہی۔ یہ آنکھیں کس کس مسلمان کی شہادت پر اٹکنا رہیں؟ یہ سینہ کس کس کے ماتم میں خوں چکان ہو؟ ہزاروں ماؤں کے محل مشرقی پنجاب کے شہروں میں بے گور و کفن رہ گئے۔ جن بھائیوں کو اُن کی بیٹیوں نے سہرے باندھنے تھے انہیں کفن بھی نصیب نہ ہو سکے۔ بے شک ہم نے پاکستان اپنے پیاروں کا خون دے کر حاصل کیا ہے اور اپنی جانیں دے کر بھی اس کی حفاظت کریں گے۔

امرتسر آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں فضا میں جلی ہوئی لاشوں اور جلے ہوئے مکانات کی بو تھی۔ ویران سڑکوں پر راتوں کو کتے روتے رہتے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا دور دورہ تھا کہ کامریڈ موہن سنگھ بجلی مجھ سے ملنے میرے محلے میں آیا۔ میں گلی کے کونے والے مکان میں کھڑکی کے ساتھ لگا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے آہنی جھگے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا کہ کامریڈ بجلی ایک پولیس جیپ سے نیچے اُترا اور گلی کے آہنی دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میٹالی پھسکی دھواں آلود دھوپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کو دیکھ کر اوپر سے آواز دی۔

”کامریڈ بجلی! کس لئے آئے ہو؟“

مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ شاید وہ ہندو سکھ پولیس کو ساتھ لے کر ہمارے محلے پر حملہ کرانے آیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ایسی بات ہوئی تو میں اوپر ہی سے ہندوق کا فائر کر کے اُسے دھیر کر دوں گا۔ میری آواز پر کامریڈ بجلی نے چہرہ اوپر اٹھا کر ہاتھ سے عینک درست کی اور بولا۔

”کامریڈ! نیچے آؤ۔ مجھے ہمیں ایک امانت دینی ہے۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”کونسی امانت؟ کس کی امانت کامریڈ بھلی؟“

”بھلی بولا۔“

”تم نیچے آؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتانے دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔

”مجھے تمہارے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ تم فرج کو لے کر ہمارے محلے میں کیوں گئے ہو؟“

اتنا سن کر کامریڈ بھلی نے پولیس سے کہا کہ وہ جیپ لے کر کو توالی چلے جائیں وہ اپنے آپ

وہاں پہنچ جائے گا۔ جیپ وہاں سے چلی گئی۔ اب بھلی محلے میں اکیلا رہ گیا۔ سامنے دوکانیں ٹوٹی پڑی

تھیں اور ان کا سامان باہر کھرا ہوا تھا۔ ذرا دور چوک میں ایک بیل کی پھولی ہوئی لاش مجھے صاف

دکھائی دے رہی تھی۔ بھلی اوپر منہ کر کے کہنے لگا۔

”کامریڈ! میں اب بالکل نہبتا اور اکیلا ہوں۔ اب تو نیچے آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس اور پرلاؤ

واگوروی کی قسم! مجھے ایک ضروری امانت تمہیں دینی ہے۔“

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی ہندو قتلے پہرہ دے رہا تھا۔ پہرہ

کیا تھا بس اتنی ہی ڈیوٹی پر تھا کہ اگر ہندو فوجی حملہ کرنے آ ساد کیوں تو فوراً اطلاع کر دوں تاکہ

میں کے مسلمان وہاں سے بھاگ کر شریف پورے والے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ اس مکان

کا ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا اور بھلی بازار میں کھڑا تھا۔ خدا جانے کیوں مجھے کامریڈ بھلی

کی بات پر اعتبار آ گیا پھر بھی میں نے محلے کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال کر گوارا نہ

کیا۔ میں نے چوبارے کے اوپر والے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا اور سیڑھیاں اتر کر

بازار والے دروازے پر آ کر رک گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے

کی کڑی کھول دی۔ ہندو قتلے میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا رخ اگرچہ براہ راست بھلی کی طرف

نہیں تھا لیکن وہ میرے نشانے کی زد سے باہر بھی نہیں تھا۔

”کونسی امانت ہے کامریڈ بھلی؟“

”مومن سنگھ بھلی کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ڈاڑھی کے بالوں میں ہلکی ہلکی پڑی تھی۔ وہ بڑے اطمینان

سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ جیسے اُسے ہندو قتلے کا فزہ برابر بھی خوف نہ ہو۔ میرے پاس آ کر بولا۔

”کامریڈ! یہاں سیڑھیوں میں بیٹھ کر ہی مجھ سے دوچار باتیں سن لو اور پھر اپنی امانت لے لو۔

واگوروی کی کرپا ہے کہ تم مل گئے ورنہ یہ پوچھ جانے کتنی دیر مجھ پر رہتا۔“

ہم دونوں سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز رومال میں لپیٹی ہوئی

تھی جسے اُس نے اپنی صدری کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ رنگ اُس کا بھی اٹا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں

کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سلاخ دار روشندان میں سے مٹیائی مسادزہ دھوپ کی ہلکی روشنی

اور نہال سنگھ کی جلی ہوئی دکان میں سے گندے بیروڑے کی بو آ رہی تھی۔ مومن سنگھ بھلی نے

ٹوٹے پھوٹے نقلوں میں جلدی جلدی جو دروناک واقعہ مجھے سنایا اُسے میں آج آپ کو اپنی زبانی

سناتا ہوں۔“

جس روز کامریڈ مومن سنگھ بھلی پولیس کی جیپ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا یہ اُس سے

ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں مومن سنگھ بھلی والا کھوہ میں رہتا تھا

جو کہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا اور ۱۵ اگست کے بعد تو ان علاقوں میں کسی مسلمان کے رہنے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان علاقوں سے مسلمانوں کی ساری آبادی دائم گنج اور ریویرج

کی جانب سے نکل کر مہاجر کیمپوں یا ریفریجی ٹرینوں میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف کوچ کر چکی تھی

ان مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے دیران غلوں میں ہندو سیکھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ

مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ امرتسر کا مشہور پنجابی شاعر اور ادبی محفلوں کی

جان جاں چاچا عیسیٰ اسی علاقے میں شہید ہوا۔ وہ ہندوؤں کی جانی امن کلیٹی کے ارکان کے

ساتھ امن کی بات چیت کرنے گیا کہ اُسے گولی مار دی گئی۔ ہم نے اُس کی لاش حاصل کرنے

کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ ایک بھنگی نے ہمیں ترک ہوئی میں آ کر بتایا کہ اُس

نے اپنی آنکھوں سے چاچا عیسیٰ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اب ان ویران و بہشت زدہ گلی کو چوں میں بند و سکھ غنڈے فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر
دندناتے پھرتے تھے۔ کہیں جل بجھے مکان سُلگ رہے تھے اور کہیں تازہ لگی آگ کے شعلے
آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مسجدوں کے غیر توڑ کر بندوؤں نے وہاں مورتیاں لا کر رکھ
دی تھیں اور دروازوں پر کھریا مٹی سے "اوم" لکھ دیا تھا۔ موہن سنگھ بھلی کے بیان کے مطابق
وہ شام کے وقت کرفیو لگنے سے کچھ دیر پہلے گول باغ کی طرف سے ہاسٹی گیٹ کی جانب آ رہا
تھا کہ سیتلا مندر کے پاس اُسے اُس علاقے کی نام نہاد امن کمیٹی کا چیرمین برام مل گیا۔ برام کبھی
کبھی پارٹی کے دفتر میں بھی آیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جھک کر ملتا۔ بڑا انکسار دکھاتا۔ اُس روز
برام نے شراب پی رکھی تھی اور وہ موہن سنگھ بھلی کو زبردستی اپنے ساتھ سیتلا مندر کے چھوڑنے
تالاب کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کوٹھڑیوں میں سے ایک کو ٹھٹھری میں لے گیا۔ یہاں برام کے
چھ سات بہنو دوست شراب پی رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ موہن سنگھ ان سب
کو جانتا تھا۔ اُس نے بہت کہا کہ اُسے گھر جانا ہے۔ کرفیو کا وقت پورا ہے لیکن کسی نے ایک
نہ سنی۔ برام نے شراب کا گلاس اٹھا کر کہا۔

"بھلی! کونسا کرفیو! کیا کرفیو! امرتسر میں اب ہمارا راج ہے۔ آج ہم تمہیں سورگ
کی سیر کرائیں گے۔" اور قبقرہ لگا کر وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اب موہن سنگھ بھلی کو علم ہوا کہ ان
بندوؤں نے شہر کے اندر سے کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کر رکھا
ہے اور شراب ختم کرنے کے بعد اُسے اپنی بربریت اور وحشت کا نشانہ بنانے والے ہیں۔
موہن سنگھ بھلی کا کہنا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ خدا جانے وہ کس شریف باپ کی بیٹی
تھی اور یہ لوگ اُسے اٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اُس لڑکی کو
ان درندوں سے ضرور بچائے گا۔ مگر برام اور اُس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب
پی کر خون ہو رہی تھیں۔ یہ بھوکے بھیڑیے کے جبرٹوں سے اس کا ترنوالہ جھپٹنے والی بات تھی۔
پھر بھی موہن سنگھ بھلی کہتا ہے کہ میں نے اُسکی بے کس و مجبور مسلمان بیٹی کی مدد کرنے کا فیصلہ
کر لیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے خود بھی برام کے ساتھیوں کی ہادہوں میں شریک ہو گیا
ایک بند و نڈھ بھوک کر اُسے پاؤں سے مل کر بولا۔

"میں مسلمانوں کو یوں ہی مسل دوں گا۔ بااٹا۔ برام اچلو اُس مسل و مسلمان عورت
کے پاس چلو۔ سالی کو اب ہوش آگیا ہوگا۔
دوسرا بولا۔

"بھراتا جی! میری مانو۔ اس نے بے ہوشی کا بہانہ بنایا ہے۔
برام اپنے گلاس میں شراب انڈھیلنے ہوئے جھکے کھارہا تھا۔
بہت۔ چپ رہ رام مورتی!۔ ان مسلمانوں کی عورتوں کو ہم الٹا لٹکا دیں گے۔
کیا سمجھتا ہے۔"

"بل جی! وہ سالی بچے بند نہیں کہہ رہی تھی۔
موہن سنگھ نے پوچھا۔
"کیا کہتی تھی وہ؟"

برام میز پر مکتا مارتے ہوئے چیخا۔

"کہتی تھی پاکستان زندہ باد۔ بہت۔ بہت۔ مزا چکھا دوں گا۔ مزا چکھا
دوں گا۔"

کمرید موہن سنگھ کہتا ہے کہ میں نے موقع غنیمت جان کر برام سے کہا۔
"یار بل! میں جا کر اس مسلمان عورت سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس طرح
بچے بند نہیں کہتی۔ ادھر فکر نہ کرو۔ میں اُسے رامنہ بھی کر لوں گا۔"
موہن سنگھ نے اُنکے مادی جس پر برام قبقرہ لگا کر ہنس پڑا۔ سارے ہندو غنڈوں
نے موہن سنگھ کی بات کو پسند کیا۔ رام مورتی بولا۔
"بل جی! موہن سید کو بھیج دو۔ ہڑعادی ہے۔ اس کی بات وہ مسل مان جائے
گی۔"

چنانچہ موہن سنگھ بھلی ساتھ والی کوٹھڑی کا تال کھول کر اندر گیا۔ اندر طاق میں مٹی کا دیا
جل رہا تھا۔ اندر گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایک لڑکی پڑی تھی۔
دیسے کی دھیمی روشنی میں موہن سنگھ نے دیکھا کہ اُس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے

تھے۔ بال یوں کھلے تھے جیسے کسی نے زبردستی نوپے ہوں۔ وہ بمشکل اٹھارہ سترہ برس کی زرد سی دہلی پتلی لڑکی تھی۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کے قریب گیا تو اُس نے تڑپ کر گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مسلمان لڑکی کی آنکھوں میں خونخوار چیتے کی چمک تھی۔ اُس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اُس نے گرج کر کہا۔

”خبردار جو مجھے ماتہ لگایا۔“

موہن سنگھ بکلی کہتا ہے کہ میں نے ماتہ جوڑتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا۔ بلکہ میں تمہیں ان ہندوؤں سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیرے لئے کیا کروں۔ وہ لوگ شراہیں پی رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں یہاں سے بھاگوا دیا تو وہ میرے ساتھ تمہاری بھی تکتا بوٹی کر دیں گے۔ اور پھر اگر تو یہاں سے بھاگ کر نکل بھی تو کسی دوسرے ہندو غنڈے یا ہندو سپاہی کے ماتہ آجلے گی۔ مسلمان لڑکی نے جب موہن سنگھ کے منہ سے بیٹی کا لفظ سنا تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ ایک پل کے لئے اُس نے موہن سنگھ کو غور سے دیکھا اور پھر اچانک لگے میں سے ایک موٹا سا تعویذ نکال کر اُسے دیتی ہوئی بولی۔

”میری یہ امانت اپنے پاس رکھ لیں اور کسی بھی مسلمان کو دے دیں۔ میرا نام رضیہ بانو ہے۔ میں ام اے اوگرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے۔“

بقول موہن سنگھ بکلی اُس مسلمان لڑکی نے اچانک موہن سنگھ کی طرف ماتہ بڑھایا اور موٹا تعویذ اُسے دے کر چشم زدن میں موہن سنگھ کی کرپان نیام سے کھینچی اور دیکھتے دیکھتے اُسے اپنے دل میں اتار لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ مسلمان لڑکی ایک لمبی سی سسکی بھر کر چارپائی پر گر پڑی۔ موہن سنگھ ایک پل کے لئے تو ہتھیرا ہو کر رہ گیا۔ لڑکی کے سینے سے خون جاری تھا اور وہ تڑپ رہی تھی۔ پھر اُس نے شور مچا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے سارے

ہندو غنڈے سے لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اندر آئے اُس وقت تک وہ مسلمان لڑکی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ موہن سنگھ نے کہا۔

”اِس نے میری کرپان سے خودکشی کر لی۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اِس نے میری کرپان کھینچ کر دل میں گھونپ لی۔“

ہندو غنڈوں نے وحشی ہو کر بھر پور ماریں اور ہرام نے کہا۔

”مرگئی ہے تو مرنے دو۔ ہم کوئی دوسری لڑکی اٹھا لائیں گے۔ رام مورتی! چلو۔“

چلو یارو۔ کوئی دوسری عورت اٹھا لاتے ہیں۔ مشلی نہیں تو ہندو عورت ہی سہی لا لیا۔“

اور وہ سارے شرابی شور مچاتے، بھڑکیں مارتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ موہن سنگھ اُس مسلمان لڑکی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔ بقول موہن سنگھ اُس لڑکی کی لاش کے چہرے پر ایک عجیب سکون اور نور تھا۔ دینے کی دھیمی روشنی میں فون آلود کپڑوں میں اُس کا سفید چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گلاب کے پھولوں میں موتیے کا سفید گجر پڑا ہو۔ موہن سنگھ بکلی کتنی ہی دیر رضیہ بانو کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”کامریڈ! ایک مسلمان لڑکی اتنی غیرت مند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ سچ کہتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس کا دیا ہوا تعویذ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کیسی گولی چلنے کی آواز آجاتی تھی۔ پھر میں نے اُس بہادر مسلمان بچی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لے آیا۔“

ستیلامنڈروائے تالاب کے عقب میں کچا میدان ہے جو ذرا دور فتح شاہ بخاری رو اور حضرت شکر شاہ کے مزار تک چلا گیا ہے۔ یہاں کہیں کہیں لیکروں کے جھنڈ ہیں۔ موہن سنگھ بکلی نے انہی لیکروں کے ایک جھنڈ میں زمین میں گڑھا کھودا اور رضیہ بانو کی لاش کو دفن کر دیا۔ موہن سنگھ بکلی کہنے لگا۔

”کامریڈ! مجھے مسلمانوں کی طرح فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ماتہ اٹھا کر اپنے رب سے کہا تھا کہ اے سب کے پالناہارا اِس غیرت مند مسلمان بچی کی اتنا کوشاں نہی

میں سیر میوں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مومن سنگھ بھلی نے رضیہ بانو کی امانت وہ تعویذ میرے حوالے کیا اور خشک سی آواز میں بولا۔

”کامریڈ! یہ بچی جہاں دفن ہے وہاں میں اس کی قبر نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے ہندو اسے ڈھادیں گے۔ میں وہاں مسلمانوں کے رواج کے مطابق جمہرات کو دیا بھی نہ جلا سکوں گا۔ اس پر پھول بھی نہ ڈال سکوں گا۔ لیکن کامریڈ! یقین کر میں جب تک زندہ رہا، ہر جمہرات کو وہاں آکر اپنے انسوؤں کے پھول اپن کر تار ہوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں میں نے اس بچی کی امانت تجھے دے دی ہے اب میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کسی مسلمان کو یہ تعویذ دے دینا۔ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں نے سنا کہ تمہارے محلے میں مسلمان ابھی ہیں۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آگیا۔ میں نے اپنا فرمن پورا کر دیا۔ میں جاتا ہوں۔ کو تو الی میں سپاہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

اس کے ساتھ کامریڈ بھلی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں محکم کر دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر رضیہ بانو شہید کا تعویذ ہاتھوں میں لئے سیر میوں میں بیٹھا رہا۔ کامریڈ بھلی کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اچانک بازار میں قاتر کی آواز آئی۔ میں چونکا جلدی سے دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور چوہارے میں آگیا۔ جنگے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک فوجی ٹرک چوک میں کھڑا تھا اور سکھ ہندو فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے کود رہے تھے۔ میں چشم زدن میں سیر میاں اتر کر گئی میں آگیا اور محلے والوں کو ہندو فوجیوں کی آمد خبر سنائی۔ اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گلی کا آہنی دروازہ ایک طرف سے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور لوگوں نے گلی کی دوسری جانب لال حریف کی طرف بھاگنا شروع کر دیا پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب آہنی گیٹ ایک طرف سے اڑ چکا تھا اور ہندو سکھ غنڈے تلواریں اور بلیں لئے اچھلتے کودتے شور مچاتے گلی میں آ گئے تھے۔ لیکن اس وقت گلی میں سولے ادھر ادھر کبیرے ہوئے گھر یلو سامان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گلی کے سارے مسلمان لال حریف اور گوجروں کے ویڑے میں سے گزر کر ہاتھی گراؤنڈ

کے ساتھ والی دیوار سے ہوتے شریف پورے والے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچ چکے تھے اور کیمپ میں متعن بلوچ رجمنٹ کے جوان ان کے عقب میں کور فائرنگ کر رہے تھے شریف پورے پہنچ کر میں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا اور جیب میں سے رضیہ بانو شہید کے تعویذ کو نکال کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بڑا تعویذ تھا۔ میں نے اس کا ہن کھولا تو اندر بلوچی رنگ کا خستہ سا کاغذ نکلا جس پر قلم اور سیاہ روشنائی سے پوری سورہ فاتحہ لکھی ہوئی تھی میں نے اس مقدس امانت کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگایا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میری آنکھوں میں فتح شاہ بخاری کے میدان والے لکھروں کا وہ جھنڈ پھر گیا جہاں اسلام کی ایک غیور بیٹی دفن تھی اور جس کی کوئی قبر نہ تھی۔ جہاں کبھی کوئی دیا نہیں جلے گا۔ جہاں کبھی کوئی پھول نہیں ڈالے گا۔ لیکن رضیہ بانو کبھی نہیں مر سکتی۔ اس نے اپنی لاکھوں بہنوں، بھائیوں اور بیٹوں کے خون سے اس باجروں قلعے کی بنیادیں استوار کی ہیں جس کی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔ زندہ باد! رضیہ بانو!

امرتسر کے دانشور

امرتسر میں جو مسلمان آباد تھے۔ یہ شہر ان کی وجہ سے علم و دانش کا گہوارہ تھا۔ پتنگ بازی، شعر بازی، کرکٹ میچ، دنگل، مشاعرے، ادبی مذاکرے اور علمی مناظرے، سیاسی ہنگامے اور دینی گرم جوشی یہ ساری گجا گئی اور رستاخیزی ان امرتسری مسلمانوں کے دم قدم سے تھی جو امرتسری تہذیب، امرتسری کچر اور امرتسری ثقافت کے نقیب تھے۔ امرتسری تہذیب پر زیادہ اثر کشمیری کچر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آباد امرتسری گھرانوں میں آج بھی سبز چائے کئے تو امرتسر وہ امرتسر نہ رہا۔ امرتسر شہر کی محفل سے شمع آٹھ گئی اور بزم میں اندھیرا چھا گیا۔ بیس پچیس سال کی مدت میں امرتسر کے ہندو سکھ بڑی مشکل سے ایک پنچل نام کا ہندو لوگ گویا ہی پیدا کر سکے۔ جس کی آواز زنانہ بے سُری ہے اور جس کا گائائش کر سر پیٹے کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں کی ہجرت کے بعد امرتسر بیوہ ہو گیا۔ روح پاکستان میں آگئی۔ اور مردہ جسم امرتسر کے کلپنی باغ میں پڑا رہ گیا۔

جب اس شہر کا سہل سلامت تھا تو یہاں بڑے بڑے نابغہ روزگار رہا کرتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو پاکستان چلے آئے۔ کچھ وہیں امرتسر کی خاک میں سما گئے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے کہ جنہیں امرتسر کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ میں یہاں صرف ان اصحاب کا ذکر کروں گا جن سے میں ملا۔ جن کو میں نے قریب سے دیکھا اور جن کی مجلس میں بیٹھنے کی مجھے سعادت ملی۔ یہ لوگ علم و ادب کے سمندر تھے۔ لیکن دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اپنے مہر کے سوز سے۔ لیکن صبح کو ایک کنوئیں سے طلوع ہوتے تھے اور شام کو دوسرے کنوئیں میں غروب ہو جاتے تھے۔

حکیم فیروز الدین طغرائی بھی امرتسر کے ایک مہر تاباں تھے۔ ان کے بارے میں علامہ اقبال نے ایک محفل میں کہا تھا کہ طغرائی ایک ایسا کنواں ہے جس پر رہٹ نہیں لگ سکا۔ غسوس کہ میں نہ تو مسلم

امرتسر کے اس عظیم شاعر سے شرف ملاقات حاصل کر سکا اور نہ امرتسر میں وہ مکان ہی دیکھ سکا جہاں طغرائی صاحب رہا کرتے تھے۔ صوفی تبسم صاحب ان کے شاگردوں میں سے تھے اور مجھے اکثر پاکستان میں ان کی باتیں اور فارسی اشعار سنایا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے طغرائی کا فارسی دیوان بھی چھاپا۔ مگر خدا جلنے پھر وہ کہاں غائب ہو گیا۔ اصل میں طغرائی صاحب جس محلے میں رہتے تھے۔ وہ ہمارے محلے سے بہت دور تھا۔ امرتسر کا کافی ماؤس اور ٹی ماؤس ہمارے محلے میں تھا ایک کا نام ترک ہوٹل تھا اور دوسرا تھا کامریڈ ہوٹل۔ مال بازار کے ایک بنگلہ بازار میں مارکیٹ حاکم سگر تھی۔ یہ دونوں ہوٹل اس تنگ سی گلی میں آئے سائے تھے۔ ہوٹل کیا تھے بس چائے خانے تھے۔ انگلیٹھینوں پر نیلی پہلی چمکیں تھیں اور اندر لمبی میزیں اور پرانی کرسیاں اور پنچ۔

کامریڈ ہوٹل میں ایک معمر بزرگ اکثر گاکر حکیم طغرائی کے اشعار سنایا کرتے ان کا رنگ کالا تھا۔ بے حد دبے پتے تھے اور گاتے گاتے ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے جنہیں وہ سفید پگڑی کے پتوں سے پونچھ لیتے اور پھر چائے کی پیالی پر جبک جاتے اور گرم ہو جاتے۔ ہماری عمر چھوٹی تھی۔ اتنا شور نہیں تھا کہ طغرائی کی شاعرانہ عظمت کا ادراک کر سکتے اور ان کی مجلس کی طرف کھپے چلے جاتے۔ حکیم صاحب کے بارے میں صوفی تبسم بہت کچھ لکھ سکتے تھے اور میں نے ایک دو بار انہیں گزارش بھی کی تھی لیکن صوفی صاحب بے حد معروف انسان تھے۔ اب میرے خیال میں اگر لاہور میں کوئی شخصیت طغرائی کے بارے میں کچھ لکھ سکتی ہے تو وہ عرشی صاحب ہیں۔ میں ان سے شرف ملاقات حاصل، نہیں کر سکا لیکن غائبانہ ان کے تبرع علمی کا مداح ہوں۔ اگر انہوں نے بھی طغرائی صاحب پر کچھ نہ لکھا تو پھر شاید امرتسر کا یہ عظیم شاعر، مہر تاباں حکیم فیروز الدین طغرائی گمانی کے کنوئیں میں اتر کر وقت کے پاتال میں گم ہو جائے۔

حکیم طغرائی کی روایت عرتی اور بیدل کی روایت تھی لیکن اب میں امرتسر کی ایک ایسی شخصیت کا ذکر کرنے والا ہوں۔ جنہوں نے انشا اللہ خان انشا کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کا نام غلام احمد تھا اور آغا غلش کشمیری کے نام سے علم و شعر کی دنیا میں جانے جاتے۔ سرخ و سپید رنگ و جیلہ قد، بھرا بھرا جسم، ہٹلر ٹائپ کی مونچھیں، آواز تیز تھی۔ چہرے پر ہر وقت طنزیہ سی مسکراہٹ رہتی پیچھے سے کوئی آواز دیتا تو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔ ساتھ والے سے پوچھتے۔ کون ہے پیچھے؟

چال میں بڑا ضبط تھا۔ چلتے وقت کوئی فالتو حرکت نہیں کرتے تھے۔ کسی وقت لگتا کہ دبے پاؤں چل رہے ہیں۔ زیادہ سلام دعا لینے کے عادی نہیں تھے۔ ہاتھ ملانے سے گریز کرتے تھے کامریڈ ہوٹل کے کونے میں اگر بیٹھ جاتے اور ارد گرد بیٹھے ہوؤں سے بے نیاز باہر سے آنے جانے والوں کو ٹنگلی باندھ کر دیکھا کرتے۔ چہرے پر وہی طنزیہ مسکراہٹ ہوتی جو چہرے کی ایک مستقل حالت بن چکی تھی۔ کوئی بات کرتا تو اس کا جواب باہر نکلتے ہوئے ہی دیتے سوال کرنے والے کی طرف بہت کم دیکھنا گوارہ کرتے۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی جو کسی وقت دھندلی ہو جاتی بھنوں اور ٹپکیں گنجان تھیں۔ سوال آپ نے کیا ہے تو وہ جلاب میری طرف دیکھ کر دیتے مٹی، جون کی دوپہر میں وہ کمپنی باغ کی بجائے امرودوں کے باغ کی سیر کرنے نکل جاتے اور امرود کی ٹہنی ہاتھ میں تھامے واپس آتے کپڑے بڑے صاف ستھرے پہنتے۔

بہت کم بات کرتے تھے لیکن اگر کسی نے کہہ دیا کہ غالب بڑا شاعر ہے تو جب تک اسے جھوٹا ثابت نہ کر لیتے۔ دم نہیں لیتے تھے۔ غالب ہی کے اشعار کی ایسی ایسی تشریح کرتے کہ محفل میں بیٹھا ہر شخص سوچ میں پڑ جاتا کہ غالب نے یہ کیا کہہ دیا؟

اس کے ساتھ ہی عروض، قافیہ، منق، ہندسہ نجوم، ہنیت، طب، فلسفہ، شعر اور معقولات و منقولات کا سمندر بہنے لگتا۔ علم و حکمت کے پیچیدہ سے پیچیدہ نکتے پر غلش کا شمیری گھنٹوں بولتے چلتے جاتے۔

لمبی سے لمبی اور مشکل سے مشکل بحر کی تقطیع آغا غلش کا شمیری ایک سیکنڈ میں کر دیتے ساتھ ہی علم عروض پر خیالات کا دھارا بہہ نکلتا۔ بات عروض سے چل کر علم موسیقی کے بحر و غار میں پہنچ جاتی۔ پھر فلسفہ، اخلاق اور طب اکبر موضوع بحث بن جاتے۔ غلش صاحب بے حد اوق اور منطقی اردو میں بولتے جارہے ہیں۔ کیا مجال ہے کہ چہرے پر ٹھنکی کے آثار نمایاں ہوں یا آواز میں کمزوری پیدا ہو جائے۔ خیال سے خیال نکل رہا ہے دلیل سے دلیل روشن ہو رہی ہے۔ ایک موضوع دوسرے موضوع میں جذب ہوتا جا رہا ہے۔ غلش صاحب کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ بالکل گھٹا رہا۔ آنکھوں میں جذب کی کیفیت آگئی ہے۔ شمع آغا غلش کا شمیری کے سامنے ہے اور علم کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ آج یہ روشنی ہمارے درمیان نہیں ہے مگر شمع ضرور جل رہی ہے اور اس کی روشنی ہماری زمین سے اُگے نکل گئی ہے۔ علم کی شمع کبھی نہیں بجتی۔ علم کا سفر سات آسمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔

صوفی ترک ہوٹل میں باران ادب کی محفل بھی تھی۔ چائے کا دوسرا چل رہا تھا۔ کریون اسے اور ہانگ ٹو کے مگرٹوں کی ڈبیاں کھلی تھیں۔ تعالیٰ میں بنارس پان سبے ہوئے تھے۔ آغا غلش کا شمیری حسب عادت خاموش بیٹھے اہل مجلس سے بے نیاز ہوٹل میں آنے جانے والوں کو ٹنگلی باندھ رہے تھے کہ چانک پنجابی کے ایک شاعر داخل ہوئے جو دھوبی کا دھندلا کرتے تھے۔ غلش صاحب نے شاعر کو دیکھا تو اچانک پنجابی کا یہ بند پڑھنا شروع کر دیا۔

تھو دھوبیاں دیا دھوبیاں اللہ
ایدھرون ستھے اودھر گھنڈ پئے گئی
تن میر روپتے دے چاول ائے
پنچ سیر کی ائے کھنڈ پئے گئی
عیسیٰ پھرٹے کجا ورتا دن رگ
جھدر کھنڈ کی اودھر ڈنڈ پئے گئی

یہ شعر آغا صاحب نے اس وقت برجستہ کہے تھے اور تخلص امرتسر کے ایک مشہور و معروف پنجابی شاعر نادم عیسیٰ کا دے دیا تھا یعنی ظاہر یہ کیا کہ یہ اشعار چاچا عیسیٰ نے دھوبی برادری کے خلاف کہے ہیں تو اردو شاعر نے غلش صاحب سے پوچھا۔

دو استاد جی! ہم نے چاچا عیسیٰ کو کب اپنی شادی میں بلایا تھا۔؟
غلش صاحب بولے۔ بلایا ہوگا تو اس نے شعر کہے۔

تھوڑی دیر میں چاچا عیسیٰ بھی تشریف لے آئے۔ پس پھر کیا تھا۔ دونوں شاعروں کی وہ آپس میں جنگ ہوئی بحر بڑی مشکل سے سنبھل بچاؤ کرایا گیا۔ اس دوران آغا صاحب کے چہرے پر وہی ٹھنکی سی طنزیہ ہنسی رہی۔ ایک بار بھی کھل کھلا کر نہیں ہنسنے۔

آغا غلش کا شمیری کو برجستہ اور فی البدیہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا پس مطلع کہنے کی دیر ہوتی۔ اس کے بعد شعر پر شعر ہو رہا ہے۔ قافیہ پر قافیہ خانا چلا آ رہا ہے۔ قافیہ ختم ہو جاتے تو فوراً بتانا شروع کر دیتے شعر کی زمین ختم ہو جاتی تو پانی میں اتر جاتے اور وہاں سے بھی شعر نکال لاتے۔ پچاس پچاس، سو سو شعر ایک نشست میں کہہ جاتے۔ مشکل گوئی پر اتر آتے تو ایسی ایسی دقیق ترکیبیں اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال

کرتے کہ سامعین منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ہجو، ہزل اور استہزا ایسی لکھتے کہ قاطب موڑ لگ جاتے۔ پنج پنج میں ہندی اور سنسکرت کے ایسے ایسے لفظ آتے کہ معلوم ہوتا آسمان سے پتھر گر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کشمیری اور مڑی زبانوں کے لفظ بھی استعمال کر جاتے۔ ان کی ہجو سن کر سید انشا اور معصی کے معر کے یاد آ جاتے تھے۔

آغا غلش کا کشمیری امر ترس کے تھے لیکن ہماری ہوش میں ان کا قیام زیادہ تر بمبئی سے اکثر امر ترس آتے اور جیلینہ جیلینہ بھر یہاں رہتے اور صوفی ترک اور کامریڈ ہوٹل میں صبح سے رات گئے تک علم و ادب کی محفل گرم رہا کرتی۔ اپنے رسالے میں وہ کسی نہ کسی علمی ادبی شخصیت سے چمڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک بار سیاب اکبر آبادی سے ایسا زبردست معرکہ ہوا کہ رات شعر و شاعری سے نکل کر پتھر اور دھات کے ذمے تک جا پہنچی۔ ضبط قریشی مقیم راولپنڈی آغا صاحب کے ہونہار اور قابل قدر شاگردوں میں سے ہیں۔ ایک بار میں ان کے ساتھ آغا صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ بیٹھک میں صوفے پر بیٹھے برف کے ساتھ کچھ کھا رہے ہیں برف توڑ کر پیالے میں رکھی تھی اور بائیں ہاتھ میں دو کپے تھے۔ ہمارے استفسار پر آغا صاحب نے صوفے کی ساخت، برودت صوفے کے اخراج، اور اس کے مزاج پر ایک زوردار لکچر دیا۔ ایک بار کیلا چھلکے میت کھا گئے۔ کہنے لگے۔

”میرا مزاج دھوی ہے جو طبی اعتبار سے تمام مزاجوں کا بادشاہ ہے۔“

آغا غلش کا کشمیری خود بھی امر ترس کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک بار میں نے ان کے سر پر تاج بھی دیکھا۔ یہ تاج روایتی بادشاہوں کا تاج نہیں تھا بلکہ بارہ سنگے کا سر تھا۔ الیگزاندرو پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان بڑے معرکے کے کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے غلش صاحب نے اپنے محلے حسین پور سے میں نوجوانوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جس کا نام ہرجتہ تھا۔ ایک بار الیگزاندرو پارک میں ایم اے او کلب اور ہندو جم خانہ کے درمیان کرکٹ میچ ہوا۔ حیدر نے ساٹھ رنز بنائیں تو انرول میں آغا غلش کا کشمیری کا ہرجتہ نمودار ہوا۔ آغا صاحب نے بارہ سنگے کا سر اپنے سر پر رکھا ہوا تھا، نوجوانوں کا گروہ پیچھے پیچھے تھا اور انہوں نے ساری گراؤنڈ کا چکر لگایا۔ وہ گارہے تھے۔

حیدر نے جو بہٹ لگائی

گیند جا پیا رہیڑے

میچ جتن گے کیڑے ؟

ہرجتہ والیو دستو

اور پھر سب اونچی آواز میں کہتے۔ ایم اے او، ایم اے او شب برات کے موقع پر یہ ہرجتہ اصلاح معاشرہ کا جلوس بھی نکالا کرتا تھا۔ جلوس کے نوجوان آغا صاحب کی قیادت میں شیخ کورس کے صوفے انگ میں یہ شعر گاتے گیتوں کا چکر لگاتے۔

آغا شاہی نہ تو جالا

دولا تا پانی ناتو گودا

(آتش باہشی نہ تو چلا۔ دولت اپنی نہ تو گنوا)

حسین پور سے میں پہلا ریڈیو آغا غلش کا کشمیری کے گھر آیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں دوسری جنگ عظیم لگی تو محلے کے لوگ ان کی بیٹھک کے اندر اور باہر بیٹھ کر برین ریڈیو سنا کرتے تھے۔ جنگ کے دنوں میں ہی آغا صاحب بمبئی چلے گئے اور ہفتہ وار مصورہ کی ادارت سنبھال لی جسے مرتے دم تک نبھایا۔ پاکستان بن گیا۔ ایک بار نسبت روڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے شاگرد رشید ضبط قریشی میرے ساتھ تھے۔ غلش صاحب کے بالوں میں سفیدی آنے لگی تھی۔ اس کے بعد پھر ان سے ملنا نہ ہوا۔ لوگوں کی زبانی سنا کہ بمبئی میں کسی عورت کو دل دے بیٹھے شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ آغا صاحب نے دلہن کے لئے عروسی جوڑا بھی تیار کر دیا لیکن خدا جانے پھر کیا ہوا کہ لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا۔ آغا صاحب نے غصے میں اگر دلہن کا عروسی جوڑا زیب تن کیا۔ سونے کے سارے زلور پہنے اور بمبئی کے بازاروں کا چکر لگانا شروع کر دیا غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں کسی اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی کہ بمبئی کے ایک خیراتی ہسپتال میں آغا غلش کا کشمیری کا انتقال ہو گیا۔ جنازے میں فلم انڈسٹری کے دس بارہ افراد نے شرکت کی اور انہیں خانوٹی سے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ سید انشاء اللہ خان انشاء کی روایت نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔

عینی تادم لفظانی گنجوی زندہ ہوتے تو ضرور مرثیہ کہتے لیکن وہ تو اس سے بھی پہلے امر ترس میں اسی کیٹی بناتے ہوئے ہندوؤں کے محلے میں شہید ہو گئے تھے ان پر کسی نے مرثیہ نہ کہا۔

کیا بارغ و بہار شخصیت تھی چاچا عینے کی بھی پنجابی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کی نعتیں تو آج بھی نعت خوانوں کو از بریں صوفی ترک کے ہوٹل میں سبز کلاہ سر پر رکھے کرسی پر پاؤں رکھے کھڑے بیٹھے پان چہاتے ہوئے فکر سخن کیا کرتے۔ عید میلاد کے جلوس میں ہر چوک میں کرسی پر کھڑے ہو جاتے اور اپنی تلمذہ کبی ہوٹی نعت تحت اللفظ سناتے۔ امر ترس میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا تو ہندو مسلم فساد شروع

ہو گئے چچا عیسیٰ نے ایک امن کمیٹی بنائی جس میں ہندو بھی شریک تھے چچا اس کمیٹی کے صدر تھے۔ ایک روز تاروں والے باغ یا شاید بیٹے والا کھوہ کی طرف امن کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے اور پھر واپس نہ آ سکے۔ بعد میں ایک شخص نے ان کی لاش ہندوؤں کے محلے میں ایک دکان کے پھٹے کے نیچے سڑک پر پڑی ہوئی دیکھی تو آکر بتایا کہ چچا عیسیٰ شہید ہو گئے ہیں۔

بابو غلام محمد بٹ، صوفی ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل کی محفلوں کی جان تھے، درمیانہ قد، بھاری بدن، سر کے بال سیدھے پیچھے کو جاتے ہوئے، اگھٹا ہوا گندمی رنگ پر جوش انداز میں بات کرتے اور دل کھول کر قہقہہ لگاتے، کوئی نہ کوئی منطق، فلسفہ، تنقید کی ادبی کتاب ہمیشہ بغل میں ہوتی، شعر و ادب، فلسفہ، تنقید، منطق و جوش توفانی کے علوم پر محفلوں بحث کرتے اور کہیں نہ ٹھکتے۔ ہال بازار کی بغلی گلی میں ان کا قالینوں کا ایک چھوٹا سا بازار تھا چار پانچ کھڑیاں لگی تھیں۔ خود بہترین نقاش تھے اور ایسے ہیچیدہ فن تیار کرتے کہ بڑے بڑے کاریگر دنگ رہ جاتے۔ ایک بار روسی ترکستان سے ایک قالین کا ٹکڑا آیا۔ جس پر روسی ادیب گورکی کی تصویر بنی تھی بابو غلام محمد نے اس تصویر کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔

میں قائد اعظم کی تصویر والا قالین بناؤں گا اور روسیوں کو بھیجوں گا، امن بنانا یہ ہم سے سیکھیں۔

اور پھر انہوں نے روسی قالین کے فن کی کچھ ایسی دقیق قسم کی غلطیاں نکالیں کہ جنہیں ہم تو نہ سمجھ سکے لیکن ان کا فنی سن سن کر سر ہلار اٹھا۔ بٹ صاحب نے اس روز تن پر کام شروع کر دیا اور دو مہینوں میں قالین کا ٹکڑا تیار کر دیا جس پر قائد اعظم کی تصویر بنی ہوئی تھی پھر یہ قالین روسی ترکستان بھجوا دیا وہاں سے تعویفی خط آیا تو بابو غلام محمد جیب میں ڈال کر ترک ہوٹل آگئے وہاں دوستوں کی محفل لگی تھی بٹ صاحب نے خط نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

قائد اعظم نے اپنا لوازمیوں سے بھی منوالیا۔ اسے پڑھو۔

سگریٹ بٹ صاحب ہمیشہ مٹھی میں دبا کر پیتے تھے۔ چائے کے رسیا تھے اور مطالعہ کرتے وقت چائے اور سگریٹ ساتھ ساتھ پیتے جاتے تھے شروع شروع میں ہیگل کے جدلیاتی فلسفے سے بہت متاثر تھے۔ جدلیات کا لفظ ان میں کئی بار استعمال کرتے ان کے کارخانے کے کشمیری کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی اس روز سارے کاریگروں کو مہینے کی سات تاریخ کو تنخواہ

ملتی تھی اس روز سارے کاریگر جوا کھینے بیٹھ جاتے۔ جیتے والے سینا دیکھنے چلے جاتے اور جوار جاتے وہ منہ ٹٹکائے بٹ صاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک بار سے ہوئے کاریگر نے اگر ان سے ایڈوانس مانگئے آجاتے ایک بار میں بٹ صاحب کے پاس ایڈوانس مانگا تو بابو غلام نے بند مٹھی میں سے سگریٹ کا زور دار کش کھینچ کر لیا۔

تم لوگوں کا جدلیاتی نظام برباد ہو گیا ہے۔

سگریٹ کی راگ ہمیشہ چٹکی مار کر گراتے، ایسا کرتے ہوئے سگریٹ والی بند مٹھی کو نعت دائرے میں گھماتے دوستوں میں دل کھول کر خرچ کرتے، چائے کی جس محفل میں بابو غلام محمد بٹ بیٹھے ہوتے وہاں چائے، پان اور سگریٹوں کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا، ان کے تبحر علمی کا تمام احباب کو بڑا احترام تھا۔ جذباتی بھی بہت تھے۔ بحث کے دوران کبھی کبھی غصے میں بھی آجاتے اور چہرہ سرخ ہو جاتا قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، طبیعت میں خوداری تھی لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر آئے تھے لیکن یہاں کسی کا زیر باد ہونا گوارا نہ کیا۔ بخارا پتیس میں کچھ دیر کام کیا۔ پھر کراچی سے ایک ادبی ماہنامہ "ادب" کے نام سے نکالا۔ مجھے خط لکھ کر ایک مزاحیہ مضمون "قبر سے ایک خط" منگوایا۔ یہ پرچہ بھی نہ چل سکا، جب کبھی لاہور آتے تو ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی، پھر ایک روز سنا کہ بابو غلام محمد بٹ کراچی میں انتقال ہو گیا، یقین نہ آیا کہ وہ زندگی اور علم و حکمت سے بھرپور شخصیت کراچی کے قبرستان میں دفن ہو گئی ہے۔ جو شمعیں امرتسر کے دبستان میں روشن ہوئی تھیں وہ ایک ایک کر کے پاکستان میں اگر بجھتی چلی جا رہی ہیں، وہ گلاب جنہیں امرتسر کی ٹھنڈی کوئی کے پانی نے تروتازگی اور شادابی بخشی تھی یہاں اگر مرجھاتے چلے گئے، آج وہ پھول نظر نہیں آتے، کبھی کبھی تنہائی شب کے دیران جھونکوں کے ساتھ ان کی خوشبو آ جاتی ہے۔ یادوں کی اندھیری رات میں ایک جگنو سا چمک کر بجھ جاتا ہے، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ پھولوں سے بھرا ہوا گلدان میز پر رکھ کر بیالیوں میں گولڈن چائے ڈالوں اور پھر کچھ پڑے ہوئے امرتسر کے ان تمام دانشوروں کو اپنے سامنے بٹھا کر چائے کی پیالی پیش کروں اور سگریٹ سلا کر کہوں۔

اے پیارے لوگو! تم دور کیوں ہو؟

امرتسر کا ماسٹر نثار

اس وقت جب میں ایک "سٹرنگ کپ آف ٹی" پی کر ماسٹر نثار پر لکھتے بیٹھا ہوں تو میری گھڑی صبح کے ساٹھ بج رہی ہے اور میرے کمرے کی کھلی کھرکی میں سے باہر سکول کی گراؤنڈ کے شبنم آلود سبزے کی نمک، انگن میں کھلے موتیے کی خوشبو کو ساتھ لے کر اندر آرہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ امرتسر میں اس وقت میں اور ماسٹر نثار تکیہ شیخ چلی کے اکھاڑے میں صراحی دار مردوں کے درختوں تلے لنگوٹیاں باندھ کر بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کر رہے ہوتے تھے اور کہنی باغ کو جاتی نہر کی جانب سے کھٹے کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہوتی۔ ماسٹر نثار اور میں ہم عمر تھے، یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی عمر میں ہوں گی، مگر وہ بڑا کمزور تھا۔ رنگ گہرا سا نولا تھا۔ تکی گردن پر کدو ایسا سر جھولتا رہتا اور زرد آنکھیں لوکاٹ کی ٹہنی پر بیٹھی شیا ماچڑیا کو دیکھ کر بے قرا۔ ہوا ٹھٹھکی۔ یہیں صبح صبح پہلوانوں کے ساتھ اکھاڑے میں کسرت کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم بھی پہلوانوں کی طرح بدن پر خوب مالش کرتے اکھاڑے کے کنارے گڑے ہوئے تیل میں چمڑے بانس کو حتم کر بیٹھائیں لگایا کرتے جلد ہی تھک جاتے اور پھر اکھاڑے کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرطب مٹی پر چٹ لیت کر لمبے لمبے سانس لینے لگتے۔ پھر ہم اکھاڑے میں اتر کر نانی گرانی پہلوانوں کی طرح پنجے میں پنجہ ڈال کر کھڑے ہو جاتے اور پھر یوں وادیں پیچ سے کام لیتے گویا رستم زماں کے شاگرد ہوں۔ اپنے اٹاری پننے کی وجہ سے ہم کشتی لڑتے لڑتے ہر بار بڑے پہلوانوں کی زد میں آ جاتے جو ہماری پیٹھ پر لات مار کر ہمیں پرے ہٹا دیتے۔ اکھاڑے سے باہر نکل کر ماسٹر نثار دھاگہ اپنی رانوں کے گرد لپیٹ کر یہ دیکھا کرتا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کتنی بڑھ گئی ہیں۔ واپس آکر ہم بتے گوجر کی دکان سے پیرٹوں کی لسی پلٹے ان کی طرح چھاتی۔

وہ پہلوانی چھوڑ چکا تھا مگر اس کا جسم اب بھی بڑا سڈول تھا۔ ہفتے میں ایک بار گانے کے دودھ سے ضرور نہاتا۔ مگر وہ بڑا ڈرپوک تھا۔ اندھیرے میں اس کے پاؤں نہ اٹھتے تھے اور روشنی میں چھپکلی کو دیکھ کر وہ دکان کی گدی پر اچھل پڑتا تھا۔ سارا دن وہ دکان پر دودھ دہی بیچتا۔ گوجروں سے حساب کتاب کرتا اور شام کو تحصیل پورے والے ٹھیکے پر جا کر میٹ بھر کر مٹھا مالٹا شراب پیتا۔ ساتھ ایک کونڈا ہی کا کھا جاتا اور پھر سخی سرور کے ٹیکے پر جا کر گھڑے پر رات گئے تک ماہیا گاتا رہتا۔ بتے گوجر کے کان ٹائروں کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ ایک روز ہمیں لسی کا پیالہ تھا کر بنے گوجر نے کہا۔ "اوسے امنڈیو اتسی کہاں سے پہلواں ہو؟ اوسے تمہارے ابھی کان ہی نہیں ٹوٹے؟" مجھے یاد ہے اسی روز ہم تکیہ سخی سرور گئے تھے اور ماسٹر نثار نے ایک اینٹ نیچے رکھ کر دوسری اینٹ سے میرا کان توڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں دور سے چیخ اٹھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے کان نہ ٹوٹ سکے۔

چیت بیسا کھ کے دونوں میں ہم بانس کی تیلیوں کے پنجرے لے کر کھیٹوں باغوں میں سرخیں پکڑنے جایا کرتے تھے۔ مادہ سرخ پنجرے میں بند ہوتی۔ پنجرے کا دوسرا دروازہ کھول کر تھی کھینچ دیتے۔ پنجرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹتے۔ ماسٹر نثار کا اصل نام کچھ اور تھا۔ یہ نام اُس نے میڈن تھیٹر کے مشہور ہیر و ماسٹر نثار کے نام پر رکھ لیا تھا کیونکہ اُسے بھی اصل ماسٹر نثار کی طرح گانے اور اداکاری کا بڑا شوق تھا۔ انہی دنوں امرت ٹاکیز میں اصل ماسٹر نثار اور مس کمن بائی کی فلم "لیلے مجنوں" لگی تو ہم دونوں دیکھنے گئے سکرین پر جب ماسٹر نثار نے مجنوں کے روپ میں قبرستان میں جا کر قبروں کو سونگھنا شروع کیا تو ماسٹر نثار نے میرا ہاتھ دبا کر کہا "دیکھتے جانا۔ دیکھتے جانا۔ ہائے ہائے۔ ہائے ہائے۔"

تھوڑی ہی دیر میں سکرین پر مجنوں نے ایک قبر کو جو جھک کر سونگھا تو خوش ہو کر بول "اسی قبر میں سے میری بیٹی کی خوشبو آرہی ہے ضرور یہی میری لیلے کی قبر ہے۔" اسی کے بعد اُس نے ایک ہاتھ ہوا میں پھیلایا، ہاتھوں کو پھیلا یا اور گانا شروع کر دیا۔

ہاں ہاں۔ راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

صبون کا ہوا کا جیسے ادھر سے ادھر گیا

میرے ساتھ دو آنے والی تھرڈ کلاس میں بیٹھا ہوا ماسٹر نثار جھومنے لگا۔ باہر نکل کر اس نے کہا: "میں ذرا اپنے گانے کو پکا کروں پھر ہم دونوں لکھتے جا کر میڈن تعمیر زوالوں کی فلم کہتی ہیں کام شروع کر دیں گے۔"

ماسٹر نثار کو "لیلا جمنوں" راجہ ہرش چندر، جلتی نشانی، "دوب بلسنت" "دھوپ چھاؤں۔" "اتاقہ اشرف" "حاکم طانی" اور نقش سلیمانی" فلموں کے کئی گیت زبانی مع طرزوں کے یاد تھے۔ اس نے یہ سارے کے سارے گیت ایک کاپی میں نقل کر رکھے تھے جس کے باہر موٹے قلم سے لکھا تھا: "ماسٹر نثار ام ترسی عرف شیر دل۔"

ماسٹر نثار ڈھولک بہت اچھی بجا لیتا تھا۔ یہ فن اس نے کلیر شریف کے عرس پر ایک استاد سے سیکھا تھا۔ جو ایک بھیڑے کے پیچھے ڈھولک بجا یا کرتا تھا۔ ڈھولک وہ اس انھاک سے بجاتا کہ اس کی زرد آنکھیں بند ہوتیں۔ پتل گردن پر تر بوزلیا سر جھول رہا ہوتا اور دہلا بدن یوں دائیں بائیں پیچ و خم کھا رہا ہوتا گویا کوئی اسے گدگدی کر رہا ہو، ساتھ ہی وہ گاتا بھی۔ اس کی آواز بہت برقی تھی، اسے راگ داری سے بھی کوئی واقفیت نہ تھی مگر وہ درو میں ڈوب کر گاتا تھا۔ جب وہ ناک سے سانس لیتا تو ایک سیٹی سی بج اٹھتی۔ ذرا کی ذرا اپنی آنکھیں کھول کر ماسٹر نثار چھت کی طرف دیکھتا اور آنکھیں بند کر کے گردن ایک طرف ڈھلکا کر مصرع اٹھاتا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

وہ گانے میں غفلتوں کو بگاڑ دیا کرتا تھا۔ مثلاً جیسے اچھی طرح یاد ہے، بلکہ اس وقت بھی جب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میرے کانوں میں اس کے گانوں کی آواز گونج رہی ہے وہ: راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا۔ میں "زمانہ کو ہمیشہ" زمانا نا، کہا کرتا تھا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

اس کے علاوہ اس کی عادت تھی کہ وہ گاتے ہوئے ہر شعر یا گیت کے آخری لفظ کے ساتھ "ہاوم" ضرور لگا دیا کرتا تھا۔ اسے شاہرہ مودک کی فلم "آوارہ گرد راج کمار" کا یہ گانا بہت پسند تھا۔

بے کس ہوں مجبور ہوں میں جان سے لاچار ہوں

اس کو وہ یوں گایا کرتا۔

بے کس ہوں مجبور ہوں میں ہاوم جان سے لاچار ہوں ہاوم کبھی کبھی وہ گانے کے شروع میں بھی ہاوم لگا دیا کرتا تھا۔

ہاوم اٹھ حاتم کیوں سویا نادان ہاوم اللہ بند سے رب کو پہچان ہاوم کبھی کبھی جب وہ ماسٹر نثار ایسا ایکڑ ترین سکے کی وجہ سے بڑا اداس ہوتا تو وہ پاسنگ شو مگر سیٹ کا لمبا کش لے کر اور ناک سے سیٹی بجا کر دعوان نکالتا اور ڈھولک گھٹنوں میں دبا کر اسے کہتے ہوئے کہتا: "میدے باؤ! کبھی اپنے بھی دن ضرور پھرے گے۔"

پھر آہستہ آہستہ ڈھولک بجاتے اور گانے میں مگن رہتا۔ وہ دنیا کے جھنجھٹوں سے بے فکر ہو کر گارہا ہوتا کہ باہر سے اس کے والد امام دین حجام کی آواز آتی: "اوسے تان سین دیا پترا۔ بس کرہٹی تے نیس جاناں؟"

ماسٹر نثار فوراً ڈھولک سے ہاتھ کھینچ لیتا اور آنکھیں کھول کر بلند آواز میں جواب دیتا: "ایا میاں جی؟"

وہ اپنے باپ کا بڑا ادب کرتا تھا جس طرح اس زمانے میں سب بچے اپنے ماں باپ کا ادب کیا کرتے تھے۔ حالانکہ اس زمانے کے باپ اپنے بچوں سے آج کل کے باپوں کی طرح لاڈ پیار نہیں کیا کرتے تھے الٹا مارا پیٹا کرتے تھے۔ ماسٹر نثار کا والد حجام تھا۔ بھرا بھرا گول چہرہ۔ سفید ڈارھی سر کے سفید بال۔ جن پر وہ ہندی لگا کر پیل کے پتے باندھا کرتا تھا۔ زیادہ جھنگ پینے کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت سبز کی مال پھیل چکی پر لگتی تھی۔ میری حجامت بناتے وقت وہ بوریت پر بیٹھا میرا سر اپنے گھٹنوں میں دبا لیتا اور مشین سے خشا شی کرنے کے بعد سر پر جب آم کی گشلی پھرتا تو مجھے بوریت پر تار بے چمکتے نظر آتے۔ ماسٹر نثار نے والد کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے ترکھانہ کام کو ترجیح دی تھی۔ چنانچہ وہ حاجی اللہ دتا ترکھان کی دکان پر کام سیکھا کرتا تھا یہ حاجی اللہ دتا ترکھان بھی ایک طرف بزرگ تھا۔ وہ خربوزے کی بھانک بھجوں اور چھلکے سمیت کھایا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں خربوزے کی اصل اور مفید شے تو اس کے بیج اور چھلکا ہوتا ہے یہ گودا تو قدرت نے یونہی ساتھ لگا رکھا ہے۔

کبھی کبھی میں حاجی صاحب کی دکان پر ماسٹر نثار کو ملنے جایا کرتا۔ دکان میں کٹی ہوئی لکڑیوں کی گلی گلی خوشبو پھیلی ہوتی اور ماسٹر نثار ایک طرف بور پیٹے پر تیشہ لیے بیٹھا لکڑیوں کے تختے چیل رہا ہوتا۔ بازار میں سے گزرتے تھنڈ کی لکڑیوں سے لدے ہوئے گڈے گزرتے تو میں ہانکھ بچا کر ایک ڈنڈا کھینچ لیتا۔ ماسٹر نثار اس کا بڑا خوبصورت گلی ڈنڈا گھڑ دیتا اور ہم گرمیوں کی شکر دوپہروں میں انجمن پارک یا لیگز نڈل گراؤنڈ میں جا کر گلی ڈنڈا کھیل کرتے۔

جمعے کے روز ہم ڈھلے ہوئے کپڑے پہن کر مسجد فیہ الدین ہال بازار میں جا کر جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ میرا لباس عام طور پر سفید ٹاسے کی قمیض، کلکتے کی چارخانہ دار دھوتی اور سلیمپر پر مشتمل ہوتا لیکن ماسٹر نثار کی سچ دھج توالی ہوتی تھی۔ وہ چاند خاں پنواڑی کے آیتے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک گنگھی سے تیل میں چپکے بال سنوارتا اور لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی شلوار کے بل درست کرتا رہتا اور پھر یوں سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ چلتا، گویا تہی ہوئی رسی پر چل رہا ہو۔ مسجد میں جا کر ہم حوض کے کنارے بیٹھ کر وضو کم کرتے اور حوض میں تیرتی سرخ مچھلیاں کو زیادہ دیکھا کرتے۔ انگریزی کا ایک لفظ وہ بہت بولا کرتا تھا۔ یہ لفظ تھا۔

ماسٹر نثار دو میں اس کو "نیورین" بولا کرتا تھا۔ ایک بار بے گوجر کی دکان میں ماسٹر نثار میرے ساتھ بیٹھا بے گوجر کو ہیر سنار ہاتھاکہ لگی میں سے ہلی مرانی کا گور ہوا۔ وہ دکان کے سامنے رک گیا۔ کچھ دیر گرن جھکا کر ہیر سنار ہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا "پتر راگ داری کا علیہ خراب نہ کرو۔ تم راگ داری کے لئے پیدا نہیں ہوئے۔ بس لوگوں کے سرمونڈا کرو۔"

جلی مردی اتنا کہہ کر چل دیا۔ بے گوجر کو اور مجھے اس کی یہ بات بڑی بُری لگی۔ بسا گوجر کھونچہ اٹھا کر ضلی مرانی کے پیچھے بھاگنے لگا تو ماسٹر نثار نے اس کا بازو تھام کر کہا "پہلوان! نیورین۔"

ماسٹر نثار کو تھیر میں پارٹ کرنے کا بھی بچہ شوق تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے اس نے ایک صندوق میں نقلی مونچھیں، نقلی ڈاڑھی، سرنخی پاؤڈر، گتے کا شاہی تاج جس پر تارے لگے تھے اور مور کا پنکھ جڑا تھا۔ نقلی موتیوں کے ہار وغیرہ جمع کر رکھے تھے۔ ہم دونوں کبھی کبھی اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں بچوں کو جمع کر کے ہیر رانجھے اور سوہنی ہینڈال کا ٹانگ کھیل کرتے تھے۔

لہنگے اور دوپٹے ہم اپنے اپنے گھروں سے چوری چھپے صندوق کھول کر نکال لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر میں سنو کھ سرنی گراؤنڈ میں ایک تھیریل کمپنی اتری جس نے شکشا کا کھیل کھیل۔ میں اور

ماسٹر نثار بڑے شوق سے یہ کھیل دیکھنے گئے۔ ٹکٹ کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے چنانچہ ہم سوڑے کے ایک درخت پر چڑھ کر اندر پنڈال میں کود گئے اور ایک طرف قاتلوں کے پاس دیک کر بیٹھے کھیل دیکھتے رہے۔ اگلے روز ہم نے وہی کھیل اپنی ڈیوڑھی میں کھیلایا۔ صبح ہی سے ہم نے کامیوں میں سے کاغذ بھاڑ کر اور قلم و دوات سے جلی حروف میں "شکشا" کے اٹھنا ہار لکھ کر مکانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے تھے۔ شام کو ہم نے ڈیوڑھی میں تخت پوش بچہ اکر شیج بنایا۔ بانس جود کر گئے پر وہ گرا دیا۔ محلے کے بچے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ماسٹر نثار راجہ دھشتت بنا اور میں اس کا وزیر۔ ہم نے ہیر پھیوں میں بیٹھ کر چہروں پر نقلی مونچھیں لگائیں۔ خوب سرنخی پاؤڈر تھوپا۔ ماسٹر نثار نے سر پر مور کے پنکھ والا گتے کا تاج رکھ لیا۔ میں نے اپنی بڑی بہن کا دوپٹہ سر پر پکڑی کی طرح باندھ لیا۔ ہمارے ایک دوست نے شیج پر اکو پر وہ بٹا دیا۔ اور شکشا کا کھیل شروع ہو گیا۔ ماسٹر نثار دھشتت کے روپ میں تیر کمان لئے جنگل میں کھڑا تھا اور میں وزیر بنا ہاتھ باندھ کر جھکائے ساتھ کھڑا اسے کہہ رہا تھا "مہاراج! ہرن اسی جنگل میں گیا ہے"

ماسٹر نثار گرج کر بولا "مگر کہاں ہے ہرن؟ کہاں ہے ہرن؟ اگر ہرن نہ ملا تو ہم تیری گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔"

میں نے ایک طرح آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا، وہ رہا ہرن مہاراج؟

جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ڈیوڑھی کا دروازہ تھا جس کا نصف پٹ کھلا تھا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ ماسٹر نثار نے فوراً کمان کے ساتھ تیر جود کر چلا دیا۔ تیر بچوں کے سروں کے اوپر سے کن سے ہو کر گزرا اور ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر سیدھا بے گوجر کو لگا جو شراب کے نشے میں دھت سامنے ولے مکان کی دیوار کے پاس پیشاب کر رہا تھا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔

میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے ماسٹر نثار کو کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ماسٹر تیر بے گوجر کے لگ گیا ہے بھاگ چلو۔"

ماسٹر نثار نے گردن اکڑائی اور مونچھوں پر ہاتھ پھر کر بولا "نیورین"

محلے میں ایک دم شور برپا ہو گیا۔ ڈیوڑھی میں بھگدڑ مچ گئی اور ہم دونوں بھاگ کر حاجی اللہ داتا رکھان کے گھر میں جا کر چھپ گئے جو اس وقت تنور کی روٹی کے ساتھ خربوزے مع

بیج اور چھلکوں کے کھارنا تھا۔ اُس نے چونک کر کہا: "اُسے کی خود مچا کے آئے ادا دئے۔"
 ماسٹر نشار نے کہا: "استاد جی، ہمیں بسا گوہر مارتا ہے۔"

"اُسے کیوں مارتا ہے بسا؟"

"کہتا ہے مجھے کہنی باغ کی ٹھنڈی کھوٹی سے پانی لا دو۔ بھلا استاد جی شام کو ہم وہاں کیسے جاسکتے ہیں؟"

"بسا گوہر شودائی ہو گیا ہے۔ تم آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں۔"

عید میلاد النبی کے جلوس میں ہم نے ایک ایک سبز جھنڈا اٹھام رکھا ہوتا۔ اور ہماری سیپی،
 کوشش ہوتی کہ جلوس ہمارے محلے سے ہو کر ضرور گزرے۔ اور پھر جلوس جب ہمارے محلے سے
 سے ہو کر گزرتا تو ہم بڑے فخر کے ساتھ کنکھیوں سے اپنی گلی کے بچوں کو دیکھتے جو دکانوں
 کے پھٹوں پر کھڑے رشک سے ہمیں تک رہے ہوتے۔ کترہ دھان سنگھ سے سکری باغ تک
 دھوپ میں جلوس کے ساتھ چلتے چلتے ہمارے چہرے سرخ ہو کر پسینے میں شرابور ہو جاتے
 لیکن ہمیں بھی تھکان یا گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

کہنی باغ میں ٹھنڈی کھوٹی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا گنجان درخت تھا جس
 کی پھلی ہوئی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں۔ میں اور ماسٹر نشار گلی کے ٹکوں کے ساتھ یہاں جھپٹ
 براہمن کھیلا کرتے تھے۔ میں ٹارزن کی طرح ایک ٹہنی کو پکڑ کر چھلانگ لگاتا اور جھولتا ہوا زنانے
 کے ساتھ دوسری ٹہنی پر جا پہنچتا۔ ماسٹر نشار ٹہنیوں کے بیچ کسی دو شاخے پر بڑے ٹھاٹھ سے
 بیٹھ جاتا اور پھر راہ اندر کی طرح گردن اکڑا کر ایک دم پکارا تھا "یہ آج میرا تخت کیوں بل رہا
 ہے؟" پھر خود ہی معاصی بن کر ادب سے گردن جھکا کر کہتا: "حضور آپ کا شاہی تخت جنوں کی
 گردنوں پر رکھا ہے جو آپ کو سبز پری کے محل کی طرف سے جا رہے ہیں۔"

ماسٹر نشار راہ اندر کے روپ میں مسکراتا اور پھر ایک ہاتھ اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔

ہاؤم۔ راہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام۔ ہاؤم

سبز پرئی پر عاشق ہوں میں عشق ہے میرا کام ہاؤم

برسات کے دنوں میں ہم دو موٹری نہر کے کنارے کنارے لمبی سیر کرتے۔ لبالب نہر

میں تیرتے ہوئے سبز، زرد، سرخ، انمول اور مردوں کو چھلانگیں لگا کر کھڑتے، نہر کی پلایا پر کھڑے
 ہو کر مٹھیاں چوم کر پانی میں کود جاتے اور مردہ تار لگایا کرتے۔ کبھی غوطہ لگا کر نہر کی تہ سے مٹھی
 بھر گیلی دیت اٹھا کر لاتے اور اُس سے اپنے دانت مانجھتے کیونکہ ہم نے بڑوں کو یہی کرتے دیکھا
 تھا۔

جنوری فروری کی سردی میں جب باغ اُجڑ جاتے تو ہم مرد کے باغوں میں نکل جاتے اور
 درختوں پر لگے لکڑے کے امرود توڑ توڑ کر اُدھا کھاتے اور اُدھا پھینک دیتے۔ بارش شروع ہو جاتی تو
 ہم ٹاہلیوں کے گرتے پتوں میں پھینکتے گھر واپس آ جاتے۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اسی کہنی باغ کے درختوں پر کھیتے۔ پلایا پر سے نہروں میں چھلانگیں لگاتے
 اور ڈیوڑھی میں سرخی پاؤں تھوپے "شکنتلا" کھیتے رہیں گے اور وقت کبھی نہیں گزرے گا۔ لیکن
 وقت گزرتا چلا گیا، اور پھر وقت جب ایک اہم موڑ پر سے گزرا تو ہم سے امرتسر کہنی باغ، مال
 بازار سکری باغ، بجلی والی نہر اور مسجد خیر الدین ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ جب ہم کہنی باغ کی نہروں
 میں چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے اور ماسٹر نشار آنکھیں بند کر کے ڈھولک بجاتے ہوئے لپٹا
 مجنوں کے گانے گارنا تھا۔ اُس وقت برصغیر پاک و ہند کے مسلمان یٹڈ مسلمانوں کے لئے ایک
 علیحدہ مملکت پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے جہاں مسلمان عزت و اکبر کی زندگی بسر کر
 سکیں ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک روز جو ہم نہر سے ڈبلی لگا کر نکلے تو امرتسر میں
 چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ آگ لگی تھی، ہم پھٹ رہے تھے۔ دھواں ہی دھواں تھا۔
 لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ آگ ہی آگ تھی۔ لبالب بھری ہوئی ٹھنڈے پانیوں کی نہریں سوکھ گئی
 تھیں۔ باغ اُجڑ گئے تھے۔ ٹھنڈی کھوٹی کے پانی میں انسانوں کا گرم خون آن ملا تھا۔ مسجدوں کے
 حوض خشک ہو گئے تھے۔ ہم نے امرتسر چھوڑ دیا۔ امرتسر نے ہمیں چھوڑ دیا۔

ختمہ حال زخمی، بیمار، نیم جاں مہاجروں کے لئے پتے قافلے لاہور کی سرحدوں میں داخل
 ہو رہے تھے ہر طرف ایک افراتفری، ہیجان اور پریشانی کی فضا طاری تھی۔ بہن بھائی سے، ماں
 بیٹے سے، بیٹا باپ سے اور خاوند بیوی سے بچھڑ گیا تھا۔ لاہور سٹیشن پر کٹی ہوئی گاڑیاں چلی آرہی تھیں
 وقت گزرتا چلا گیا ماسٹر نشار سے نہ مل سکا۔ مظلوم ہوا کہ وہ کسی گاڑی کی طرف نکل گئے ہیں۔

پاکستان کو معرین وجود میں آئے۔ دس گیارہ برس گزر گئے۔ ایک روز میں انارکلی بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے بانو بازار کے کونے پر ایک دکان کے باہر ماسٹر نثار کو سڑک پر بیٹھے ایک الماری کو مرمت کرتے دیکھا۔ اُس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی گئی تھیں۔ کپڑے میلے، بوسیدہ اور پیوند لگے تھے۔ وہ برے سے تختے میں سوراخ ڈال رہا تھا۔ اور اُس کے سفید بالوں میں لکڑی کا بورا پڑا تھا میں چپکے سے اُس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی زرد ویران آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر وہ میرے گلے لگ گیا اور ہلکے ہلکے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا: "ماسٹر نثار! یہ کیا حال بنا لیا تم نے اپنا؟"

ماسٹر نثار میلی قمیض سے آنکھیں پونچھ کر دھیرے سے مسکرایا اور خشک آواز میں بولا: "باڈھیڈ! نیور مین!"

امرتسر کی میاں پوترو

امرتسر کی ایک سردرات — کمپنی بارغ کے درخت۔ جنوری کی دھند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک گہرا آلود خاموشی ہے جو سناناں شہر کے گلی کوچوں میں اتر آئی ہے۔ ابھی شہر میں بجلی نہیں آئی۔ لمپوں کی روشنی کہیں کہیں سردی میں ٹھٹھک رہی ہے۔ آسمان پر ستارے سفید برف کے ثقافت ٹکڑوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ روڑاں والی مسجد کے والان کی گلابی سلیس رخ ہو رہی ہیں۔ امرتسر کے بچے، بوڑھے، جوان، گرم لحافوں میں دبکے گہری نیند سو رہے ہیں۔ مکانوں کے کواڑ بند ہیں۔ گھروں کی منڈیریں، مٹیاں، بکتوں کی کابکین، ٹین کے چھتر، ریل کی پٹریاں اور بھائیاں والے بارغ میں امردوں کے اجڑے ہوئے درخت اوس میں بھیگ رہے ہیں۔

آدمی رات گزر گئی ہے۔ ٹھٹھکی رات شہر کے ہونٹوں پر اپنا برف آلود ہاتھ رکھ کر خوب میں کھو گئی ہے۔ بازار بکرواناں کے ایک دو منزلہ مکان میں دیپے کی لومدھم ہو رہی ہے۔ چھ سات برس کی ایک بچی لحاف اوڑھے سو رہی ہے۔ ساتھ والی چارپائی پر ایک عورت لحاف کے اندر کانگری لے لے دم بخود بیٹھی ہے۔ فیروزی شال میں لپٹا اس کا چہرہ ساکت ہے۔ کان کسی آواز پر لگے ہیں۔ یہ آواز اس نے ابھی ابھی سنی تھی۔ ادھیڑ عمر کی یہ سرنخ و سپید عورت لحاف کے اندر کانگری لے لے سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی چارپائی کو ہلایا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اور پھر اس نے ایک آواز سنی۔ ڈراؤنی، رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز، جسے سن کر امرتسر پتھر ہو جاتا تھا۔ جس کی دہشت نے ایک طویل عرصے تک امرتسر کی سناناں راتوں کو آسیب زدہ بنائے رکھا۔ یہ آواز دور سے آتی سنائی دیتی تھی اور کسی عورت کی آواز تھی۔ زمین کی گہرائیوں سے نکل کر ساکت آسمان کی دستوں میں گم ہوتی ہوئی ایک کرب انگیز چیخ کی آواز۔ اس بیسی کرتی آواز کے ساتھ دو

الفاظ بڑے صاف سنائی دیتے تھے۔ کشمیری زبان کے دو الفاظ۔

میان پوترو — میان پوترو

یعنی میرے بچو — میرے بچو!

ان الفاظ کی کانپتی ہوئی بازگشت نے شہر کی سرد ویران رات کو اور زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ جیسے کوئی عورت بال کھوئے قبرستان کی قبروں میں ماتم کرتی چلی آ رہی ہو۔

نیچے گلی میں موت کا سناٹا ہے۔ لحد کی خاموشی ہے۔ وہ عورت سانس روکے چارپائی پر بیٹھی ہے اس کے دونوں ہاتھ لٹاف کے اندر کانگری پر جے ہوئے ہیں۔ طاق میں دیا جل رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ آواز پھر سنائی دے گی۔ اور وہی سرگ آواز ماتی آواز پھر بلند ہوتی ہے۔ کوڑا اس بار بھی دوسرے آئی تھی شاید صحرے کے تالاب یا چٹا کنڑ کی جانب سے۔ عورت کانگری لٹاف کے اندر سے نکال کر چارپائی کے ساتھ فرش پر رکھ دیتی ہے۔ اور طاق میں جلتا دیا پھٹک مار کر بجھاتی ہے۔ دھواں اٹھنے والی کھڑکی کی کھڑکی چڑھا کر بچی کو اپنے ساتھ لگا کر لٹاف اوپر کر لیتی ہے۔ وہ گھر میں اکیلے ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ کانگری کی راکھ میں دبے ہوئے اٹھ بے دمگی چمک دینے لگے ہیں۔ اس کا غم کشمیری ٹالیں خریدنے سے مرئی مگر گئی ہوا ہے۔ یہ بچی اس عورت کے مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔ بچی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ اندھیرے میں ڈر کر پھوپھی سے کہتی ہے۔

آپنی۔؟

عورت کے ہونٹوں پر اٹھ رکھ دیتی ہے۔

دشہ۔؟

بچی ہم کر اپنی پھوپھی کے ساتھ لگ جاتی ہے عورت کی آنکھیں اندھیرے میں پوری کھلی ہیں جیسے وہ اس بھیاٹک آسیبی آواز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے کان گلی کی سسنان خاموشی پر لگے ہیں اور پھر اچانک وہی آواز ایک بار پھر سنائی دیتی ہے۔ عورت کا دل اچھل کر اس کے حلق کے قریب آجاتا ہے۔ پہلے وہ آواز شہر کے دوسرے کنارے سے آئی تھی اور اب۔ اب وہ آواز گلی میں بلند ہوتی تھی جیسے کسی عورت نے گلی میں مکان کے بند دروازے کے ساتھ منہ لگا کر چیخ ماری ہو۔

میان پوترو — تو رہے لگیں!

دھیرے بچو! سردی لگتی ہے!

بچی کو سینے سے لگائے وہ عورت لٹاف میں لیٹی برف کی ماتہ منجمد ہو جاتی ہے۔ خوف اور ہشت سے اسے پسینہ آگیا ہے۔ وہی ڈراؤنی آواز گلی میں ایک بار پھر بلند ہوتی ہے۔ اب وہ عورت ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھتی ہے۔ خوف سے کانپتی ہوئی بچی کو لٹاف کے اندر دبا کر کانگری اٹھاتی ہے۔ کھڑکی کے پاس آکر کھڑکی اترتی ہے اور کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر کانگری کی لگ گلی میں الٹ دیتی ہے اور تیزی سے کھڑکی کو کھڑکی لگا کر لٹاف میں آکر بچی کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ سُرخ انگارے گلی میں گرتے ہیں تو کسی عورت کی بھیاٹک چٹخیں بلند ہوتی ہیں اور پھر یہ چٹخیں گلی سے نکل کر شہر کی سسنان فضاؤں میں بہت دیر چلی جاتی ہیں پھر شہر کے دوسرے کنارے پر جا کر ان چٹخوں کی دہشتناک آوازیں گم ہو جاتی ہیں۔

یہ منظر جو میں نے بیان کیا اور جسے آپ نے پڑھا آج سے کم و بیش ساٹھ ستر برس قبل امرتسر کی ایک سردرات کا منظر تھا۔ اور وہ بچی جو اپنی پھوپھی کے ساتھ لٹاف میں خوف کے مارے دیگی ہوئی تھی۔ میری والدہ تھی۔ جنہیں میں اپنی جی کہا کرتا تھا۔ سُرخ و سپید۔ بھاری بھر کم باوقار خاتون۔ گول چاند ایسا پُر حلال چہرہ جہاں بیٹھی ہوئی ارد گرد کی فضا ایک سنجیدگی اور جذب کی کیفیت میں ڈوب جاتی۔ کم سخن اور کم آمیز۔ سب سے زیادہ مجھ سے پیار کیا اور زندگی بھر سب سے کم مجھ سے بات کی۔

امرتسر میں تھے تو راتوں کو ہمیں "میان پوترو لگتی" کہہ کر ڈرایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بچوں کو سرشام ہی بستر کی طرف لائٹ دیا جاتا۔ ہم گلی کی طرف بھاگتے۔ اور یہیں ہیں اٹھا اٹھا کر بستر کی پر پٹختیں۔

سو جا۔ نہیں تو میان پوترو آجائے گی۔

اور ہم اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بستر میں سمٹ جاتے جس نے زرد آنکھوں والی سیاہ خونخوار ملی کو اپنی طرف اُتے دیکھ لیا ہو۔ میان پوترو امرتسر کی چڑیل تھی۔ اس کا نام ہی سن کر ہم کانپ جاتے اور ہمارے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی تھی۔ امرتسر کی ماٹیں بہنیں شہر اور نہ سونے والے بچوں کو میان پوترو کی آواز نکال کر ڈراتی تھیں اس آواز کے ساتھ ہی ایک چڑیل کی شکل سامنے آ جاتی کہ جس کے بال کھلے ہیں۔ دونوں پاؤں اٹھے ہیں۔ دانت باہر نکلے ہیں اور وہ بائیں پھیلائے ہماری طرف بڑھ رہی ہے خوف کی ایک سنناٹ سی خون میں اترتی اور ہم سو جاتے یا بے ہوش ہو جاتے

کر پھر سے پتہ کرنے لگے۔ رونا ننگ ہونے کی وجہ سے ہی شاید انہیں بھی میان پوترو کے بارے میں حقیقت پسندانہ توضیح پسند نہیں تھی۔ جب کبھی میں ان سے میان پوترو کے بارے میں بات کرتا تو وہ سبز چائے کی پیالی میں بھونک مار کر ایک گھونٹ پیتے اور سفید مونچوں پر بڑی نفاست سے انگلی پھیر کر کہتے۔
 ”میان پوترو کشمیر کی چڑیل ہے۔ اھہ کاٹنے لیک ہر بتایا تھا کہ وہ پہلے ٹن مرگ میں رہتی تھی۔ جب وہاں بہت لوگ مرنے لگے تو ایک روز وہاں سے کوچ کر کے امرتسر آگئی۔ دوپہروں میں بانوں میں نہ جایا کرو۔“
 ”مگر وہاں ادا جان! میان پوترو تو رات کو نکلتی ہے۔“

”تمہارے خالو کبہ رہے تھے کہ ایک آدمی تپتی دوپہر میں کپنی باغ میں سے گزر رہا تھا کہ میان پوترو نے آواز دی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے گر کر مر گیا، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں دوپہر میں کپنی باغ میں نہ جاؤں۔ کپنی باغ ہی میرا گھر میرا ہوٹل اور میرا سکول تھا۔ گھر سے بھاگ کر کاسریڈ ہوٹل کے دوستوں سے بھاگ کر سکول سے بھاگ کر میں اگر کہیں جاتا تھا تو کپنی باغ میں۔ آج میرا کپنی باغ بچے سے بچہ چمکا ہے شاید اسی لئے میں اب گھر سے کبھی نہیں بھاگتا سوچتا ہوں بھاگ کر جاؤں بھی تو کہاں پہلے تو صرف ایک ہی سڑک تھی جو سیدھی کپنی باغ کو جاتی تھی اور اب میرے ارد گرد سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے مگر ان میں سے ایک بھی سڑک کپنی باغ کو نہیں جاتی وحدت الوجود سے کثرت الوجود میں آگیا ہوں اللہ مجھے توحید کی توفیق دے پچھلے دنوں ایک عزیز ویزا لے کر امرتسر گئے تو مجھ سے پوچھا تمہارے لئے امرتسر سے کیا لاف؟ میں نے کہا کپنی باغ کا کوئی بھول لے آئیے گا۔ انہوں نے والپسی پر مجھے نکل کا ایک سرنج بھول لاکر دیا یہ بھول وہ کپنی باغ کی ایک روش سے اٹھا کر لائے تھے وہ بھول میرے پاس پڑے پڑے سیاہ ہو گیا ہے رنگ اڑ گیا ہے مگر کپنی باغ کی ہلک اس میں سے اب بھی آتی ہے۔“

لیکن ان دنوں تو گرمیوں کی ٹھنڈی صبحیں تپتی دوپہریں اور شامیں کپنی باغ کی چھوٹی نہریں چلا گئیں لگاتے گزرتی تھیں۔ میان پوترو کا خوف مجھے کپنی باغ میں بہت ہی کم آتا تھا شاید میان پوترو بھی اس خوبصورت باغ میں اگر درخت بن جاتی تھی ایک روز شام کو میں نہر سے نہا کر نکلا تو پردہ کلب کی طرف آگیا یہاں ناشپاتی کے بے شمار درخت پھلوں سے بھرے ہوئے تھے باغ میں شام کا سرنج

اندھیرا پھلتے لگا تھا برسات کے دن تھے ٹھنڈی کھوئی واسے آموں کی طرف سے کوئل کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ میں نے سوچا دو چار ناشپاتیاں توڑ کر لے جاؤں پردہ کلب کے عقب میں رکھوا دوں کی جھونپڑی تھی کسی وقت رکھوا لے کی آواز بلند بلند ہو جاتی تھی میں جھاڑیوں میں سے نکل کر پردہ کلب میں آگیا۔ ناشپاتی کے درختوں کی کچھ شاخیں کلب کے لان میں جھکی ہوئی تھیں۔ زردی مائل سبز ناشپاتیاں توڑ کر نیکر کی جیب میں بھر لیں اور واپس مڑا ہی تھا کہ اچانک ایک ہاتھ نے پیچھے سے میری قمیض پکڑ کر کھینچی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پٹ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا میں دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

پردہ کلب کی جھاڑیوں کو چیرتا ہوا باہر نکلا اور فھیلیوں واسے طالب کے اوپر سے ہو کر رہا تھا کہ ایک سفید برقع والی عورت نے اچانک میرے سامنے آکر کہا۔
 ”وے اختر!“

اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں کیسے ٹھنڈی کھوئی اور وہاں سے اپنے گھر پہنچا دو روز میں بخار میں مبتلا رہا۔ تیسرے روز آپو جی کو ڈرتے ڈرتے یہ واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا۔
 ”وہ ضرور میان پوترو تھی۔ خبردار جو تو اب کبھی کپنی باغ گیا۔“

بخار سے اٹھا تو ایک روز امرود توڑنے گئی منڈی واسے قبرستان میں نکل گیا یہ قبرستان ہمارے محلے کٹراہ مہاں سنگھ کے پاس ہی تھا امرتسر کے قبرستانوں میں بھی لوگوں نے پھلوں کے باغ لگا رکھے تھے لوکاٹ، امرود، آلوچہ، ناشپاتی، فالسہ اور شہتوت کے درختوں کے جھنڈے اُگے تھے۔ بیچ بیچ میں قبر بھی بنی ہوئی تھیں۔ بڑے بہشتی تھے امرتسر کے آسودگان خاک بھی ایک چھوٹی سی نہر گئی منڈی واسے قبرستان کے پہلو سے ہو کر گزرتی تھی اور پیچھے درختوں سے ٹپکے ہوئے پھل اس نہر میں تیرتے چلتے آتے اور ہم پانی میں اتر کر انہیں نکال کر کھایا کرتے تھے۔ عید کی صبح کو ہم منہ اندھیرے قبروں پر آکر موم بتیاں روشن کرتے اگر بتیاں جلاتے اور گیندے گلاب کے پھول بکھیرتے اور درختوں سے کھیری رنگ کی لوکاٹیں اور کچے کچے امرود توڑ کر بھی کھاتے۔

میں دورہ مہاں سنگھ سے نکل کر تکیہ سنی سرور کی طرف چلا ساؤں کی گھٹانے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تکیے کے قریب سے گزرا تو بودی سائیں کی سریلی آواز سنائی

دی۔ وہ گھر پر گار ہوا تھا۔

ایہ بدل جو اُس نے
دھوئیں میرے دل والے
آسمانیں چھائے نے

اس ترس کی گھٹاؤں کے بادل واقعی دلوں سے اٹھ کر آسمان پر چھایا کرتے تھے یہ دھواں نہ دل سے
اٹھتا ہے نہ جہاں سے اٹھتا ہے اور نہ ہی باورچی خانوں سے اٹھتا ہے اگر کہیں سے اٹھتا ہے تو اونٹنی بس
دلوں کی گاڑیوں سے۔ برج پھولا سنگ کو پیچھے چھوڑ کر میں اس چوٹی سی سڑک پر آگیا جو قبرستان کو جاتی
تھی۔ دائیں بائیں پھلوں کے باغ شروع ہو گئے۔ طوطوں کی قطاریں امروہ کے درختوں کو جا رہی تھیں میں
بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو گیا ہوا میں قبروں پر سگتی، اگر بیویں کے ساتھ ساتھ امروہوں کی خوشبو بھی ملی ہوئی
تھی۔ اچانک میری نظر ایک سیاہ ناگ پر پڑی جو حجر سے پچاس، ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک قبر میں سے
اُدھا باہر نکلا پھن اٹھا کھڑا جھوم رہا تھا۔

ایک لمبے کے لئے میں اسی جگہ خوف زدہ ہو کر ساکت ہو گیا۔ سانپ کا پس چھڑا تھا اور اس کا سرخ
میری طرف تھا اگرچہ وہ مجھ سے کافی دور تھا۔ پھر بھی میں نے پیچھے کی طرف کھسکا شروع کر دیا جب کافی پیچھے
چلا گیا تو دل میں ایک احمقانہ سی خواہش پیدا ہوئی کہ عقب سے جا کر سانپ کو دیکھا جائے میں ندی پھلانگ
کر لوکاٹ کے درختوں میں سے ہوتا ہوا سانپ والی قبر کے عقب میں جا نکلا میں اب بھی اس قبر سے کوئی
چالیس پچاس گز کے فاصلے پر تھا مجھے سانپ کہیں نظر نہ آیا خدا جانے کہاں چلا گیا تھا بچپن کا شوق فضول
اور جرأت زندہ نہ مجھے کشاں کشاں قبروں میں آگے ہی آگے کیسے پھینتی لے گئی گھاس اور جنگلی پھولوں میں
چھپی ہوئی قبریں خاموش تھیں۔ سرانے کے پتھروں اور اینٹوں سے موم قیوں کی لگی ہوئی موم چپٹی تھی
میں رک گیا اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر یہیں کسی قبر سے کالا سانپ نکل آیا تو کیا ہوگا میں پیچھے
کو دوڑا اور ندی پر آگروم لیا۔ ندی کے گدے پانی میں ایک کچا اُم تیرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے پانی میں
اتر کر اسے اٹھایا اور مزے سے کھاتا ہوا امروہوں کے جھنڈ کی طرف ہاربا تھا کہ اچانک میری نظر اپنے
مرحوم دوست انجی کی دیوانی والدہ پر پڑی اس نے میلا کچھلا سفید برقع اوڑھ رکھا تھا نقاب اٹھا تھا اس
کے سفید بالوں کی ایک لٹ لٹک رہی تھی اور وہ اپنے لخت جگر کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ پھر ایک ایسی

اس نے بین کرتے ہوئے ایک دلہن پر چڑھ ماری۔

ایک چنچ گویا میرے اندر سے بھی نکلی اور میں دہشت زدہ ہو کر وہاں سے دوڑا میں درختوں سے
بچتا جھاڑیاں پھلانگتا جھاگا چلا جا رہا تھا کہ کسی شے سے ٹکڑ کرکھا کر مقور کی کانٹے دار جھاڑی میں گر پڑا
بے شمار کانٹے میرے بدن میں چبھ گئے۔ میرے جسم کو درد نے جیسے جکڑ دیا میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا
قبرستان کی حدود سے باہر نکلا تو ایک سادھو نے مجھے روک لیا۔ شاید اس نے میرے جسم میں چبھے
کانٹوں کو دیکھ لیا تھا۔

”مٹھر جاؤ، یہ مقور کے کانٹے ہیں اگر دیر کر دی تو یہ بدن کے اندر چلے جائیں گے۔“
سادھو نے مجھے کنوئیں کے پاس پیل کے درخت تلے بٹھالیا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے
ایک ایک کر کے میرے کانٹے نکالنے لگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں مقور پر کیسے گر پڑا۔ میں نے
کہا۔

”میان پوترو۔ وہاں۔“

پھر میں نے اسے بتایا کہ میان پوترو چڑیل میرے مرنے دوست اختر کی ماں کا سوپ ہل کر قبرستان
میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سادھو کی باتیں مجھے یاد نہیں رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس نے کمال دردمندی کے ساتھ
میرے جسم کے سارے کانٹے نکال دیئے تھے اور پھر مسکراتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھر کر آگے پل
دیا تھا۔ میں سادھو کا چہرہ بھی بھول گیا ہوں لیکن اس کے ہاتھ کے لمس میں جو انسانی مہروری اور دکھ درد
میں کسی انسان کے کام کا جذبہ موجزن تھا اس کی گرمی میں آج بھی اپنے جسم میں محسوس کرتا ہوں۔

میں نے ڈر کے مارے گھر اگر کسی کو یہ واقعہ سنایا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میان پوترو میرے
مرنے ہوئے دوست اختر کی ماں کے روپ میں آگئی ہے اور یہی ملتا کی ماری راتوں کو سنانا گلیوں
میں مکان کے باہر نہ کھڑی ہو اور مجھے آواز دے کر پتھر نہ بنا دے لیکن اختر کی ماں کو پھر کسی نے اپنے
نکسے میں نہیں دیکھا تھا وہ ادھر آتی ہی نہیں تھی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، دیرانوں میں گھومنا کرتی
تھی۔ دیوانگی کی حالت میں قبرستانوں، دیرانوں میں گھومنا کرتی تھی۔ اور یا پھر میرے خیال کے مطابق
گڑیوں کی سنانا راتوں میں شہر کی گلیوں میں اپنے پیارے بیٹے کو بین کرتی آواز میں بلایا کرتی تھی۔
وقت گزرتا گیا۔ ہم بڑے ہوئے تو اس ترس کے گلی کو چوں سے میان پوترو کی آواز غائب ہو چکی

تھی۔ صوف اس کی ایک دہشت ناک یاد باقی تھی اور مائیں اب بھی اپنے بچوں کو میان پوترو کا نام سے کر ڈیا کرتی تھیں۔ آپو جی کی زبانی معلوم ہوا کہ میان پوترو واپس کشمیر جا چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اختر کی دیوانی ماں بھی اپنے مردہ بیٹے کی تلاش میں دیرانوں اور قبرستانوں میں ماری ماری پھرتی، اسے پکارتی، اس کی یاد میں بین کرتی کہیں گم ہو گئی۔ کہیں کھو گئی۔ شاید اسے اس کے لخت جگر نے اپنے پاس جنت میں بٹا دیا تھا۔ سب مائیں جنت میں جاتی ہیں۔ اور جن کے کسں بچے وہاں پہنچ جائیں وہ تو اپنی ماؤں کے لئے جنت میں نعل و گہر کے محل بنا کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔

مذکور میان پوترو بھی جنت میں گئی ہوگی۔ کیا ہوا جو وہ چڑیل تھی۔ آخر وہ بھی ایک ماں تھی۔ جس کے بچے پرانی کو توانی کی عمارت کے پیچھے آکر مر گئے تھے۔ وہ بھی تو راتوں کو اپنے بچہ پڑے ہوئے بچوں کو رو رو کر آوازیں دیا کرتی تھی۔

”میرے بچو! میرے بچو!“

وقت کا پہیہ کچھ اور گھوما۔ پاکستان بن گیا۔ امرتسر ہم سے بچھڑ گیا۔ سب کچھ وہیں رہ گیا صرف یادیں ہمارے ساتھ آگئیں۔ ان میں میان پوترو چڑیل کی یاد بھی ہے۔ امرتسر کی مائیں شاید اب اپنے بچوں کو میان پوترو کا نام سے کرنا ڈراتی ہوں لیکن ان کے دلوں میں میان پوترو کی یاد آج بھی زندہ ہو گئی۔ میان پوترو چڑیل کی یاد میرے دل میں بھی زندہ ہے مگر مجھے اب اس سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ اب میں بچہ نہیں رہا۔ شاید اس لیے کہ اب تو امرتسر کی چڑیلیں بھی خوبصورت لگتی ہیں۔

پھر بھی کبھی کبھی لاہور شہر کی کسی سڑک، کسی گلی، کسی باغ کسی قبرستان میں سے گزرتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی عورت نے پیچھے سے آواز دی ہو۔

”وے اختر!“

اور میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اس لیے نہیں کہ میں پتھر نہ ہو جاؤں بلکہ اس لئے کہ جس۔ یاں پوترو نے مجھے آواز دی ہے کہیں وہ میری شکل دیکھ کر پتھر نہ ہو جائے۔

امرتسر کا ایک درویش

امرتسر کے ہال دروازے سے باہر نکل کر جب آپ داہنی جانب کو ہوں تو پہ تانہا رولی کے مزار کے پہلو میں ایک نالے کا چھوٹا سا پل عبور کر کے سامنے انجن پارک کا ریتلا میدان آ جاتا ہے۔ یہ میدان ریلوے کے اونچے پل کی ڈھلانوں کے سائے میں ہے۔ ان ڈھلانوں پر بزرگ کی اترائی کے ساتھ ساتھ لوسے کا جنگلہ لگا ہے جس پر یو کلیٹس کے گھنے درختوں کا سایہ پھیلا ہوا ہے۔ کونے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہوا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک کنواں اور اکھاڑہ بھی تھا۔ انجن پارک امرتسر کی سیاسی اور سماجی زندگی کی آماجگاہ تھی۔ یہاں اگر ایم اے او کالج اور ڈی اے دی کالج کے معرکہ خیز کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے تو مجلس احرار مسلم لیگ اور نیلی پوشوں کے ہنگامہ پرور جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔ کرکٹ میچوں میں ایم اے او کالج کے دینیات کے استاد حافظ نور شاہ صاحب زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے اور تسبیح کا ورد کرتے ہوئے دعا پڑھ پڑھ کر مروت حسین شاہ کو باؤ لنگ کرتے ہوئے دور سے پھونکیں مارا کرتے جب ہندو کالج کی وکٹ اڑتی تو حافظ نور شاہ اپنے خاک کی کوٹ اور خاکی کلمہ لکڑی میں بانہیں پھیلا کر اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور دوبارہ دھڑا دھڑا تسبیح اور دعاؤں کا ورد شروع ہو جاتا۔ مجلس احرار اور مسلم لیگ کے جلسوں میں لوگ گلے بچھاڑ بچھاڑ کر اسلام زندہ باد کے فلک شکاف نعرے لگاتے اور ڈٹ کر تیل کے قیمے والے پتھورے اور نان چھوٹے کھاتے۔ کیا مجال جو کسی کے گلے میں خراش تک بھی پڑتی۔

دلی بمبئی سے کوئی سرکس امرتسر آتا تو انجن پارک کے میدان میں آکر اترتا۔ منبو، قناتیں تن جاتیں۔ چولہا دریاں لگ جاتیں غار دار جنگلوں کی دوسری طرف زنجیروں سے بندھے ہوئے قوی الجشہ ہاتھی گھاس کے ڈھیروں کے پاس جھوٹے نظر آتے۔ پنجرہوں میں بند شرارتی بندروں کی خوشبو کی

آوازیں آتیں کبھی کبھی کسی بوڑھے شیر کی نجف سی "ہائیں ہائیں" بھی سنائی دے جاتی۔ سرکس کے ملازمین میدان میں ادھر ادھر بیٹھیں لگاڑنے اور جانوروں کو چارہ ڈالتے ہیں مصروف دکھائی دیتے۔ ہم رات کو سرکس میں کرتب دکھانے والوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پیروں غار دار جنگلوں کے پاس کھڑے رہتے مگر وہ لوگ سوائے رات کے دن کو کبھی دکھائی نہ دیتے تھے۔ انجن پارک کے مشرق میں مسجد نور تھی جسکی ٹوئیں سے ہم منزل لگا کر پانی پیا کرتے تھے اور جس کی اونچی چھت پر مناروں کے قریب کھڑے ہو کر ہم سرکس والوں کے چھپے ہوئے شیر کو دیکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ مغربی جانب گندے تالے کے پار پرل ٹاکیڑ کی پرانے طرز کی اونچی لمبی عمارت کھڑی تھی۔ اسے جہان سنگھ کا منڈا بھی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں یہ تھیٹر تھا۔ اور الفریڈ تھیٹر کیل اور کورنٹھین تھیٹر کیل کپیاں اس کی سیٹج پر آغا حشر کے کھیل کھیل کرتی تھیں۔ اندر سے اس کی گیلری یورپ کے تھیٹر گاہوں کی طرح بڑی منقش اور قدیم سٹائیل کی تھی۔ سینما کو عروج حاصل ہوا تو اس کی سیٹج پر پردہ لگا کر نجیت مودی ٹون کا "بھولا شکار" "طوفان میل" "روپ بسنت" پر بھات سینے ٹون کی "سیر نہ میری" "استریوں کا راج" اور "پڑوسی" ایسی فلمیں کی نمائش شروع ہو گئی نیو تھیٹر مازکی "دھوپ چھاؤں" "منزل" "ڈاکو منصور" اور "دیو داس" کی نمائش بھی اسی سینما ہاؤس میں ہوئی تھی۔ امرتسر کا یہ بڑا پرانا اور سب سے پہلا تھیٹر ہاؤس تھا۔

گندے تالے کی اس جانب ڈنڈے شاہ کا تکیہ اور تھوڑی سی آبادی تھی۔ اس آبادی کے مکانوں کی کھڑکیاں اور اکثر کے دروازے گندے تالے کے داہنے کنارے پر کھلتے تھے تکیہ ڈنڈے شاہ میں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کئی اینٹوں کی دو چار قبریں، ایک اکھاڑے اور دھریک اور نیم کے سایہ دار درختوں کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہاں ذرا پرے مسجد نور کے قریب ہی ایک اونچے چبوترے پر کسی بزرگ کا مزار مزار تھا جس کے درخت پر سبز اور سفید جھنڈے ہوا میں پھر پھڑپھا کرتے تھے۔

امرتسر کے جس درویش کی میں یہاں کہانی بیان کرنے لگا ہوں اُن کا مکان بھی اسی تکیہ ڈنڈے شاہ کی آبادی میں تھا۔ مکان کیا تھا بس گندے تالے کے کنارے کچی کچی اینٹوں کی ایک کوٹھڑی تھی جس پر کھیریل ڈال کر گارا پھیر دیا گیا تھا۔ اُس درویش کا نام حافظ شفیع تھا۔ اور اس جھوپڑی نما مکان

میں غالباً اُن کی بوڑھی والدہ صاحبہ رہا کرتی تھیں حافظ صاحب والدہ کی بے حد خدمت کیا کرتے حافظ صاحب بڑے زندہ دل محفل پرست، پرہیزگار، سنس ملکہ اور قناعت پسند درویش تھے۔ پان تمباکو کو قوام والا کھاتے۔ تمباکو بالکل نہ پیتے۔ چائے خود بنا کر اداس میں زعفران ڈال کر پیتے اور دوستوں کو پلاتے۔ تھوڑی تھوڑی طبابت بھی جانتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی مریض آجاتا تو اُسے اپنے پاس سے دوائی خرید کر اور گھوٹ کر بھی دیتے حافظ قرآن تھے اور نماز پنج وقتہ ادا کرتے تھے۔ بلا پتلا چھر پر ابدن ستوان ناک، باریک ہونٹوں کے پیچھے بھنی ہوئی مونگ پھلی کے دانوں ایسے ہموار دانت فرخ کٹ حقیر سی ڈارھی اور باریک مونچھیں۔ نرم چمکیے سیاہ بالوں کے پٹے گھر میں دھلی ہوئی بغیر استری کی قمیض اور شلوار، پاؤں میں باٹا کی چل۔ سردیوں میں لونی کی لیگل مار کر ساری ہڈیاں گزار دیتے ہرن ایسی بڑی بڑی آنکھوں میں سرے کی لکیر اور ہونٹوں پر ہر دم کھیلی زندہ دلی کی مسکراہٹ یہ تھے ہمارے درویش دوست حافظ شفیع۔

انہوں نے مسجد شیخ خیر الدین مرحوم میں ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ یہ بال بازار میں میرہ منڈی کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ مسجد خیر الدین میں داخل ہوتے ہی ایک چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گھورتا پڑتا تھا۔ اس ڈیوڑھی میں ہر موسم میں ٹھنڈا ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ کونے والے ستون پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس ستون کے پہلو میں ایک حجرہ تھا جس میں حافظ شفیع کا ڈیرا تھا۔ حجرے میں ایک صرف بجھی تھی۔ کونے میں ایک حازم پر صند وچھی رکھی تھی۔ المدی میں شرع، فقہ اور حدیث شریف کی پرانی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک دھنسر۔ دو چوڑے قمیض شلوار اور ایک پرانا بستر۔ یہ حافظ شفیع کی کل کائنات تھی میں سردیوں میں عشا کی نماز کے بعد حافظ صاحب سے ملنے اُن کے حجرے میں جاتا۔ مسکرا کر سر کو والہانہ انداز میں جھٹکتے اور کہتے۔

”سبحان اللہ!“

یہ اُن کا تکیہ کلام تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو اُس وقت بھی انہوں نے سر کو آہستہ سے جھٹک کر کہا تھا۔

”سبحان اللہ!“

میں لکڑی کی پرانی صند وچھی کے پاس حازم پر کشمیری فرد کی لیگل مار کر بیٹھ جاتا حافظ

صاحبِ فوراً دھواں کھائے سماوار میں کوئلے ڈالتے۔ کاغذ جلا کر اُس میں آگ سلگائے اور پانی میں چائے کی پتی ڈال دیتے۔ جب چُربے کی فضا میں چائے کی پتی ڈال دیتے۔ جب چُربے کی فضا میں چائے کی ہمک اڑنے لگتی اور سماوار کی ٹونٹی بھاپ دینے لگتی تو الماری میں سے سبز پتوں والے چینی پیالے نکالتے۔ ایک نسواری شیشی کا ڈھکن بڑی احتیاط سے کھول کر اسے منگلتے اور آنکھیں بند کر کے سر ہلا کر کہتے۔

« سبحان الله »

پھر مجھے سنبھاتے اور کہتے۔

» بیٹ صاحب اسے کہتے ہیں اصلی زعفران «

مختوراً مختوراً زعفران وہ دونوں پیالیوں میں ڈالتے۔ اور چائے کی محفل گرم ہو جاتی حافظ صاحب رومی اور شیخ سعدی کے فارسی شعر سناتے لگتے۔ وہ رومی اور سعدی کے عاشق تھے میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی محبت سے زعفرانی چائے پیتے اور رومی و سعدی کے شعر پڑھتے دیکھا ہے۔ چائے کے بعد وہ کسی لڑکے کو بھیج کر چوک سے پان منگواتے۔ بڑے سلیقے سے پان منہ میں رکھ کر جیب سے رد مال نکال کر ہونٹوں کے کنارے پر نہتے اور جھوم کر کہتے۔

”سبحان اللہ! توام چوک والی ہی بنا سکتا ہے۔“

اگر میں یہ کہوں کہ حافظ شفیق کو زندگی اور خدا کی نعمتوں سے پیار تھا اور وہ ان چیزوں کی قدر کرتے تھے تو یہ تکلف ہوگا۔ دراصل حافظ صاحب زندگی اور خدا کی نعمتوں کا ایک حصہ تھے۔ وہ کسی اچھائی یا نیکی کے کام کو اصول سمجھ کر سرانجام نہیں دیتے تھے بلکہ یہ فعل خود بخود اُن سے ہو رہا تھا۔ اور اصول نہتے چلے جا رہے تھے۔ اصل میں وہ زمانہ ہی اچھے افعال کا تھا۔ اصولوں کی تبلیغ کا نہیں تھا۔ حافظ صاحب معمولی سے معمولی کام کو بھی اس طرح کرتے جیسے وہ کسی بہت بڑی ایجاد کی بنیاد رکھ رہے ہوں وہ سڑک پر اس مزے سے چلتے جیسے دلدلوں میں سے نکل کر پہلی بار پکی سڑک پر قدم رکھ رہے ہوں۔ بالکل اس طرح بہک بہک کر کرتے گویا ایک مدت کی خاموشی کے بعد انہیں پہلی بار زبان ملی ہو۔ چائے یوں شوق سے پیتے جیسے وہ اُن کی آخری پیالی ہو اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بس یہی کوئی تیس تیس برس کے ہوں گے ایک بال بھی سفید نہیں تھا۔

پتلے دُبلے بدن میں ہرن ایسی چستی تھی صانعِ خُون میں محنت اور حلال کی کمائی گردش کر رہی تھی۔ مسجد میں آئی ہوئی روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ والدہ کی وفات کے بعد جھونپڑی پر کسی دھڑکے نے قبضہ جمانا چاہا تو آپ نے اپنا بستر سر پر اٹھایا اور سبحان اللہ کہہ کر مسجد خیر الدین میں آ کر ڈیڑھ چالیا۔ اُن کی شرع، حدیث شریف اور فقہ کی باتوں کے اسرار و رموز میری ناپختہ سمجھ سے باہر تھے۔ میں اُن کی درویشانہ سکراہٹ، اور اچھی اچھی باتوں کا شنیدائی تھا۔ رمضان شریف میں وہ تحصیل پورے والی مسجد میں تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ مسجد تحصیل پورے کی مسلمان آبادی میں ایک گلی کے کونے پر تھی۔ حجرے میں دو تین مولوی صاحبان بیٹھے ڈاڑھیوں میں ہاتھ پھیر پھیر کر بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہے تھے میں نے بھی کندھوں پر مدیتے شریف کا بستی رومال ڈال رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک مولوی صاحب نے حافظ شیف سے پوچھا۔

”یہ بر خوردار بھی حافظِ قرآن ہیں کیا؟“

اور حافظ شفیق نے بلا جھجک کہا۔

”جی ہاں! جی ہاں! سبحان اللہ“

بعد میں جب میں نے پوچھا کہ حافظ صاحب آپ نے ٹھوٹ کیوں بول لیا تو سر ہل کر بولے
 ”سبحان اللہ! خدا جھوٹ نہ بلوائے۔“

میں پہلی صف میں حافظ شفیق کے پیچھے کھڑا ہو کر تراویح پڑھتا۔ تراویح کے بعد جب انہیں دوسرے بھرا ہوا گلاس ملا تو پہلے اُدھانچے پلاتے اور جھوم جھوم کر کہتے۔

کیوں خواجہ صاحب ؟ اسے کہتے ہیں خالص دودھ میں نے اُن کی جیب میں دو تین
آنکوں کے سوا کبھی ایک پانی نہ دیکھی تھی۔ انہیں فالتویہ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ حُجْرے میں
وہ بچوں کو فارسی اور قرآن شریف پڑھاتے مگر اُن سے کچھ نہ لیتے۔ مسجد فیہ الدین کا فرش
دھوئے۔ برادرؤں میں جھاڑو دیتے۔ سقاوے صاف کرتے۔ نماز کے وقت بچوں کے
ساتھ مل کر صفیں بچھاتے لیکن مسجد میں لگی محلے سے جو طرح طرح کے کھانے آتے اُن میں سے
ایک لقمہ تک نہ لیتے۔ جو بھٹوری بہت طہابت انہوں نے سیکھ رکھی تھی بس اُسی پر

قناعت تھی۔ دو چار آنے کی دوائیں روز بک جاتی تھیں۔ تنور سے دال روٹی منگو لو، میں
چمچے میں بیٹھ کر کھا لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر سواد میں چائے کے لئے کوئلے سلگاتے
لگتے۔

ایک بار بال بازار کے مشہور لکھتی تاجر نند لعل کا اکلوتا لڑکا کنڈن لعل سخت بیمار پڑ
گیا۔ وہ میرا ہم جماعت بھی تھا۔ اُس کے سپیٹ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور حالت روز بروز
تشویش ناک ہوتی جا رہی تھی نند لعل اپنے بیٹے کنڈن لعل کے لیے انتہائی پریشان ہو گیا۔ اُس
نے گھر پر امرتسر، جالندھر اور لاہور کے نامی گرامی ڈاکٹروں کو جمع کر دیا۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ
یہ سارے ڈاکٹر مل کر بھی کنڈن لعل کی بیماری کو دور نہ کر سکے۔ اُس کی حالت بگڑتی چلی گئی میں
نے کنڈن لعل کے تاجی سے کہا کہ حافظ صاحب کو بھی دکھالیں کیا خبر اللہ شفا دے دے۔ لالہ
جی خود حافظ صاحب کو لے کر گھر آئے۔ کنڈن لعل کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ دونوں میں
وہ سوکھ کر لٹا ہو گیا تھا اور نقابہت کے عالم میں ایک شاندار پلنگ پر لیٹا نحیف سانس لے
رہا تھا۔ اُس کی ماما جی سرانے سر جھکائے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ میز پر بڑی بڑی قیمتی دوائیں
پڑی تھیں۔ لوہے کی الماریوں اور آہنی سیفوں میں ہزاروں روپے کے زیورات بند پڑے
تھے مگر کنڈن لعل کو کوئی نہ بچا سکتا تھا۔

حافظ صاحب کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ماما جی نے سفید ساڑھی کا گھونگھٹ سا نکال لیا۔
حافظ شفیق نے بسم اللہ پڑھ کر کنڈن لعل کی نبض ٹوٹی اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر بعد
آنکھیں کھول کر مسکرائے اور نند لعل سے بولے۔

”فکر نہ کریں لالہ جی! بچہ اچھا ہو جائے گا۔ سبحان اللہ!“

پھر چپ میں سے ٹین کی ایک ڈبیا نکال کر اُسے کھولا۔ اس میں سے ننھی ننھی چھ بڑیاں
نکال کر میز پر رکھیں اور کہا۔

”دو دو گھنٹے بعد پانی کے ساتھ ایک پڑیا دیتے جائیں۔ اللہ شفا دے گا خدا کی قدرت
کہ اگلے روز کنڈن لعل کی حالت سنبھل گئی۔ حافظ شفیق نے مزید چھ بڑیاں بھجوا دیں۔ تیسرے
روز کنڈن لعل پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا چوتھے روز وہ اپنے گھر میں چل پھر رہا تھا اور پانچویں دن وہ

اپنے والد کی دکان پر بیٹھا تھا۔ لالہ نند لعل اسی روز اپنے لخت جگر کو لے کر حافظ صاحب کے
پاس چمچے میں حاضر ہوا۔ میں بھی وہیں شال کی ٹنگل مارے صفت پر بیٹھا تھا۔ حافظ صاحب بہادر
میں کوئلے سلگائے سے ہوا کر رہے تھے لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر بندگی کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ
دو زانو ہو کر بڑے ادب سے صاف پر بیٹھ گئے۔ حافظ شفیق نے مسکرا کر کہا۔

”خدا نے آپ کے بچے کو شفا دے دی۔ سبحان اللہ“

لالہ نند لالہ بکھا جاتا تھا۔ بڑے انکسار سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”حافظ جی! میں آپ کی دوا کے پیسے دینے آیا ہوں۔ انہیں قبول کیجئے“ اس کے
ساتھ ہی لالہ جی نے جیب سے سو سو روپے کے بیس نوٹ نکال کر حافظ شفیق کے قدموں
میں رکھ دیئے۔ حافظ شفیق نے نوٹوں کو دیکھا۔ پھر لالہ جی کو دیکھا اور سر جھٹک کر مسکراتے
ہوئے بولے۔

”مگر لالہ جی! میری دوا تو تین گنے کی تھی“

میں وہ منظر ساری زندگی نہیں بھول سکتا کہ کس طرح امرتسر کا لکھتی تاجر لالہ نند لعل حافظ
شفیق کو دو ہزار روپے قبول کرنے پر اصرار کر رہے تھے اور حافظ شفیق کس بے نیازی سے
صرف تین آنے لینے پر بعد تھے دو ہزار روپے ۱۹۴۵ میں بیس ہزار سے کم نہ تھے۔ آخر
لالہ جی کو سارے نوٹ واپس لینے پڑے اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے تین آنے
نکال کر حافظ جی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ اُس وقت لالہ جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
انہوں نے فرط عقیدت سے حافظ شفیق کے پاؤں کو چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے پر لگائے۔ جب
لالہ جی چلے گئے تو حافظ شفیق نے پنکھا صاف پر پھینک کر دروازے میں سے سر باہر نکال کر
دیکھا کہ لالہ جی مسجد سے نکل گئے ہیں ۶ پھر جو پلٹے تو اُن کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
بچوں کی طرح مسرور ہو کر بولے۔

”سبحان اللہ! آج کی روٹی کا بندوبست ہو گیا بٹ صیب“

آج کی روٹی — یعنی دو پیسے کی دو روٹیاں اور پیسے کی دال — کسی وقت ہم
دونوں کمپنی باغ کی سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی جنازہ مل جاتا تو حافظ شفیق کلمہ شریف

پڑھ کر اس طرف لپکتے اور کندھا دے کر ساتھ ہو لیتے میں بھی اُن کے ساتھ ہو جاتا۔ محلے میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو حافظ شفیع بن بھلا تے ہی وہاں پہنچ جاتے۔ دریاں بکھا رہے ہیں۔ قناتیں رگڑ رہی ہیں۔ دسترخوان جھاڑ رہے ہیں۔ منوں میں پانی ڈلو رہے ہیں براتیوں کو پانی پلا رہے ہیں تھال بھر بھر کر پلاؤ اندر لے جا رہے ہیں اور جب برات چلی جاتی تو عمر تنور والے کی دکان پر آکر وہی دو روٹیاں اور دال لیتے اور سبحان اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے۔ صبح صادق کو اٹھ کر مسجد میں داخل دیتے مسجد کے صحن میں جھاڑو دھیتے اور منبر کو اپنے بسنتی رومال سے جھاڑتے۔ رمضان شریف میں سحری کے وقت محلے میں ہر گھر پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے اور صاحب خانہ کا نام لے کر اُسے جگاتے۔ افطاری کے وقت مسجد میں انواع و اقسام کے پھلوں اور کھانوں کے ڈھیر لگ جاتے مگر حافظ شفیع کو میں نے ہمیشہ نمک اور کھجور سے ہی روزہ افطار کرتے دیکھا۔ افطاری کے بعد میرے ساتھ ادا کرتے۔ تنور پر جا کر دال روٹی کھاتے اور پھر مجھے ساتھ لے کر تراویح پڑھانے تحصیل پورے والی مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سارا رستہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے رومی اور سعدی کے شعر سناتے۔ زعفرانی چائے کے فوائد پر لہک لہک کر باتیں کرتے۔ سبحان اللہ! کیا لوگ تھے!

حافظ شفیع سے امرتسر میں میری آخری ملاقات ۲۳ اگست ۱۹۷۷ء کو خریف پورے کے باہر ریلوے لائن پر ہوئی۔ امرتسر کے درو دیار فسادات کی آگ میں جل رہے تھے۔ شہر پر ہندو سکھ فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور امرتسر کے مسلمان مہاجرین سے بھری ہوئی ریل گاڑیاں شریف پورے سے پاکستان کی طرف جا رہی تھیں ہر شخص پریشان اور بے حال تھا۔ چہروں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں دیران ہو رہی تھیں۔ کسی کا میٹا شہید ہو گیا تھا تو کسی کا باپ۔ کسی کے بھائی کی لاش بے گور و کفن شہر کی کسی سڑک پر پڑی رہ گئی تھی۔ تو کسی کی بہن محلے کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر عزت کی موت مر گئی تھی۔ امرتسر جل رہا تھا۔ ہر طرف آگ اور خون کا کھیل جا رہا تھا۔

شریف پورے والی ریلوے لائن کے اُس پاس مہاجرین کا بسیلاب اٹھ آیا تھا بلوچ رجمنٹ کے جوان مشین گنیں سنبھالے جالندھر اور بٹالے کی طرف پوزیشنیں لئے بیٹھے تھے۔

شریف پورے کے اُس پاس کی آبادی کو مہاجرین کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ شہر میں رہے رہے مسلمانوں کے پریشان حال قافلے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ رات رات بھر شہر کی طرف سے ہندو اور سکھ فوجی اس کیمپ پر فائر کھول دیتے۔ سارے کیمپ پر ایک دہشت کی فضا طاری تھی۔ ہمارے خاندان کے تقریباً سیسہ افراد پہلی گاڑی میں لاہور روانہ ہو چکے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کس لئے اکیلا شریف پورے میں رہ گیا تھا۔ بہر حال میں ریلوے لائن کے پاس دوسرے ہزاروں مہاجرین کے ساتھ پتھروں پر بیٹھا پاکستان جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اتنے میں امرتسر ریلوے سٹیشن کی جانب سے چھک چھک کرتی خالی گاڑی آئی اور ہمارے پاس آکر رُک گئی۔ بس اس کے بعد کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی کے اندر، باہر اور چھت پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح ہجوم میں گھس گھسا کر ایک ڈبے میں سوار ہو کر کسی کے سامان پر بیٹھ گیا میں ایک آدمی کی ٹانگ اور دوسرے آدمی کے بازو میں سے کھڑکی کے باہر کا کچھ منظر دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف ایک شور، ایک ہنگامہ اور ایک قیامت برپا تھی۔ اتنے میں میں نے حافظ شفیع کو دیکھا۔ وہ ایک سیلا سا تھیلہ کندھے پر ڈالے ایک طرف سگنل کے کھمبے کے پاس کھڑے تھے انہوں نے دو ایک بار گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش بھی کی مگر لوگوں نے انہیں دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ایک بار پھر چپ چاپ سے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مجھے کافی فاصلے پر تھے اور میں انہیں آواز نہ دے سکتا تھا گاڑی چل پڑی۔ بچے کچے لوگ بھاگ بھاگ کر سوار ہونے لگے۔ میں نے دُور سے حافظ شفیع کو دیکھا۔ انہوں نے بھی ایک کر ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کی لیکن ایک آدمی نے جو پائیدان پر لٹکا ہوا تھا حافظ جی کا ہاتھ پر سے جھٹک دیا۔ گاڑی اب شریف پورے سے اُگے نکل آئی تھی۔ شریف پورہ کیمپ سے پاکستان آنے والی یہ آخری گاڑی تھی۔ اس کے بعد جو گاڑی بھی آئی اسے کاٹ دیا گیا۔ کچھ دُور تک میں حافظ شفیع کو دیکھتا رہا۔ وہ ریلوے لائن کے قریب اکیلے کھڑے، تھیلہ کندھے پر ڈالے چپ چاپ پاکستان کو جانے والی گاڑی کو تک رہے تھے۔ اُس وقت میں اُن کے پاس نہیں تھا مگر مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ایک بار ضرور سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا ہو گا۔

امرتسر کا اسد جو

نام اُس کا اسد جو تھا۔

سردیوں میں وہ محلے کی ایک جھکی ہوئی چھت والی بوسیدہ اور اندھیری دکان میں ہرلیہ بیچتا اور گرمیوں میں کوئی کام نہ کرتا عام طور پر وہ اس چھلپاتی دھوب اور گرم ٹووالے موسم میں کشمیر چلا جاتا جہاں امیر اکمل کے کسی قریبی گاؤں میں اُس کی رشتے میں کوئی چھوٹی رہا کرتی تھی۔ ستمبر کے شروع دنوں میں وہ کشمیر سے واپس امرتسر آتا تو اُس کا رنگ سرخ ہوتا وہ اپنے ساتھ کشمیر کے ابری سید، بادام اور دو ایک لونییاں ضرور لاتا۔ لونییاں وہ محلے میں ہی کسی کے ہاتھ بیچ دیتا اور بادام اور سید ہمالیوں میں باٹل دیا کرتا۔ ایک بار اباجی نے اسد جو سے بھڑے رنگ کی ایک لونی خریدی اور اُسے منڈا کر ہم بھائیوں کے کوٹ بنوا دیئے وہ اس قدر گرم تھے کہ پودہ ماگھ کی سردی میں بھی اُن میں گرمی محسوس ہوا کرتی۔ کئی سالوں تک اُن کوٹوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسد جو اپنے لمبے کوٹ کی جھولا نما جیب میں دو تین لال لال کشمیری سید نکال کر اباجی کو دیتا اور کہتا۔

”خلیفہ! ایسہ خاص تیرے لئے تحفہ اکی“

یہ امبری سید جس کمرے یا دکان میں کاٹے اور چھیلے جاتے وہاں کی فضا اُن کی ٹھنڈی اور انتہائی شریں خوشبو سے مہک اُٹھتی۔ اسد جو سردی کی اندرونی جیب میں سے لکڑی کے دستے والا پرانا چاقو نکال کر سید کی ایک قاش کاٹتا اور مجھے دے کر کہتا۔

”اوئے کھا اوئے می دے“

اسد جو کالہ بھٹ کشمیری تھا۔ وہ کشمیری زبان بڑی روانی سے بولتا تھا۔ امرتسر کے کشمیریوں

کو کشمیر کی دادی سے ہجرت کئے ایک دو پشتیں گزر گئی تھیں۔ اور اب اُن کے گھروں میں صرف، تانیاں دادیاں یا بڑے بڑے ہی تھوڑی بہت کشمیری بولتے تھے لیکن اسد جو کشمیر میں ہی پیدا ہوا۔ وہیں اُس نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ امیر اکمل والے اپنے گاؤں سے بدیا بستر اٹھا کر امرتسر آگیا اور پھر یہیں کا ہو رہا۔ اُسے کشمیر سے اُسے اٹھارہ انیس برس ہو چکے تھے جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اُس وقت اسد جو کی عمر پچاس برس سے دو ایک سال اوپر ہی تھی مگر اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ سرخ و سفید رنگ، اونچا لمبا چوڑے شانے، گنجان سیاہ بھونٹیں، تیز چمکدار عقاب آنکھیں۔ ڈارھی صفا چٹ، رعب دار بھری بھری مونچھیں چوڑے کانوں کی سرخ لویں، گویا ابھی خون ٹپک پڑے۔ پاؤں میں پمپ شو اور کبھی پٹاوری چل ہوتی۔ شلوار قمیض کے اوپر صدر کی پہن کر دھڑلے یا مثال اوڑھ لیتا۔ سر پر روس کے قازقوں والی جبت دار سمور کی ٹوپی چوزے رخ پہنتا تھا۔ دور سے یوں لگتا جیسے زار روس کی فوج کا کوئی پرانا تاناکا سپاہی چلا آ رہا ہے۔ آواز گرفت اور پاٹھ دار تھی۔ کبھی کبھی سردیوں میں پہلی جنگ عظیم کے فوجیوں کی برانڈی سے سنی ہوئی جیکٹ پہن کر نیچے فلائین کا گرم پاجامہ پہن لیتا۔ مگر سیٹ بالنگ نہ ہوتا تھا۔ مگر حقے کا بڑا رسیا تھا۔ ہرلیہ کی دکان پر نہ ہر وقت منہ می لگی رہتی۔ تمباکو نے دانت خراب کر دیئے تھے۔ سر درمیان ہی سے گنجہ تھا۔ ارد گرد کے بالوں اور مونچھوں میں کبھی کبھی سفیدی چھلکنے لگی تھی۔

سردیوں میں جس بوسیدہ دکان میں وہ ہرلیہ بیچتا وہ ہمارے محلے میں پکٹی لگی کے سامنے تھی۔ دکان کے باہر ایک پرانا رنگ خوردہ بورڈ لگا تھا جس پر فارسی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

یک پاؤ ہرلیہ صبح گاہی

بہتر از ہزار مرغ و قافہ

ہرلیہ بنانے میں اُس کا شہر میں کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کی دکان بڑی گندی اور گھٹی ہوئی تھی۔ چھت کی کڑیوں پر دھوئیں کی کالک جی تھی اور جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں پانی کے دو مٹکے تھک لٹک پڑے رہتے۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں اور جانے کس شے کی پٹلیاں لٹکی رہیں اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف ویڑھوٹ اُونچا اور کوئی چھ سات مربع فٹ چوڑا چوڑا تھا جس کے کناروں کی اینٹیں اکھری ہوئی تھیں۔ اس چوڑے کے بیچ میں مٹی کا بڑا سامٹ گڑھا تھا جس کا

چوترے کی سطح کے برابر تھانیچے بھنی تھی۔ اس مٹ میں جانے لگتے میر بکرے کا گوشت چنے کی دال اور انواع و اقسام کے مسالے ڈال کر اسد جو بھی کی ہلکی ہلکی آنچ پر رات بھر بڑے سے ڈنڈے سے گھوٹتا رہتا رات کے پچھلے پہر ہر لیبہ پک کر تیار ہو جاتا اور افان کے وقت گاہک آکا شروع ہو جاتے۔ اسد جو پو پٹے کی ٹھٹھرتی سردی میں دکان کے پٹ جوڑے دھواں بھری دکان اندر گرم حمام بنی ہوتی۔ اسد جو آستینیں چڑھائے کفگیر سے جھک کر مٹ میں سے ہر لیبہ نکال کر فرائی بین میں اور ک ڈال گھی کا تڑکا لگاتا اور گاہک کے برتن میں پٹ کر اوپر دو کباب لکھتا اور گرم مسالے کی چٹکی چھڑک دیتا۔ اکثر گاہک اپنا گھی ساتھ لاتے۔ میں بھی منہ اندھیرے کا کامدو کی دکان سے گرم گرم قلیچ لے کر پیالی میں گھی لئے اسد جو کی دکان پر پہنچ جاتا سردی سے میرے دانت بچ رہے ہوتے۔ لیکن اسد جو کی دکان کا پٹ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے کندھوں کے اوپر گرم لوئی ڈال دی ہو۔ د بکتی انگلیشی کے آگے بیٹھے اسد جو کا چہرہ سرخ ہو کر پیستے میں چپک رہا ہوتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کبابوں کے دیگے پر صافی پھیر کر کہتا۔

”آگئی میری چھوٹی خلیفہ جی“

دکان کی چھت دھوئی کے بادلوں میں چھپی ہوتی اور اندر گرم مسالوں کی تیز مہک پھیلی ہوتی۔ میری آنکھوں میں پانی آ جاتا اور تھوڑی ہی دیر بعد مجھے گرمی لگنے لگتی۔ لیکن اباجی کا حکم تھا کہ منکے سے نکال کر جب ہر لیبہ سرد ہوا میں گھرا لیا جاتا ہے تو اس کا اثر اڑ جاتا ہے۔ وہ خود اکھاڑے سے لڑتے ہوئے وہیں بیٹھ کر ہر لیبہ کھاتے تھے۔ اسد جو میرے لئے ہر لیبہ نکال کر فرائی بین میں اُسے گھی کا تڑکا لگاتا پھر میرے پیالے میں ڈال اُس پر دو کباب رکھ کر گرم مصالحے کی ہوائی چھوڑتا اور مجھے کھتا کہ کہتا۔

”منو کھاندی تے جان بناوندی چھوٹی خلیفہ جی“

چوترے میں دھننے بھاپ چھوڑتے ہریے سے بھرے ہوئے مٹ کے آگے بیٹھا، بڑی بڑی مونچھوں اور پینہ بھرے سرخ و سپید چہرے اور چوڑے شانوں والا اسد جو بڑی گرم جوشی سے ہر لیبہ نکال کر فرائی بین میں ڈال رہا ہوتا لائین کی روشنی میں اس کا بھوت نما سایہ عقی دیوار پر لہرا رہا ہوتا اور مجھے یوں لگتا جیسے وہ کوئی الف لیلا کا جین ہے جو بھوتوں کو کھانا کھلا رہا ہے

ہر لیبہ کھا کر جب میں دھواں بھری بند دکان کی گرم فضا سے باہر نکلتا تو دسمبر جنوری کی سب سے سردی میں بھی مجھے پینہ آ رہا ہوتا۔

سورج نکلنے سے پہلے اسد جو کا سارا ہر لیبہ ختم ہو جاتا۔ پھر وہ اپنے لئے رکھی ہوئی ہریے کی تیلی ٹوٹی الماری میں سے نکال کر اُسے کم از کم تین چھٹانک گھی کا تڑکا لگاتا اور تین چار قلیچوں کے ساتھ ڈٹ کر کھاتا اس کے بعد وہ بوہڑ والی مسجد میں جا کر صبح کی نماز ادا کرتا اور مسجد کے حجرے میں لوئی اور ڈھکڑ سو جاتا۔ پھر میں سکول سے واپس آتا تو اسد جو کو شاد سنار کی دکان پر سارا دیکھتے دیکھتا۔ شاد سنار کی دکان پر پڑھے لکھے اور با ذوق لوگوں کی ایک سڑلی اگر بیٹھا کرتی تھی دن میں گورے چٹے بھاری بدن اور بڑے خوبصورت سہوار موتیوں ایسے دانتوں والا بابو محمد حسین بٹ تھا۔ جو ریوے میں ملازم بٹ صاحب کے گھر میں انگریزی پڑھنے جا یا کرتا تھا۔ میں بچے بھول جاتا تو میرا کان مروڑ کر غصے میں کہتے۔

”کیا جھک مار رہے ہو“

”جھک“ کے لفظ کو وہ پنجابی میں ”چہنچ“ کہتے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ یہ لفظ ادا کرتے تو مجھے یوں لگتا جیسے اُن کے منہ میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وہ ہمارے مکان کے سامنے والی مسجد کے مقابلے میں نہانے آیا کرتے تھے۔ وہ نوکرنے والی ٹوٹیوں کے آگے کھڑے پر بیٹھ کر پیسے تو مسواک کرتے۔ پھر کالی نوس ٹوٹو پیسٹ سے خوب جھاگ نکال نکال کر دانتوں کو صاف کرتے۔ وہ دانتوں کی صفائی اور صحت کا بے حد خیال رکھا کرتے تھے۔ آج کل غالباً وہ ملن کے ریوے آفس میں ہیں۔ سنا ہے کہ اُن کے سارے دانت جھڑ گئے ہیں۔ ایک روز ماسٹر رفیق نعت خواں جیسے اپنا رنگ گورا کرنے کا بڑا شوق تھا۔ سقاوے میں نہارا تھا اور باہر نکلتے کام نہیں لیتا تھا۔ بٹ صاحب تو لیبہ کندھے پر ڈالے کھڑے کھڑے بے چین ہو رہے تھے۔

جب ماسٹر رفیق تیسری بار صابن لگانے لگا تو بٹ صاحب نے جھپٹا کر کہا۔

”ماسٹر رفیق اگر تم شملے میں اس طرح پانی ضائع کرتے تو تم پر حکومت ٹیکس

لگا دیتی“

بٹ صاحب کو کھاسکی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ شاد کی دکان پر سر کی ٹوپی والے

مرنجاں مرنج شریف النفس بابو سید احمد بھی آیا کرتے دتین کہانیاں انگریزی میں ٹائپ کر کے بھی بھجوا رکھی تھیں جبکہ کوئی جواب نہ آیا تھا۔ غالباً ضلع کچہری میں سٹینو گرام تھے شادی نہیں کی تھی۔ بیوہ بہن کے بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ بڑی شائستگی سے باتیں کرتے فسادات میں جب سکھوں نے گربانیں سونت کر ان کے گھر پر حملہ کیا تو بابو سید احمد ہاتھوں پر ان کے وار روکتے رہے۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں اور کنبشی سے لے کر کان کی ٹونک ایک گہرا زخم آیا اس خوش ذوق منڈلی کا تیسرا رگن ایک بندو تھا۔ جس کو یہ لوگ دت صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ رات بھی گورا چٹا، بھرے بھرے جسم والا ہندو لالہ تھا جس کے اوپر والے چار دانت ذرا اونچے تھے جو بات کرتے ہوئے صاف نظر آتے۔ ایک دانت پر سونا چڑھا تھا یہ شخص پکا راگ گابھی لیتا تھا۔ کمالا جھریا اور استاد عبدالکریم خان کا عاشق تھا۔ شاید بچے والے کھوہ سے اپنے دوستوں کو ملنے شاد سنار کی دکان پر آیا کرتا۔

شاد سنار خود بڑا خوش ذوق، مرنجاں مرنج اور کم گوانسان تھا۔ حقہ بہت پیتا تھا۔ لالہ میں جڑے ہوئے سونے کی چھلانی کر رہا ہوا اخبار پڑھ رہا ہو۔ حقے کی منہ میں دبی رہتی۔ تمباکو والے پان درجنوں کے حساب سے کھاتا تھا۔ سامنے اللہ بندے پان دلے کی دکان تھی۔ اللہ بندہ پان سگریٹ بھی بیچتا اور گود میں رکھے لکڑی کے تختے پر ڈرائنگ کا غڈ چپکائے پنسل سے انا ترک کی تصویر بھی بنا رہا ہوتا۔ کام کرتے کرتے حقے کی نئے ہٹا کر شاد سنار آواز دیتا۔

”لاؤ یار اللہ بندے پان ہی کھلا دو“

اسد جو ان خوش ذوق خوش مزاج لوگوں کی منڈلی کا ایک اہم جزو تھا۔ یہ لوگ عام طور پر تیسرے پر شاد، دکان پر جمع ہو جاتے زیوروں سے بھری ہوئی چھت تک گئی لوہے کی الماری کے آگے بچھی ہوئی چاندنی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاد پان منہ میں دبائے حقہ پی رہا ہوتا۔ قریب ہی بابو محمد حسین بٹ بابو سید احمد اور دت بیٹھے بڑی گرم جوشی سے مہنس مہنس کر باتیں کر رہے ہوتے کسی وقت دت ہاتھ کا زرت کر کے کوئی تان اڑا دیتا اور سمجھوں کے سر جوم جاتے آہنی الماری سے پہلو میں اسد جو چوکی پر بیٹھا سمادار کو خوب چپکا کر اس میں چائے کی پتی ڈال کر آگ سا رہا ہوتا۔ جب چائے پک جاتی تو سب مل کر بڑے شوق سے پیٹے برسات ہو

گرمی ہو یا پالا پڑ رہا ہو۔ یہ خوش ذوق منڈلی تیسرے پر شاد سنار کی دکان پر ضرور اپنی محفل جاتی۔ کبھی کبھی میں بھی بازار میں چورس پاسی کھیلتے کھیلتے ان لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ مجھے ان کی باتیں یاد نہیں لیکن ان کے باتیں کرتے ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے، تانیں اڑاتے اور کسی تان پر جھوم جھوم کر سر ہلاتے چہرے ضرور یاد ہیں۔ چائے کی پیالیاں ان کے ہاتھوں میں ہوتیں۔ آنکھیں چائے کی گرمی اور گفتگو کی مسرت سے چمک رہی ہوتیں۔ اسد جو بھی پیالی ہاتھ میں تھا بڑی عقیقت سے ان لوگوں کی باتیں سن رہا ہوتا۔ وہ ان کی باتوں میں حصہ نہیں لیتا تھا مگر ان کی ہر بات پر سر ضرور ہلا دیتا تھا۔ شام پڑے جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو شاد سنار الماری میں زیورات بند کرنے شروع کر دیتا اسد جو دکان کے پھٹے پر ایک طرف بیٹھ کر سمادار میں سے چائے کی گیلی پتی نکال کر نیچے پھینکتا۔ پھر اسے راکھ سے مانجھ کر خوب چمکاتا اور دھلی دھلائی پیالیوں کے ساتھ آگے روز کے لئے الماری میں بند کر دیتا۔

عید میلاد النبی کے جلوس میں اسد جو اپنی تاتاری ٹوپی میں چاند تارے کا تکرہ لگا سبز رنگ کا بالی پرچم ہاتھوں میں تھام لیتا وہ جلوس کے آگے آگے عقابی آنکھیں بالکل سامنے گاڑے، چہرہ ساکت کئے، نئے تیلے قدم اٹھائے جرنیلوں ایسی شان سے چل رہا ہوتا۔ اس کی مانگے کی برس رانوں پر سے پھولی ہوتی۔ کمر میں چمڑے کی بیٹی کے ساتھ تھوڑا لٹک رہی ہوتی۔ گل مجھے پھر تک رہے ہوتے رخسار جوش اسلام سے تمنا رہے ہوتے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا اور بار بار اپنا منہ اوپر اٹھا کر اسد جو کے مونچھوں بھرے لال لال چہرے کو دیکھا کرتا مجھے وہ کوئی سپر سالار لگتا جو اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ دشمنوں پر دھاوا بولنے جا رہا ہو۔ ایک بار میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ہلایا تو اسد جو نے نظریں سامنے رکھے بائیں مونچھ کو پھر پھر اکراتنی زور سے ”ہوں ہوں“ کہا کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

محفلے میں کوئی بیاہ شادی ہوتی تو اسد جو کو شور بے کی دیگ پر بٹھلایا جاتا کیا محال جو کسی کے پیالے میں مقدار سے بڑھ کر شور بہ چلا جائے یا ایک بونی بھی فال تو پڑ جائے۔ اسد جو آستین چڑھائے ذرا ترچی رکھی شور بے کی دیگ کے آگے پیڑھی پر بیٹھا ہوتا بڑا جھج اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ بڑے پختے کے انداز میں پیالیاں شور بے سے بھرے جاتا۔ کوئی اچھی بونی دکھائی دیتی تو اسے سب کے

سامنے منہ میں ڈال لیتا اور رومال سے مونچھیں پونچھ کر کہتا۔
 "اس تے میرا فہر لگا ہونیا سی"

کسی روز وہ ہر سیدہ بیچ کی دکان بڑھانے کے بعد بڑے کاکا کے تنور پر آجاتا۔ تنور کے پاس
 ہی بازار کے رخ پر سجھے ہوئے پرانے تخت پوش پر وہ ٹانگوں پر لونی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ محلے
 کے بچے اور بچیاں اُس کے آگے رومال بچھا دیتیں۔ کاکا تنور سے گرم گرم تافتا لے کر دے اور
 قلعے نکال نکال کر اسد جو کے آگے پھینکے جاتا اور اسد جو لاکھوں کو نمٹائے جاتا کوئی بھی شور مچاتی۔
 "اسد جو پہلے مجھے دو۔ پہلے میں آتی تھی"

اسد جو مونچھوں کے پیچھے ہنستا اور بچی کے سر پر آہستہ سے دھوپ مار کر کہتا۔

"تینوں دی دے دیندی"

پھر وہ تنور پر رکھے حقے کی نے منہ میں ڈال کر اندر ٹکڑی میں میدے کے پیرے تولتے ہوئے
 گانی کو آواز دیتا۔

"جلدی کرو دی سی جلدی گامی"

فسادات میں جب محلے میں ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی اسد جو کاسماوار ضرور گرم ہوتا
 تھا۔ پھر فسادات زیادہ شدت اختیار کر گئے۔ شاد سنار کی دکان پر تالہ پڑھ گیا۔ وہ ہندو علاقے سے
 ہمارے محلے میں آتا تھا۔ دت نے بھی آنا بند کر دیا۔ شاد کی دکان پر سجنے والی زندہ دل محفلیں آجرائیں
 اسد جو سماوار لے کر اپنی بوسیدہ چھت والی دکان میں چلا گیا۔ اُس نے امیر اکمل چلے جانے کی گوش
 کی لیکن فسادات کی آگ راستے میں دیوار کسے کھڑی تھی۔ سارا محلہ ویران ہو گیا۔ چاروں طرف آگیں بھڑک
 اٹھیں۔ چوک چوک میں قتل و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اسد جو لگی کے بند دروازے پر ساری ساری رات
 پہرہ دیتا۔ ہمارے ساتھ وہ بھی لگی نہیں بند ہو گیا تھا۔ کرفیو لگی و بشت زدہ راتوں میں دور سے غرض
 کی آوازیں اور گولیوں کی ٹھانیں ٹھانیں سنائی دیا کرتیں۔ ایک رات میں لگی میں ہی اپنی خالہ کے
 مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے چاچا قادری شال ہاف کی دکان کے
 پیٹے پر اسد جو کو بیٹھے دیکھا۔ مجھے ہوئے سماوار پر ایک ہاتھ رکھے وہ دکان کے بند دروازے
 سے ٹیک لگائے کھوئی کھوئی آنکھوں سے غلامیں تک رہا تھا۔ نفسا میں تڑا تڑا فائر کی آوازیں

گونج رہی تھیں مجھے یوں لگا جیسے اداس اور غلگین اسد جو۔ اکیلا اور بے یار و مددگار اسد جو۔
 اپنی بادام کے ٹکڑوں سے لدی ہوئی دادیوں، اپنے ہنستے مسکراتے دوستوں اور اُن کی پرجوش محفلوں
 کی سوگوار یاد میں گم ہے۔ چائے کی پیالی خالی چھوڑ کر محفل سے اٹھ کر چلے جاتے والوں اور مجھ بھی
 واپس نہ آنے والوں کے قدموں کے نشان کو ویران نگاہوں سے تک رہا ہے۔

اس کے بعد میں نے اسد جو کو پھر نہ دیکھا۔ کبھی کبھی دل میں ایک امنگ سی پیدا ہوتی
 ہے کہ کہیں سے اسد جو کو دھونڈ کر لاؤں۔ اُسے اُس کے پیاری پیاری صورتوں والے دوستوں میں
 لاکر بٹھا دوں اور کہوں اے اچھے لوگو! اچھی اچھی باتیں کرو۔

اے اسد جو سماوار میں چائے کی ہتی ڈال دے۔ اور جب کھولتی چائے خوشبودار دینے لگے
 تو ایک پیالی مجھے بھی دینا۔

لیکن اسد جو کھو گیا ہے۔ اُس کا سماوار کھو گیا ہے۔

امرتسر کا ایک گیت کیسے

آج میں آپ کو امرتسر کے ایک گیت کیسے کی کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی امرت ناکیر سے شروع ہو کر لاہور کی فلمنگ روڈ اور لاہور ہوٹل کے ارد گرد اگر ختم ہو جاتی ہے۔ میں نے اس دردناک کہانی کے اجزائے ترکیبی کو امرت ناکیر میں مرتب ہوتے پرانے چڑھتے، پھلتے پھولتے دیکھا اور پھر لاہور ہوٹل اور فلمنگ روڈ کے گلی کوچوں میں ان اجزائے پر خچے اڑتے دیکھے۔ انہیں خاک و خون میں غلطاں دیکھا۔ میں اس کہانی کو امرتسر کے ایک پرانے سینا گھر امرت ناکیر سے شروع کرتا ہوں۔ کیونکہ یہ شعلہ جواب راکھ بن چکا ہے پہلے پہل اسی آتش کدے سے اٹھا تھا۔

لال بازار امرتسر میں ایک بازار چوک گول مٹی سے پھم والے بازار کی طرف مڑتا تھا۔ اسے کٹرہ کہنیا لعل کہتے تھے۔ کٹرہ کہنیا لعل کے چوباروں میں طوائف بیٹھا کرتی تھیں۔ دن بھر اس بازار کے لکڑی کے چھبے دار مکانوں کی کھڑکیوں پر چھین پڑی رہتیں۔ شام ہوتے ہی بازار کی رونق شروع ہو جاتی چلیں اوپر اٹھ جاتی کھڑکیوں میں کہیں بجلی کے قمقمے اور کہیں لالٹیں روشن ہو جاتیں اور ان کی روشنی میں طوائف خوب بن سوز کر، سچ دھج کر سرفنی پاؤڈر مقو پے چوکیوں یا کرسیوں پر اگر بیٹھ جاتیں وہ بت بنی شوکیوں میں رکھے ہوئے لکاؤ مال کی طرح چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ کبھی گردن پھیر کر نیچے بازار میں آواز سے کہنے والے تماشینوں کو دیکھتیں ذرا سا سکر تیں اور پھر بت بن کر بیٹھ جاتیں۔ کوئی پان چار ہی ہوتی۔ کوئی سگریٹ پی رہی ہوتی۔ جس وقت کوئی طوائف اچانک اٹھ کر کھڑکی سے غائب ہو جاتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ کوٹھے پر تماش بین آگیا ہے۔ یہ تماش بین منہ سر چھپا کر کوٹھے کی اندھیری سیڑھیاں اوپر چڑھ جاتے اور مقوڑی دیر بعد جب

منہ سر چھپانے نیچے اتر کر بازار کے ہجوم میں گم ہو جاتا تو کوٹھے والی طوائف دوبارہ پاؤڈر سرفنی تھوپے کھڑکی میں آکر بیٹھ جاتی۔ بٹو کی بیٹھک۔ روڑیاں والی گلی کے سامنے اسی بازار میں تھی۔ گوری چٹی، بڑا خوبصورت جسم سنہری بال اور نیلی نیلی نیشیل آنکھیں۔ اس کی بیٹھک کے نیچے اکثر تماش بینوں کا ہجوم رہتا اور عید میسا کھی پر تو بٹو کو سر کھانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ میں ان دنوں ساتویں یا آٹھویں جماعت پڑھتا کرتا تھا اور ایم اے او سکول جاتے یا آتے ہوئے میں منہ اوپر اٹھا کر بٹو کو مزور دیکھ لیا کرتا بٹو دن کو بھی بن سوز کر کھڑکی میں بیٹھا کرتی۔ مجھے وہ نیلی آنکھوں والی رومن شہزادی لگتی ہے جو اپنے سنہری بال کھوئے۔ شاہی بھرے میں بڑی تمکنت سے بیٹھی دریائے نیل کے پرسکون پانیوں پر سیر کر رہی ہو اس کی ناک میں فیروزی ننھا سا لکینہ دن کو دھوپ میں اور رات کو بجلی کی روشنی میں دمک رہا ہوتا۔ بلاشبہ بٹو کٹرہ کہنیا لعل کی سب سے نازک اندام اور حسین طوائف تھی۔ پاکستان بننے کے کچھ ہی سال بعد میں نے اس رومن شہزادی کو ہیرا منڈی کی ایک گلی میں دیکھا کہ اس کا شاہی بھرائٹ چکا تھا۔ محل کی زرنگار خواب گاہوں میں آگ لگ چکی تھی سنہری بالوں میں سفید رکھاڑ رہی تھی۔ گورا چہرہ سوکھے ہوئے پرانے چمڑے کی طرز سکڑ گیا تھا۔ اور وہ آنکھیں جو کبھی نیلی اور شفات ہوا کرتی تھیں اب گندے جوہر کے زنگار لگے پتھر کی طرح ہو گئی تھیں۔ عیاشی کے شعلوں نے اس کے جسم کے آتش دان کو دقت سے پہلے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اب یہ آتش دان ٹھنڈا تھا۔ اس کی اکھڑی ہوئی اینٹوں میں بھی ہوئی سرد راکھ تھی اور دیوار پر دھوئیں کے جالے لٹک رہے تھے۔

مختار بیگم عرف داری امرتسر والی کی بیٹھک بھی اسی بازار میں تھی۔ یہ بیٹھک فرینڈز ہوٹل سے ایک مکان چھوڑ کر تھی۔ یہی وہ چوبارا تھا جہاں آغا حشر کاشمیری کی محفلیں گرم ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ان دنوں آغا حشر غالباً کھلتے جاچکے تھے۔ داری امرتسر والی کی بیٹھک کے نفل میں امرت ناکیر تھی۔ سامنے بورا اور دانے دار کھانڈ بتا شے اور کھانڈ کے کھلونے بنانے والوں کی دکانیں تھیں۔ ذرا پرے "لاہوریاں دی ہٹی" تھی یہ ایک ہوٹل تھا اس ہوٹل کے باہر ایک اونچا لمبا شیٹے کا شوکیں تھا جس میں کرسیاں فادر کی شکل کا ایک بوڑھا ہاتھ میں سُرخ سوڈا واٹر کی بوتلی اور گلاس لئے کھڑا رہتا اس کے اندر کچھ ایسے کل پڑنے لگے تھے کہ بار بار

اُس کا بوتل والا ہاتھ لگا کر اس کی طرف جاتا اور پھر واپس آجاتا۔ ہم سکول آتے جاتے اس گھر سے
 قادر کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ بیساکھی پر جب باہر سے دیہاتی سکھ آتے تو یہاں
 ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ میں نے کئی بار اس بوتل میں دوستوں کے ساتھ گدے دار اونچی اونچی
 کرسیوں پر بیٹھ کر سوڈا واٹر اور ٹیک شیک پیا اور سنگ مرمر کی گول گول ٹھنڈی میزوں پر
 بانہیں ڈکا کر قبضے لگائے ہیں۔ کونے میں ٹوکس کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھا ایک موٹا لالہ سینگل
 کانن، جو تھیکا رائے اور مکلا جھریا کے ریکارڈ بجا کرتا۔

بالم آئے بسو میرے من میں
 اور پھر مکلا جھریا کی گائی ہوئی مشہور غزل

مجھے جس دم خیال نرگس ستارہ آتا ہے

صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ بھاتا ہے

ان دنوں یہ ریکارڈ بے حد مقبول تھے اور لوگ انہیں سن سن کر سر دھنا کرتے تھے ہاں۔
 تو میں امرت ٹاکیز کی بات کر رہا تھا جو اسی بازار میں تھی۔ امرت سر کا یہ سب سے پرانا سینما ہال
 تھا۔ سینما ہال کیا تھا بس ریل کا ایک لمبا چوڑا ڈبہ تھا جس کے آخر میں جا کر پردہ لگا تھا۔ اُس
 کی مشین کے چلنے کی آواز باہر بازار تک آیا کرتی اور ہم اکثر فلموں کے گانے اور مکالمے
 بازار میں کھڑے ہو کر سن لیا کرتے تھے۔ پرکش فلم کی پاسنگ شو واڈیا مودی ٹون کی ہنٹر
 والی جس کی پہوان بیروین مس ناڈیا ہرین میں ڈنٹر ضرور پلٹی دکھائی جاتی تھی۔ ماسٹر شیراز کی
 چلتا پڑتا۔ ہر شہنشاہ۔ جیتی نشانی۔ ایک دن کی بادشاہت اور چار حصوں پر مشتمل فلم حاتم طائی
 فلم شام چھ بجے شروع ہوئی اور ساری رات چلتی رہی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ
 آنے والی تھرڈ کلاس کے بیچ پر انڈوں بیٹھا بت بنا حاتم طائی کو جنات کا مقابلہ کرتے
 کوہندا میں کالی بکاسے لڑتے اور "یا اللہ مدد" کا نعرہ لگا کر دریا کا آگ عبور کرتے دیکھتا رہا
 جب فلم ختم ہوئی تو امرت سر شہر پر صبح صادق کی جھلکیاں نمودار ہو رہی تھیں اور سینما کے گیٹ
 کے باہر والد صاحب ہنٹر لیے ہم دونوں بھائیوں کے انتظار میں بڑی گر محوشی سے ہنٹر
 کو بار بار ہوا میں شرٹاپ شرٹاپ کی آوازوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔

امرت ٹاکیز کے سینما ہال میں پاپڑ اور مسالے دار چٹوں کی تیز منہک ہر دم پھیل رہتی انٹرول
 میں پھری والے لڑکے پاپڑ مسالے دار چھوٹے، کڑیاں والے اور پان سگریٹ کا اس قدر شور
 مچاتے کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے اپنے ساتھیوں سے چیخ چیخ کر اور بعض اوقات صرف اشاروں
 میں ہی باتیں کرتے۔ امرت ٹاکیز کا انٹرول کا عرصہ گزارنا دریاٹے شور غیر کرنے کے برابر تھا۔
 امرت ٹاکیز کی ڈیوڑھی میں دونوں جانب دیواروں پر چالو فلم اور آئینوالی فلموں کے فوٹو چھٹوں
 میں لگے رہتے۔ ہم ان تصویروں کو بڑے شوق سے دیکھا کرتے اور پھر شام کو یا دوپہر کو گھر سے
 پیسے چرا کر اور یا بہنوں سے چھین کر فلم دیکھنے آجاتے۔ واپسی پر ہنٹر سے خوب ٹھکانا ہوتی مگر
 لگے روز پھر سینما ہال کی تھرڈ کلاس میں موجود ہوتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار سینما ہال میں بڑا رش
 تھا اور میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ سیٹج پر لیٹ کر فلم دیکھی تھی۔ ایک بار اسی سینما ہال
 میں ملکہ ترم نور جہاں نے جوان دنوں بے بی نور جہاں تھی سیٹج پر زندہ ناچ گانا کیا تھا۔ یہ ناچ گانا ہی
 نے آگ بجھانے والی لال لال بالٹیوں کے پاس ایک کھڈے میں بیٹھ کر دیکھا تھا۔

جب جس غم نصیب گیٹ کیپر کی میں کہانی سنانے والا ہوں وہ اسی امرت ٹاکیز کے مین
 گیٹ کا گیٹ کیپر تھا۔ بازار سے سینما کی چوڑی اور ریل کے ڈبے ایسی ڈیوڑھی میں داخل ہوں تو اُس
 کے اصرار میں لکڑی کا ایک جنگلہ آجاتا تھا یہ جنگلہ سینما کا پہلا دروازہ تھا۔ یہاں سے سامنے سینما کے
 کیمین جہاں مشین لگی تھیں دکھائی دیتے تھے۔ یہاں سے ٹکٹ کٹوا کر گویا آپ سینما کے باقاعدہ تماشائی
 کی حیثیت سے سینما کے برآمدوں میں سے گزر کر ٹکٹ کے مطابق اپنی کلاس میں داخل ہو سکتے
 تھے۔ لکڑی کے اس جنگلہ ٹاکیٹ پر ایک گیٹ کیپر لوہے کی کالی کرسی پر بیٹھا رہتا۔ تیس تیس
 کی عمر کالی اچکن، کالے پپ شو، سفید لٹھے کی بے داغ شلوار، سر پر سرخ مخروطی ترکی ٹوپی لکڑی
 چہرے پر بڑے ہلکے ہلکے چپک کے داغ، پڑ سکون دھیمی دھیمی شرتی آنکھیں تیکھا ساناک نقشہ ذرا
 لمبوتر چہرہ، دُبل پتلا مناسب قد کاٹھ۔ میں نے اُسے کبھی مسکراتے یا کسی سے بات کرتے نہیں
 دیکھا تھا۔ میں لکڑی کے جنگلے پر ایک طرف چڑھ کر کھڑا ہو جاتا اور سینما ہال میں داخل ہونے والوں
 کو کتے جاتے دیکھتا رہتا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو یہ شوق ہوتا کہ اگر پوری فلم دیکھنے کے لیے
 نہیں تو کم از کم اُس کا ایک آدھ سین ہی مفت میں دیکھ لیں۔ کیونکہ سینما والے کبھی کبھی چلتی فلم

میں ہال کا سامنے والا فسٹ کلاس کا دروازہ لوگوں کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لیے چوہٹ کھول دیا کرتے تھے۔ یہ دروازہ دو ایک منٹ کے لئے کھلا رہتا اور پھر بند کر دیا جاتا عام طور پر یہ دروازہ فلم کے کسی مارکٹائی والے سین پر کھلا کرتا۔

ترکی ٹوپی والے اچکن پوش گیٹ کیپر نے ہمارے جنگے پر کھڑے ہونے پر کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔ وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ فلم دیکھنے والوں کا ٹکٹ لے کر کاٹھا آدھا نہیں دیتا۔ آدھا لکڑی کی صندوقچی میں ڈال دیتا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہتا۔ جب کبھی رش ہوتا تو وہ اٹھ کر گیٹ کے پاس کھڑا ہو جاتا اور نظریں جھکائے جلدی جلدی ٹکٹ کاٹ کر لوگوں کو گزارے جاتا۔ کسی وقت مشین مین کیبن سے اُسے کوئی آواز دیتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اُسے کوئی اشارہ کرتا اور پھر اپنے کام میں لگن ہو جاتا۔ امرت ٹاکیز کا مالک ادھیڑ عمر کا ڈارھی مونچھ صاف چٹ ایک ہندو لالہ امرت لعل تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے بلکے بلکے نشے میں رہتا۔ دبلا ڈھیلا ڈھالا زرد چہرہ سر پر گول ہندو والی کالی ٹوپی دھوتی، بوسکی کی قمیض اور سیاہ پمپ میں وہ جھومتا جھامتا مسکراتا ہوا سینما ہال میں ادھر سے ادھر منڈ لایا کرتا۔ دو تین خوش پوش آدمی مزور اُس کے گے پیچھے ہوتے تھے۔ ایک بار میزے سامنے یہ ہندو لالہ جنگلے کے پاس اکر ٹک گیا۔ گیٹ کیپر نے اس کی کرسی پر سے احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالے نے اپنی غار آلود پلکیں اٹھائیں اور گیٹ کیپر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

شاہ جی! کبھی مجھ ہی کوئی بات کر لیا کرو۔ کوئی تکلیف تو نہیں؟

گیٹ کیپر نے نظریں جھکائے جھکائے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

آپ کی ہر بانی ہے لالہ جی۔

اُس روز مجھے معلوم ہوا کہ گیٹ کیپر کو شاہ جی کہتے ہیں اور اُس کی آواز باریک ہے اور یہ کہ وہ بولتا بھی ہے۔ اور مسکراتا بھی ہے۔ کبھی کبھی دوپہر کو ایک میلے سے سفید برقعے والی بوڑھی عورت جنگلے کے پاس اکر کھڑی ہو جاتی گیٹ کیپر روٹی کا ڈبہ لے کر صندوقچی کے قریب ہی رکھ لیتا۔ کچی محبت سے اس کے ساتھ اکر لگ جاتی۔ وہ کچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا اور اچکن کی جیب سے ایڈورڈ کے زمانے کا تانبے کا پیسہ نکال کر دیتا۔ کچی خوشی سے پھولی نہ

ساقی۔ گیٹ کیپر کچی کے ماتھے پر پیار کرتا۔ بوڑھی عورت اُس سے دو ایک باتیں کرتی جبکہ جواب وہ ہوں یا ہاں میں دیتا۔ جاتے ہوئے برقعہ پوش بوڑھی عورت گیٹ کیپر کے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتی اور دعائیں دیتی کچی کو ساتھ لے کر سینا مال کی ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتی۔ میں سوچا کرتا کہ یہ عورت بوڑھی عورت گیٹ کیپر کی ماں ہے اور وہ کچی اس کی بیٹی ہے۔ حقیقت کیا تھا؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میں خود اُن دنوں بارہ چودہ برس کا تھا۔ میرے لئے زندگی کا بازار ابھی کھلا ہی تھا۔ ماہ و سال کے چوتروں پر لوگوں نے ابھی اپنی اپنی دکانیں سہانی شروع ہی کی تھیں۔ زندگی کا بھرپور طاقتور، تازہ اور پُر جوش خون میری رگوں میں اُگ بن کر دوہک رہا تھا۔ اور میں بہار کی خوشبو بھری مست خوش فکر اور لا اُمالی ہوا کے جھونکے کی طرح امرتسر کے بازاروں، باغوں، نہروں اور کھیتوں میں اُڑتا پھیر رہا تھا۔ خالص دودھ مکھن گھی، ہوا اور امرتسری پانی کی طاقت میں ہرن کی طرح چوکڑی بھرتی نگاہ میں کوئی صورت نہ ٹھہرتی تھی۔ ہر لمحے، ہر پل نئے نئے ستارے طلوع ہو رہے تھے۔ لیکن کچھ لوگ، کچھ مناظر، کچھ ستارے ایسے تھے جنہوں نے اُس وقت میری توجہ اپنی طرف کھینچی اور جنہیں میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ یہ گیٹ کیپر بھی انہی لوگوں، انہی مناظر اور اُن ہی دھیمے دھیمے چلنے والے ستاروں میں سے تھا۔

روٹی کا ڈبہ صندوقچی کے پاس رکھ کر وہ ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ خدا جانے وہ کب روٹی کھاتا تھا؟ خدا جانے وہ روٹی کھاتا بھی کھاتا یا نہیں! میں نے اُسے کبھی کچھ کھاتے پیتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ سینا گھر کے دوسرے گیٹ کیپر سارا دن چرتے رہتے اور گالیاں بکتے رہتے۔ مقرر ڈکلاس کے ٹکٹ دینے والے کی کھڑکی پر جب میں لوگوں کے سروں پر سے چھلانگیں لگا کر پہنچتا تو دیوار کے چورس سوراخ میں سے وہ مجھے ہمیشہ پا پڑ کھاتا دکھائی دیتا تھا۔ سبحان اللہ! امرتسر کے پاپڑوں کا بھی جواب نہیں تھا۔ مگر یہ اچکن پوش غاموش گیٹ کیپر کبھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ میری اپنی کڑتے کی جیب گڑ والی ریوڑیوں سے بھری رہتی تھی میں گیٹ کے جنگلے پر چڑھا مزے مزے ریوڑیاں کھاتے چلتی فلم میں سینا مال کا دروازہ چوہٹ کھلنے کا انتظار کیا کرتا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پر غاموش گیٹ کیپر بوسے کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا اپنی نرم پُرسکون نگاہوں سے بازار کی طرف دیکھتا رہتا۔ اُس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا

دوسرے سے ہنستے مذاق کرتے چل دیئے مجھے آج بھی گیٹ کپڑ کی ٹھکی ٹھکی آنکھیں، اُس کا انگلی کے اشارے سے ہمیں جانور کو مارنے سے روکنا اور پٹے کا اُس کی گود میں مزے سے بیٹھنا یاد ہے۔

زندگی کے سینا ہال میں وقت کی فلم بھی بڑی تیزی سے چلتی چلی گئی اور اُس کے پارٹ ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میں اُسی عمر میں ہندوستان کے دور دراز شہروں میں آوارہ گردی کو چل نکلا۔ جب کبھی امرتسر واپس آتا تو اُس خاموش گیٹ کپڑ کو اُسی طرح گیٹ کے پاس بوسہ کی کمرسی پر چپ چاپ بیٹھے کھٹ کھٹے دیکھتا اور پھر کسی دور دراز شہر کی آوارہ گردی کو نکل جاتا دوسری جنگ عظیم میں میں برما میں پھنسی گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو فسادات شروع ہو گئے۔ رام باغ اور کٹرہ کنبیا لعل کی طوائفین بھاگ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں یہاں زیادہ تر مکان اور دکانیں ہندوؤں کی ملکیت تھیں مسلمانوں نے انہیں آگ لگا دی۔ کٹرہ کنبیا لعل سارے کا سارا آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک روز کرفیو کھلا تو میں نے اس کٹرے میں سے گزرتے ہوئے امرت ٹاکیز کو دیکھا۔ اُس کا سینا ہال جل کر خاک ہو گیا تھا۔ دیواروں کا ڈھانچہ کھرا تھا گیٹ بھی جل گیا تھا۔ مجھے خاموش گیٹ کپڑ کا خیال آ گیا۔ خدا جانے فسادات کے اس خونیں ہنگاموں میں وہ بے ضرور کم سخن انسان کہاں ہوگا۔ کیا وہ اُس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی سلامت ہوگی اُس کے تو اگر چہرہ بھی گھونپ دیا گیا تو وہ کسی کا ہاتھ نہیں روکے گا۔ کسی سے کچھ نہ کہے گا۔ بلکہ سی آہ تک نہیں بھرے گا۔ اور چپ چاپ لگی یا بازار میں گر کر مر جائے گا۔

فسادات بھی ختم ہو گئے۔ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ پاکستان بن گیا اور مہاجرین کے لئے پٹے قافلے آن دیکھی منزلوں کو چل پڑے۔ نئے وطن کی نئی سرگرمیوں اور نئے مسائل نے بہت کچھ وقتی طور پر بھلا دیا میں بھی امرت ٹاکیز کے خاموش گیٹ کپڑ کو بھول گیا۔ چھ سات برس بعد اچانک میں نے اسی گیٹ کپڑ کو لاہور کے پلس سینا کے باہر دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ اچکن۔ لٹھے کی صاف ستھری شلوار اور پمپ شو غائب ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وہی دھما دھما درو اور سکوت تھا ہونٹوں پر لہر خاموشی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر سینا کے سامنے ہاتھ میں بیٹھی خطائیوں کا تھال لئے کھڑا تھا۔ سر پر میلی کپیلی رومی ٹوپی تھی اب میں اُسے کبھی کبھی لاہور کی سڑکوں یا سکولوں کے باہر بیٹھی خطائیاں بیچتے دیکھ لیتا کرتا۔ کئی بار دل چاہا کہ

اُس کے پاس جا کر کوئی بات کروں۔ اُس سے اُسکی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی بچی کی خیریت پوچھوں مگر جانے کیوں میں بھی چپ چاپ اُس کے قریب سے گزر جاتا۔ ہر بار جب وہ مجھے ملتا تو اُسکی حالت پہلے سے خراب ہوئی۔ کپڑے زیادہ میلے کچلے اور چہرہ میلے سے زیادہ زرد ہوتا۔ وہ خطائیوں کا تھال لئے سر جھکائے گیوں میں سے گزر جاتا۔ کوئی بچہ اُسے روکتا تو وہ دُک جاتا۔ پیسے در پیسے کا سودا بچے کو دیتا اور خاموشی سے اُسے گزر جاتا۔

پھر ایک روز میں نے اُسے خطائیوں کے تھال کے بغیر دیکھا۔ وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ لگا کر جھکائے چلا رہا تھا۔ کسی وقت وہ گردن پھیر کر دائیں بائیں یوں دیکھتا جیسے اُس کی کوئی شے گم ہو گئی ہو۔ سر کے سفید بال اور ڈاڑھی بڑھ آئی تھی۔ رومی ٹوپی غائب تھی اور ٹوٹی ہوئی چل پاؤں کے ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے اُس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ یوں لگا گویا اُس کی تباہ حالی کا میں ذمے دار ہوں۔ وقت لاہور کی سڑکوں پر شور مچاتا۔ گرد اُڑاتا بھاگتا اُڑتا چلا گیا۔ ایک دن میں نے اُسے ایبٹ روڈ پر دیکھا۔ اُس کے پاؤں سے چل غائب تھی۔ چہرہ مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ پاجامے کا ایک پانچہ پھٹ گیا تھا۔ وہ کُڑے کے ایک ڈھیر پر جھکا ہوا تھا اور کاغذوں کے جھیرے نکال نکال کر اپنے گندے کوٹ کی جیبوں میں بٹھول رہا تھا۔

اب میں نے فلیننگ روڈ پر رالش اختیار کر لی تھی۔ دو ماہ بعد میں نے امرتسر کے اس بے زبان گیٹ کپڑ کو لاہور ہوٹل کے پاس بیٹھے کاغذ نکال نکال کر جیبوں میں بھرتے دیکھا۔ اس کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی۔ لمبے لمبے سفید بالوں میں لاہور کے ہر بازار ہر گلی کو پچے کی مٹی بھری تھی ڈاڑھی مونچھوں کے خاکستری بالوں میں زرد مٹی رنگ کا سوجھا ہوا بے جان چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ سفید آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ پاس ہی گندے مندے کاغذوں سے بھری ہوئی گانتھر رکھی تھی۔ وہ کوڑا کرکٹ بیٹی کرید رہا تھا اور اونگھ بھی رہا تھا۔

میں نے آخری بار اُسے اُسی بازار میں ایک مسجد کے باہر دکان کے تھڑے پر گندے پتھر دی کے گھڑے سے ٹیک لگائے اونگھتے ہوئے دیکھا۔ میں قریب سے گزرا تو اُس نے ایک پل کے لیے اپنی سوجی ہوئی پلکیں اٹھا کر پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ایک پل کے لئے دُک گیا۔ ایک پل کے لیے ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ اُسی طرح پتھر بنا اپنی وحشت زدہ آنکھوں سے

مجھے دیکھا گیا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ مٹی اور چیتھڑوں کا جوگن امندا ڈھیر سا دکان کے قعر سے پر رکھا ہے کیا یہ وہی کم سخن، اچکن پوش خوش لباس گیٹ کپڑے ہے۔ جو آج سے عرصہ پہلے امرتسر کے ایک سینا گھر کے گیٹ پر روہے کی ٹرس پر چپ چاپ بیٹھا ٹکٹ کاٹا کرتا تھا اور جیسے اس کی بوڑھی ماں اور بھولی بھالی معصوم بچی روٹی دینے آیا کرتی تھی؟ اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سفید بالوں اور چہرے کی دکھ بھری لکیروں والا آدمی وہی چھوٹا سا لڑکا ہے جو کبھی بڑی بے فکری سے میرے پاس گیٹ کے جنگلے پر چڑھا جیب سے دیوڑیاں نکال نکال کر کھایا کرتا تھا؟ ہم دونوں یہی سوچ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وقت کی برق رفتار گاڑی ہم دونوں کو زندگی کے دیران سٹیشن پر اکیلا چھوڑ کر بہت دور نکل چکی تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور میں آگے چل دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ خدا جانتے اب وہ کہاں ہے! اُس کی دکھی ماں اور معصوم بچی کہاں ہے؟ وہ یقیناً اب بڑی ہو گئی ہوگی۔ کاش۔ میں کبھی اُس سے مل کر، اُس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھتا۔

بیٹی! تیرے باپ کو اب روٹی دینے کون جاتا ہے؟

امرتسر کا ایک جواری

محلے میں لوگ اُسے گاما سنگھاڑیا کے نام سے پکارتے تھے۔ لمبا قد، چھریا بدن، گندمی رنگت، سرسوں کے تیل میں چمکتے ہوئے سیاہ لہریلے بال گنجان کالی بھنوں کے سائے میں خواب آلود سواری آنکھیں اور چوڑے نتھنوں والا چٹا ناک دو گھوڑا بوسکی کی کار دار قمیض پر چپکارا ماتے سونے کے بٹن سفید ٹلے کی دھوتی، پٹنیٹ کا سیاہ پمپ شو اور کندھے پر لال صافہ۔

گاما سنگھاڑیا کالی کتنی والی ریشمی دھوتی کا پتو سونے کی انگوٹھیوں والی انگلیوں میں مٹھائے، منہ میں تمباکو والا پان رکھے بڑی اُن بان کے ساتھ محلے میں ہٹتا کرتا۔ کبھی طفیل ستار کی دکان پر بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کا کا عمدہ سے ہنسی مذاق ہو رہا ہے اور کبھی ہماری دکان کے تخت پوش پر پاؤں رکھے میرے والد سے مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ کپڑوں پر اگر پان کا بکاسا نشان بھی پڑ جاتا تو گلی کے نکلے پر صافے کی کتنی پانی میں بھگو کر دیر تک پان کے داغ کو رگڑتا رہتا۔ بڑا صاف ستھرا اور صفائی پسند آدمی تھا۔ جس روز اُس نے کوکین والا پان کھایا ہوتا اُس روز وہ سندر سنگھ حکیم کی دکان پر کھجے سے ٹیک لگا کر مست ہو کر بیٹھا رہتا اور پہروں کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ منہ میں پان دبائے چہرے پر سدا کھیلنے والی بچوں ایسی مسکراہٹ لئے وہ آئے جانے والوں کو دیکھتا رہتا اور دھوتی کا پتو اٹھا کر منڈی ہوئی پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہتا اور وہ دنیا میں اکیلے تھا۔ نہ باپ، نہ ماں، نہ بہن اور نہ بھائی۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ سشلوی نہیں کی تھی۔ ہماری گلی میں ایک مسجد کے کچھوڑے کو ٹھٹھی میں رات کو کسی وقت اگر پھرٹا رہتا تھا۔

گاما سنگھاڑیا جواری تھا شرابی تھا۔ وہ ان معنوں میں محلے کا بد معاش تھا کہ جو اکیلے تھا

شراب پیتا تھا۔ کوئین کھانا۔ اور کٹرو کہنیا محل میں جا کر بونگھری کا ٹبراستہ تھا۔ اس کی دھوتی کی ڈھب میں کمافی دار چاقو بھی رہتا تھا۔ وہ سٹہ بھی لگاتا تھا۔ ہماری دکان میں چاچا امیر نامی ایک ادھیر عمر کا سوکھا لبا شخص بیٹھا تھا۔ جو پولیس سے چوری چھپے سٹے کی پرچیاں لکھا کرتا۔ سواری فرد کی بیکل مارے وہ بھٹی کی اوٹ میں بوربے پر بیٹھا جو کس آنکھوں سے پولیس کے آدمیوں سے خبردار رہا کرتا۔ سارے محلے والوں کو علم تھا کہ چاچا امیر سٹہ لکھتا ہے چراغ ارائیں بازار میں کسی سپاہی کو آتا دیکھتا تو دکان پر ٹینڈے تولتے ہوئے چاچا امیر کو ہوشیار کر دیتا۔

”چاچا! کالا آدمی آیا اکی“

کالا آدمی انہوں نے پولیس کے سپاہی کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ چاچا امیر یہ سنتے ہی اپنی چوٹی کی پسل اور سٹے کی پرچیاں فوراً تماشوں والی ٹوکری میں چھپا دیتا اور خود بھٹی کے پاس آکر بڑی ہی بے نیازی سے ہاتھ تاپنے لگتا کبھی کبھی گاما سنگھاڑیا بھی دکان میں آکر کوئی صوف یا ڈڑا لگا دیتا۔ سٹے کا گھڑا چوک ملکہ بت میں دسے پٹھان کی بیٹھک پر رات کے نو بجے کھلا کرتا تھا۔ ساڑھے نو بجے چاچا امیر دسے پٹھان کی بیٹھک سے بھگتان لے کر دکان پر آجاتا۔ گاما سنگھاڑیا دور سے آواز لگاتا۔

”چاچا! منڈی داکیر بھا اے آج“

گاما سنگھاڑیے کا اگر حرف یا ڈڑا نکل آتا تو وہ روپے دھوتی کے ڈھب میں سنبھال کر پائے ہندو کی بیٹھک پر شراب پینے اور جوا کھینے چل دیتا۔ اگر حرف نہ لکھتا تو مسکرا کر میرے والد سے کہتا۔

”خلیفہ! سٹہ بڑا کتا کم اے۔ لاڈ آدھ سیر دودھ ہی پلاؤ۔“

گاما سنگھاڑیا بد معاش تھا۔ کیونکہ وہ جوا کھیلتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور کمافی دار چاقو ہر وقت ڈھب میں رکھتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کی زبان سے گالی نہیں سنی تھی۔ محلے میں اس نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں کی تھی۔ کبھی شراب پی کر شور نہیں مچایا تھا۔ وہ گلی میں بول سر جھکا کر گزرتا جیسے اپنے گھر کے آگن میں سے گزر رہا ہو۔ ہر ایک سے نرم اور میٹھے لہجے میں بات کرتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار اس نے بہت پی رکھی تھی اور سندھ سنگھ حکیم کی دکان کے

پٹھے پر چوگرٹی مار کر بیٹھا دیو داس کا یہ گانا کارہا تھا۔

بالم آئے بسو مورے من میں

میں اپنی دکان میں دودھ کی کڑا ہی میں کھونچہ پھرتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا گامے سنگھاڑیے کی آنکھیں شراب کے نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی گردن بار بار ڈھلک جاتی تھی رات کے قاباً دس گیارہ بجے تھے۔ گرنی بہت تھی۔ اچانک گاما سنگھاڑیا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگوں پر کالے جیوتے چڑھ گئے تھے۔ اس نے بازار میں کھڑے کھڑے اپنی ریشمی دھوتی اتار رکھا اور اسے جھاڑتے ہوئے ہنسی کر بولا۔

”خلیفہ! کاڈے ای کاڈے“

میرے والد نے فوراً گدے سے اٹھ کر گامے سنگھاڑیے کی دھوتی باندھنی اور کہا۔

”گامیا شرم کر“

گاما سنگھاڑیا اور بچوں کی طرح بازار میں کھڑا میرے والد سے دھوتی بند ہوتا رہا۔ پھر وہ گاما اور بڑا کھڑا ہوا پائے ہندو کی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ اس نے شراب کے نشے میں بازار میں دھوتی اتار دی تھی تو اسے اس قدر ندامت ہوئی کہ وہ تین چار روز تک محلے میں نہ آیا اور بونگھری کی بیٹھک پر ہی رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میں نے گامے سنگھاڑیے کو کم از کم اپنے محلے میں شرابی حالت میں نہیں دیکھا۔

گاما سنگھاڑیے کو سانپ پکڑنے میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ میں نے یہ منظر کئی بار دیکھا کہ گاما بازو پھیلائے سانپ کو دم سے پکڑے جھٹکے دیتا گلی یا بازار میں چلا آ رہا ہے پیچھے بچوں کا ہجوم ہے۔ عورتیں کھڑکیوں میں جھپٹوں کے پیچھے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ پھر گاما دو ایک بار سانپ کو دائرے کی شکل میں گھما کر زور سے زمین پر دسے مارتا۔ سانپ مرجاتا ہم لوگ اسے سٹلی سے باندھ کر گلی گلی گھیسے پھرتے اور پھر محلے کے باہر پامتی گراؤنڈ میں جا کر زمین میں دبا دیتے۔ گلی محلے میں کسی کے گھر سانپ نکلتا فوراً گامے سنگھاڑیے کو بلا لیا جاتا۔ گاما خاص قسم کی سیٹی کی آواز منہ سے نکالتا اور لکڑی زمین پر مارتا کوئے کھدے میں چھپا ہوا سانپ باہر نکل آتا۔ گاما بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے لپک کر اس کی دم پکڑتا اور پلپک جھپکنے میں سے

اٹھا کر جھٹکے دیتا باہر لے آتا ہماری دکان میں رات کو وہ کبھی کبھی سانپوں کی بڑی مزے دار کہانیاں سنایا کرتا۔ اس بات پر اس کا پختہ یقین تھا کہ سانپ سو سال گزر جانے کے بعد جون بدل سکتا ہے۔ یعنی چرند پرند، حیوان، وہ جس شکل میں چاہے نمودار ہو سکتا ہے۔ مستری عبداللہ جو ہر بات پر اعتراض کرتا اپنا فرض سمجھتا تھا کہتا۔

”گامیا! اتنا جھوٹ نہ بولو۔ غلیفے کی دکان کی چھت پہلے ہی کمزور ہے۔“

گاما مسکراتے ہوئے اپنی پنڈلیوں پر ہاتھ پھرتے ہوئے کہتا۔

”مستری! مجھے تو تم بھی سانپ نظر آ رہے ہو۔“

سانپوں کے علاوہ گامے سنگھاڑیئے کو بھڑے یعنی بیٹے پالنے کا بھی شوق تھا۔ چیت دساکہ کے دنوں میں وہ بھڑے کی مادہ پنجرے میں بند کر کے باغوں میں چلا جاتا اور ایک دو زبردستی پکڑے کر لے آتا۔ وہ انہیں خوب دانہ پانی کھاتا۔ ان کی بڑی ٹہل سیوا کرتا۔ صبح عودہ پوری کا ناشتہ کرتا تو بھڑوں کو بھی تھوڑا تھوڑا حلوہ ضرور کھاتا۔ پھر وہ ایک بھڑے کو سہ جانا شروع کر دیتا۔ اس بھڑے کو سہ جانا شروع کر دیتا۔ اس بھڑے کو وہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹے پر بٹھا کر بازار میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے موتیئے کے سفید پھول کو وہ زور سے ہوا میں اچھالتا۔ بھڑا تبر کی مانند لپک کر اوپر اڑتا اور ہوا میں اڑتے ہوئے پھول کو چورچ میں پکڑ کر واپس گامے کی پھلی پر آن بیٹھتا۔ بچے زور زور سے تالیاں بجاتے اور گاما سنگھاڑیئے کا گندنی چہرہ خوشی کی مسکراہٹ سے لال ہو جاتا۔

گرمیوں کے موسم میں گاما سنگھاڑیا کبھی ام لگا لیتا اور کبھی قلفیاں بیچنے چل نکلتا اس زمانے میں آج کل کی طرح ریڑیوں پر قلفیوں کی بے عزتی نہیں ہوا کرتی تھی۔ رات کو ہی گاما من سوامن دودھ کی رڑی بنا کر انہیں قلفیوں اور گولڈ فلیک یا کپشن کے گرم پانی میں دھلے دھلائے شفاف ڈبوں میں بھرنا شروع کر دیتا ان میں پستہ اور بادام کی ہوائیاں چھوڑتا۔ روح کیورہ ڈالتا۔ میں ان بند قلفیوں اور ڈبوں کے کناروں پر گندھا ہوا میدا چپکائے جاتا۔ جب ساری قلفیاں بھر جاتیں تو گاما مٹی کے ایک بڑے سے مٹکے میں برف اور نمک کوٹ کر اسکی ایک تہہ جاتا اور اس کے اوپر قلفیاں جا کر برف کی دوسری تہہ لگا دیتا۔ جب مٹکا بھر جاتا تو وہ اس کا منہ بند کر کے کھل چھت

پر احتیاط سے رکھ دیتا۔ دوسرے دن چھپلاتی دھوپ میں گل کے اخیر میں اس کی آواز سنائی دیتی۔ ”قلنی کھوئے بی دام والی۔“

بوسکی کی قمیض، سلک کی دھوتی اور کاسے پپ شو پہنے، پرنا مونڈھے پر ڈالے گاما سنگھاڑیا دھوتی کا پلو تھامے بڑی شان سے آگے آگے چل رہا ہوتا۔ گلی کی دھوپ میں اس کے گندمی ماتھے پر آیا ہوا پسینہ سر کے تیل لگے بال قمیض کے طلائی ٹن اور پپ شو کی نوک چمک رہی ہوتی۔ پیچھے پیچھے مزدور سر پر قلفیوں سے بھرا ہوا مٹکا اور چوکی اٹھائے آ رہا ہوتا ہمارے مکان کے باہر آکر وہ آواز لگتا۔

”چل بھی میرے پورن بھگت نے باؤ میرے آجا۔“

مجھے وہ ہمیشہ باؤ میرے کہتا اور میری چھوٹی بہن محمودہ کو جس کی عمر چھ برس کی تھی پورن بھگت کے نام سے پکارتا۔ کیونکہ پورن بھگت کی طرح اس کے کٹے ہوئے بالوں کے پٹے گردن پر پڑے رہتے تھے۔ ہم گامے سنگھاڑیئے کو چاچا کہہ کر بلایا کرتے تھے کیونکہ ہمارے والد سے اس کی دوستی اور پیار بھائیوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ میں اور میری چھوٹی بہن محمودہ اس کی آواز سننے ہی اپنی اپنی تھالی لئے بھاگ بھاگ سیڑھیاں اترتے گلی میں آ جاتے۔ گلی میں گاما سنگھاڑیا، چوکی پر بیٹھا، مٹکے میں ہاتھ ڈال کر قلفیاں ٹٹول رہا ہوتا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

”او آگئے میرے پورن بھگت تے میرا باؤ۔“

مٹکے میں سے دو بڑی قلفیاں نکال کر وہ انہیں سادہ پانی کے تیلے میں دو تین ڈبکیاں دیتا۔ پھر بڑی نفاست سے چاقو سے کر قلفیوں کے کناروں پر جا ہوا میدا کھرچتا۔ ایک ہاتھ میں پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں قلفی تھام کر وہ اس مہارت اور نرمی سے اسے دو تین جھٹکے دیتا کہ قلفی اپنے ٹین کے فول سے ثابت کی مہبت نکل کر پلیٹ میں آ جاتی اور روح کیورے پستہ بادام کی لپٹیں آرانے لگتی۔ گاما شیشے کے پیام میں سے لچھے نکال کر اس کے اوپر ڈالتا اور پلیٹ ہمارے ہاتھ میں دے کر پیار سے کہتا۔

”کھاؤ میرے پیو پترو۔“

گاما سنگھاڑیا اپنی مرضی اور اپنی خوشی کے لئے کام کرتا تھا۔ کام سے اس کا مقصد نہ

تو روزی کمانا ہوتا تھا اور نہ کسی کو خوش کرنا۔ بس یونہی جب کبھی گرمیوں میں طبیعت چاہتی تو تھلیاں جالیتا اور کبھی آم خریدنے منڈی جاتا تھا۔ چودھ سات روز کام کرنے کے بعد پھر وہی بجز انگور سے پر بٹھائے بازار میں آجاتا اور اس کے کرب دکھا دکھا کر خود بھی خوش ہوتا اور بچوں کو بھی خوش کرتا۔

جس روز وہ آم لگاتا اس روز مجھے اپنے ساتھ میوہ منڈی ضرور لے جاتا میں نیکر تھیں پہنے تنگے پاؤں بڑا خوش خوش گانے کی انگلی تھامے اس کے ساتھ ہو لیتا۔ میوہ منڈی کا ایک دروازہ بال بازار اور دوسرا رام باغ والی پولیس گارد کی طرف لگتا تھا۔ ہم گارد والے دروازے سے میوہ منڈی میں داخل ہوتے۔ منڈی میں آڑھتیوں اور خریداروں کا شور مچا ہوتا۔ زمین پر کچریاں کچے ہوئے پھل پڑے ہوتے۔ گندے منڈے پھلوں کی تیز بو کے ساتھ ہی ساتھ کسی وقت تازہ آموں کی میٹھی اور گرم ہبک بھی آجاتی آڑھتی اپنے اپنے آموں کی کھاریاں کھولے کھڑے چچ پیچ کر بولی بول رہے ہوتے خریدار اور گرو کھڑے کھاری میں ہاتھ ڈال ڈال کر آموں کے دانے ٹٹولتے۔ ایک ادھر آم چوستے۔ پھر یا تو پرانے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی بول دیتے اور یا آگے دوسری ٹکڑی کی طرف چل دیتے۔ گاما سنگھاڑ یا بھی ہر ٹکڑی میں کھڑا ہو کر سودے کی دیکھ بھال کرتا۔ کھاری میں سے وہ ہمیشہ دو آم نکالتا۔ ایک وہ خود چوستا یا چاقو نکال کر کاٹتا اور دوسرا چپکے سے میرے ہاتھ میں تھا دیتا جسے میں جلدی سے اپنی نیکر کی جیب میں ٹھونس دیتا مجھے یاد ہے۔ جب میں منڈی سے واپس گھر آتا تو میری نیکر کی جیبیں لال پیلے چھوٹے بڑے آموں سے بھری ہوتی ہوتیں تھیں۔ گاما مجھے تاکید کرتا۔

”پورن بھگت کو بھی دینا۔“

گامے سنگھاڑ بیٹے کا آم بیچنے کا انداز بھی اپنا تھا۔ منڈی کے بڑے منگے میں وہ پانی اور برف ڈال کر اسے دسہری اور مال دیو آموں سے بھر دیتا ہماری دکان کے کگے ایک بیچ پڑا رہتا تھا گاما اس بیچ پر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ جاتا۔ برف لگے بیچ آموں سے بھرا ہوا منگہ اور چینی کی شفاف پٹیش پاس ہی رکھی ہوتی لگا ہک کو وہ اپنی مرضی سے آم نکال کر اسے کاٹ کر پلیٹ میں رکھ کر دیتا دو چار روز میں یہ شوق

بھی پورا ہو جاتا اور گاما پھر بجز اور موٹیے کا پھول لے کر چوک میں نکل آتا۔

پھر اچانک محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ گامے سنگھاڑ بیٹے نے شادی کر لی ہے۔ یہ شادی کیسے ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ ان باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں ہے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ گامے سنگھاڑ نے مسجد کے پھوڑے والی اپنی کوٹھڑی چھوڑ کر بازار میں دھرم سالہ کی بفل میں ایک چوبارہ کرائے پر لے لیا اور وہاں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔ میں ان دنوں چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا اور ہماری دکان کے بالکل سامنے طفیل زرگر کی دکان تھی نوے کی اونچی لمبی پیٹی کے سامنے وہ سفید چاندنی پر رکھے ہوئے گاؤں کی پر بیٹھا حقہ پیتا یا پنکھے سے مکھیوں کو اڑاتا رہتا تھا۔ میں دن میں ایک گھنٹہ اس سے حساب پڑھتا اور تقریباً سالانہ اس میں چلیں بھرا کرتا۔ وہ مجھے حلیم دے کر کبھی کا کاغذ کے تنور پر اور کبھی کسی کے گھر آگ لینے بھیج دیتا۔ ایک روز میں گامے سنگھاڑ بیٹے کے گھر حلیم ہاتھ میں تھا اگ لینے گیا تو چوبیس کے پاس بیٹھی ایک گوری چٹی صحت مند عورت نے مجھے پیار کیا اور خود چپٹے سے حلیم میں آگ دھرنے لگی۔ اس نے نخل کا سواری رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے سلیر تھے۔ گلے میں سونے کا ہار تھا۔ اور لال لال گالوں پر سبز رنگ کے خال کے نشان تھے۔ مجھے وہ بڑی اچھی لگی۔ یہ گامے سنگھاڑ بیٹے کی بیوی تھی۔ اب میں طفیل زرگر کی حلیم تھامے گامے سنگھاڑ بیٹے کے گھر ہی آگ لینے جاتا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ گامے سنگھاڑ بیٹے کی بیوی بڑی شان سے ہال کھولے چادر پائی پر بیٹھی رس لگے کھا رہی ہے اور گاما اسی کے سر میں ہادام روغن کی مالش کر رہا ہے جانے کیوں مجھے اس وقت گاما سنگھاڑ یا اچھا نہ لگا۔ مگر گاما سنگھاڑ یا اب بڑا اچھا ہو گیا تھا محلے میں ہر آدمی اس کی کایا پلٹ پر حیران اور خوش تھا۔ اس نے جوا اور شراب چھوڑ دی تھی۔

وہ ہر روز بازار میں کوئی نہ کوئی سودا لگاتا۔ کمانی دار چاقو اس نے میرے والد کو دے دیا تھا۔

”خلیفہ! اب اس کا کوئی کام نہیں رہا۔“

آنکھیں وہ پہلے ہی نیچی کر کے گئی ہیں سے گرد تا تھا اب وہ سر جھکا کر گزرنے لگا۔ اس نے محلے کی مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا بھی شروع کر دیا اور کبھی کبھی نماز بھی پڑھتا

وہ اپنی بیوی کی بے حد خدمت کرتا۔ جو کما تا اس کے آگے رکھ دیتا۔ اسے قسم قسم کی پوشاک پہناتا خود اس نے بوسکی کی جگہ عام پاپلین وغیرہ پہننی شروع کر دی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد اس نے وارھی کا خط بھی بنوایا۔ گاما سنگھاڑیے کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دن بھر وہ گل گل گھوم پھر کر قلعیاں یا پھل بیچتا اور شام کو حلال کی کمائی بیوی کے قدموں پر ڈال دیتا۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ گاما سنگھاڑیا دن بھر کا تھکا ہارا سودا بیچ کر گھر آیا تو چوبارے کی کوٹھڑی اور صندوق چوپٹ کھٹے تھے۔ سارے کپڑے اور زہر غائب تھے۔ اسکی بیوی گامے سنگھاڑیے کو دغا دے کر محلے کے ایک کوچران کے ساتھ بھاگ گئی تھی دو روز تک گاما سنگھاڑیا اپنے چوبارے سے نیچے نہ اُترا۔ تیسرے روز وہ نیچے بازار میں آیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سو جی ہوتی تھیں اس نے بازار کے گرم حمام میں جا کر ڈاڑھی منڈوائی۔ میرے والد سے اگر کمائی دار چاقو لیا پائے ہندو کی بیٹھک پر جا کر جوئے میں کچھ رقم جیتی۔ ڈٹ کر شراب پی اور امرتسر شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک میں نے گامے سنگھاڑیے کو امرتسر میں نہ دیکھا۔ والد صاحب ایک بار اپنے دوستوں سے بات کر رہے تھے تو معلوم ہوا کہ گاما بیبی کی طرہ نکل گیا ہے پاکستان بننے کے بعد میں ایک روز میرا منڈی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے گامے سنگھاڑیے کو پوروی کی دکان کے گنگے بیچ پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے چہرہ بکھا بکھا اور کمزور ہو گیا تھا۔ وہ گردن جھکائے سر کو آہستہ آہستہ جھٹک رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اپنی بوجھل پکیں اٹھا کر سرخ نشیلی آنکھیں سکیر کر مجھے ٹکنے لگا پھر ہلکی سی اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”میں تہانوں پہچانیا نہیں باؤ جی“

مجھے ایک دھکا سا لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں باؤ میدا ہوں چاچا جی“

گاما سنگھاڑیا اتنا س کر ایک پل کے لئے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اچانک بیچ پرے اٹھا دو توبانہیں بھلا کر مجھے سینے سے چمٹالیا اور سسکیاں بھر کر بچوں کی طرح رونے لگا میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ آگے ہفتے میں والد صاحب کو پیغام لے کر اسکے پاس گیا تو پتہ چلا کہ گاما سنگھاڑیا فوت ہو چکا ہے۔ میں اداس اور بوجھل دل لئے واپس آگیا۔ پھر موتیے کے پھول کی تلاش میں کائنات کی دستوں میں کھو گیا تھا۔

امرتسر کا پروفیسر مندری

گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر کے سامنے بیچ تاتھ ہائی سکول کے میدان میں پروفیسر مندری نے زمین پر ایک کافی بڑا دائرہ کیسچا ہے اور خود اس کے بیچ میں بیٹھا زمین پر رکھی ڈٹی کے اوپر دوٹی کھڑی کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیجئے دوٹی کھڑی ہو گئی۔ پروفیسر مندری نے دو تین بار شانے اچکائے ہیں اور آنکھیں بند کر کے ایک اتھ اٹھا کر یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔

آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے

ادھر ادھر سے بچے آکر دائرے کی لکیر پر بیٹھنے لگے ہیں۔ کچھ بڑے بھی ان کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ پروفیسر شعر پر شعر پڑھ رہا ہے۔ کھڑی دوٹی کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے۔ کبھی جھک کر دوٹی کے قریب آنکھی لے جاتا ہے اور پھر ”چھو“ کہہ کر یوں پیچھے ہٹتا ہے جیسے دوٹی سانپ ہو۔ اس قسم کی حرکتوں سے وہ لوگوں کے ذوقِ تجسس کو ہوا دے رہا ہے۔ کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں، چنانچہ پروفیسر مندری ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے پہلے آنکھ سے زمین چھوتا ہے پھر وہی آنکھ کان پر لگا کر کہتا ہے۔

”یا مالک! کسی نیک کے منہ لگانا ——— تو بھی قسم ہے سب کو اپنے ماں باپ کی

ایک بار زور سے تالی بجاؤ۔“

”جمع تالیوں سے گونج اٹھتا ہے۔ پروفیسر مندری کہتا ہے۔

”بچہ لوگ زور سے کہو، شوم جائے۔“

بچے زور سے بولتے ہیں۔ شوم جائے۔“

”یا مولا علی! تیرے نام کا آسرا ہے۔ بھائیو! میرے پاس ٹین کی اس ڈٹی میں سوائے

مندریوں یعنی انگوٹھیوں کے اور کچھ نہیں۔ آپ پوچھیں گے اس مندری میں خاص شے کیا ہے؟ تو
بھائیوں، اس مندری میں اور دوسری مندریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان مندریوں یعنی
انگوٹھیوں میں میرے پیر و مرشد کی کرامت ہے۔ کیا کرامت ہے؟ ابھی سب کو معلوم ہو جائے گا۔
بھائیو! میں کوئی بے ایمان آدمی نہیں۔ ایک شریف گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مجھے روپے کا لاپرواہی
نہیں۔ یہ کام میں صرف خدمت خلق کے لئے کر رہا ہوں، کیونکہ میرے پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔
بچہ لوگ ایک بار پھر زور سے تالی بجاؤ۔

ساتھ بچے نور سے تالیاں بجانے لگتے۔ پروفیسر مندری بچوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔
"بو بھئی، جو لڑکا گھر سے جہاں آیا ہے وہ میدان میں آجائے۔"

ایک لڑکا میدان میں پروفیسر کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ پروفیسر نے ٹین کی ڈٹی میں سے
پتل کی ایک دوپٹے والی انگوٹھی نکالی۔ انگوٹھی میں لال رنگ چمک رہا ہے۔ یہ انگوٹھی اس نے
لڑکے کے انگوٹھے میں ڈال کر لڑکے کا ہاتھ اس طرح اس کی آنکھ پر رکھ دیا کہ انگوٹھی کا ٹکینہ اس کی
آنکھ کے بالکل سامنے آجائے۔ پروفیسر نے اپنے بائیں ہاتھ کے شکنجے میں لڑکے کا ہاتھ جکڑ لیا
ہے۔ اب پروفیسر اور لڑکے کا مکالمہ یوں ہوتا ہے۔

پروفیسر: کچھ نظر آ رہا ہے؟

لڑکا: اپنی آنکھ نظر آ رہی ہے۔

پروفیسر: کہو ہٹ جاؤ۔

لڑکا: ہٹ جاؤ۔

پروفیسر: آنکھ کا عکس ہٹ گیا؟

لڑکا: نہیں۔

پروفیسر: لڑکے کے ہاتھ کو انگلیوں کے شکنجے میں زور سے جکڑتے ہوئے، اب بتاؤ۔

ہٹ گیا؟

لڑکا: (انگلیوں کے شکنجے سے پریشان ہو کر) ہٹ گیا۔

پروفیسر: سو خوش ہو کر، کہو جھاڑو والا آئے۔

لڑکا: جھاڑو والا آئے۔

پروفیسر: جھاڑو والا آگیا؟

لڑکا: (انگلیوں کے شکنجے سے ڈر کر) آگیا۔

پروفیسر: کہو جھاڑو والے صفائی کرو۔

لڑکا: جھاڑو والے صفائی کرو۔

پروفیسر: صفائی کر گیا؟

لڑکا: ہاں۔

پروفیسر: کہو درری والے درری لاؤ۔

لڑکا: درری والے درری لاؤ۔

پروفیسر: درری بچھ گئی؟

لڑکا: ہاں درری بچھ گئی۔

پروفیسر: کہو کرسی والے کرسی لاؤ۔

لڑکا: کرسی والے کرسی لاؤ۔

پروفیسر: کرسی بچھ گئی۔

لڑکا: بچھ گئی۔

پروفیسر: کرسی لوہے کی ہے یا لکڑی کی؟

لڑکا: (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی؟

پروفیسر: (ہاتھ زور سے دبا کر) اب غور سے دیکھ کرسی لکڑی کی ہے یا لوہے کی؟

لڑکا: لکڑی کی۔

پروفیسر: اس میں ہیرے چمک رہے ہیں؟

لڑکا: ہاں چمک رہے ہیں۔

اب پروفیسر مندری لوگوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

"ہندو ہو تو سری کرشن جی، مہاراج کو، سیکھ ہو تو بابا گورو نانک جی کو مسلمان ہو تو حضرت سلیمان علیہ السلام"

کو، اور اچھوت ہو تو سری بالیگ جی کو بلائے۔ لڑکے تیرا نام کیا ہے؟
لڑکا :- غلام حسین۔

پروفیسر :- (ماتما مزید و باکر) تو کہو یا حضرت سلیمان جی!
لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی!

پروفیسر :- مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر اگر بیٹھ جائیں۔

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی! مہربانی کر کے تشریف لائیں اور اس کرسی پر اگر بیٹھ جائیں۔
پروفیسر :- بابا جی آئے ہیں؟

لڑکا :- جی؟

پروفیسر :- (انگلیوں کا ٹکچہ کستے ہوئے) بابا جی آئے ہیں؟
لڑکا :- ہاں جی آگئے ہیں۔

پروفیسر :- کہو یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

لڑکا :- یا حضرت سلیمان جی السلام علیکم!

اب پروفیسر مندری لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہتا:

”اس بھرے مجمع میں سے کسی کو کوئی بھی سوال پوچھنا ہو۔ شادی نہیں ہو رہی، مقدمہ

جیتوں گا یا ہاروں گا، کاروبار چلے گا یا نہیں۔ جو بھی سوال پوچھنا ہو ہاتھ کھڑا کر دے۔“

کئی لوگ ہاتھ کھڑے کرتے ہیں۔ پروفیسر بڑے انکسار سے مسکرا کر کہتا ہے: ا، ہاں ہاں

بھائیو! میں حضرت سلیمان جی کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

پھر وہ ایک آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر پوچھتا ہے:

”ہاں جی بزرگو! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ میرا لڑکا بڑے ہسپتال میں بہت سخت بیمار ہے

اُسے آرام آئے گا کہ نہیں؟“

”آپ کا اسم شریف بزرگو!“

”اللہ دتا۔“

پروفیسر دو تین بار کندھے اچکاتا ہے اور پھر لڑکے کے ماتھے پر انگلیوں کا دباؤ ڈال کر کہتا ہے۔

پروفیسر :- حضرت سلیمان جی سے پوچھو۔ بابا جی!

لڑکا :- بابا جی!

پروفیسر :- اللہ دتا جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا؟

لڑکا :- اللہ دتا جی کا لڑکا جو بڑے ہسپتال میں پڑا ہے ٹھیک ہو جائے گا؟

پروفیسر :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں اگر ٹھیک نہیں ہوگا تو

سر ہلا دیں۔

لڑکا :- اگر ٹھیک ہو جائے گا تو بابا جی شہادت کی انگلی کھڑی کر دیں۔ اگر نہیں ٹھیک ہوگا تو

سر ہلا دیں۔

پروفیسر :- دیکھو بابا جی نے شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے یا سر ہلا رہے ہیں۔

لڑکا :- شہادت کی انگلی کھڑی کی ہے۔

اس جواب کے ساتھ ہی پروفیسر مندری زور زور سے دو ایک بار کندھے اچکاتا اور

اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا:

”ہاؤ بزرگو! بچوں میں مٹھانی بانٹو۔ تمہارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تم سے کچھ

لیا تو نہیں نا؟ تم نے مجھ کو کچھ دیا تو کچھ نہیں نا؟“

وہ بزرگ خوشی سے نہال ہو کر کہتا:

”نہیں بیٹا!“

پروفیسر جمع میں چاروں طرف دیکھتا اور کہتا:

”اس بزرگوار کے بچے کی صحت کی خوشی میں سب لوگ زور سے تالی بجاؤ۔“

سارا مجمع زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ تالیوں کی آواز سن کر کئی راہگیر یہ دیکھنے

کے لئے کھڑے ہو جاتے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جو ایک بار پروفیسر

مندری کے مجمعے میں آکر کھڑا ہو جاتا وہ اُس کی لچھے دار عجز و انکسار سے لبریز باتوں کا اسیر

ہو کر رہ جاتا۔ چار چہ جائزہ منڈول کے سوالوں کے جوابات دینے کے بعد پروفیسر مندر کی اب اس سیانی انگوٹھی کے فوائد گنونا شروع کر دیتا۔

”مقتے کا فیصلہ اپنے حق میں کروانا ہو، نئی شادی کرانی ہو۔ مجبور کو اپنے قدموں پر چبکانا ہو۔ گھر میں درد ہو، غرض جو بھی حاجت ہو، جو بھی بیماری ہو، یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھنے سے دفع ہو جائے گی۔ اب آپ اس کی قیمت پوچھیں گے؟ اس کی قیمت کچھ نہیں۔ میں ایسے لوگوں میں ضرور تمندوں میں، حاجت مندوں میں اپنے پیر و مرشد کا نام روشن کرنے کے لئے مفت بانٹتا ہوں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ اس جگہ عرصہ پندرہ برس سے کھڑا یہ انگوٹھیاں مفت بانٹ رہا ہوں، لیکن اپنے پیر و مرشد کے پاس کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر مجھے ان انگوٹھیوں پر دم کروانا پڑتا ہے، تو صرف آنے جانے کے کرائے کے لئے میں نے اس کا نذرانہ صرف دو آنے، دو آنے رکھا ہے۔“

اب پروفیسر ڈبئی میں سے ساری انگوٹھیاں نکال کر اپنی ہتھیلی میں ڈال لیتا اور کندھے اچکا اچکا کر کہتا:

”میرے پاس بہت تھوڑی انگوٹھیاں رہ گئی ہیں۔ جن صاحب کو لینی ہو گا اور دے کر پکارتے۔ جلدی کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ وہ لے گا تو میں ہوں گا۔ دو آنے دو آنے۔ اچھا مہربان لایا۔“

”ایک انگوٹھی مجھے بھی دینا۔“

”لایا مہربان۔“

”ایک مجھے بھی دینا۔“

”لایا چا چا جی۔“

”ایک اور بھی لائیں۔“

”لایا میاں جی۔“

میں ان دنوں گورنمنٹ اسکول امرتسر میں پڑھا کرتا تھا۔ کلاس روم سے کھسک کر میں پروفیسر مندر کے مجھے میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے بول رہا ہوتا اس

اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جھاگ جمع ہوتا۔ ماتھے پر پسینہ، وہ بار بار گے میں لگے ہوئے پرانے سے چہرہ پونچھتا۔ وہ ہنسی لگی میں رہتا تھا اور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے پکڑ کر میدان میں کھڑا کر دیا۔ میرے انگوٹھے میں انگوٹھی ڈالی اور ہٹ جاؤ جھاڑو والے جھاڑو لادو۔ درمی والے درمی لادو کی گردان شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے مجھے کا ہوں مجھ پر اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی، لیکن میں انتہائی شریر ہوا کرتا تھا۔ اس نے کہا۔

”ہٹ جاؤ۔“

”ہٹ جاؤ۔“

”کیا نظر آ رہا ہے؟“

”آنکھ۔“

”کس کی آنکھ؟“

”میری آنکھ۔“

پروفیسر مندری ذرا سٹپٹایا۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کھیانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

”ابھی دماغ روشن ہو جائے گا۔“

اس کے بعد اس نے اپنی انگلیوں سے میرا ماتھا بڑے زور سے دبانا شروع کر دیا۔

”اب دیکھو۔“

”دیکھ رہا ہوں۔“

”کیا نظر آ رہا ہے؟“

”آنکھ۔“

”کس کی آنکھ۔“

”میری آنکھ۔“

میں پروفیسر کا مجمع خراب کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا۔ فوراً انگوٹھی میرے ہاتھ سے اتار کر ایک معمول میری گردن پر ماری اور کہا۔

”بھاگ جا خیفے دے پتر! آج تو نہا کر اسکول نہیں آیا“

میں بھاگ کر مجھے سے باہر آتا اور کہیں نہ کہیں آدمیوں کے بیچ میں سے گھس کر دو بار مجمع میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتے دیکھتے پروفیسر کی ساری انگوٹھیاں بک جاتیں۔ ڈبئی خالی ہو جاتی اور اُس کی جیب سکوں سے بھر جاتی۔ کئی بار میں نے مجھے میں پروفیسر کے بھائیوں کو بھی۔ انگوٹھیاں خریدتے دیکھا۔ ایک روز جو میں مجمع میں گھسا تو پروفیسر ایک بوڑھے سے پوچھ رہا تھا۔

”باباجی! آپ میری انگوٹھی خرید کر لے گئے تھے نا؟“

”ہاں بیٹا“

”آپ اپنے ایمان سے بتائیں۔ خدا کو جان دینی ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیں کیا آپ کو فائدہ ہوا؟“

”ہاں جی بڑا فائدہ ہوا“

”میں نے آپ سے کچھ لیا تو نہیں؟ آپ نے مجھے کچھ دیا تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔ تو صاحبان!.....“

وہ بوڑھا، پروفیسر مندری کا والد تھا۔

اُدھا امر تسر جانتا تھا کہ پروفیسر مندری جھوٹ کا دھندلا کرتا ہے۔ جعلی انگوٹھیاں بیچتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مجمع میں کھڑے لوگوں کو میں نے اُس پر ہنستے دیکھا ہے پھر بھی لوگ اُس سے انگوٹھیاں خریدتے تھے اور اس کے کاروبار میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ مجمع میں جب کوئی شخص اس پر آوازہ کرتا تو پروفیسر کا آدمی اُس کی گردن پیچھے ہی سے دبوچ کر اُسے نکال باہر لے جاتا۔ اگر کوئی اکڑ جاتا اور لڑائی مار گٹائی پر آمادہ ہو جاتا تو پروفیسر مندری لپک کر اُس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر انکسار سے کہتا۔

”یار جاؤ ناں! کیوں میری روزی میں لات مار رہے ہو؟“

ہندوؤں کے محلے میں مجمع لگانے وہاں تھے پرنٹنگ رگ، سر پر گول ہندوانہ ٹوپی پہن

کر جاتا۔ سکھوں کے علاقے میں وہ سر پر گکڑھی باندھ کر جاتا اور گورو بابا نامک کے نام پر بار بار ہاتھ آنکھوں پر رگ کر چومتا۔ اپنے محلے میں لوگ اُسے فراڈ سمجھتے تھے۔ ہر شخص اُس سے مذاق کرتا۔ اُس کی کسی بات کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ اُسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی جاتی۔ جب وہ انگوٹھیوں والی ڈبئی ہاتھ میں لئے گول ہندوانہ ٹوپی پہنے پرنٹنگ میں ڈالے گلی میں سے گزرتا تو محلے کے بڑے اُس پر آوازیں کستے۔ دکاندار بھی اُس پر ایک اُدھ فقرہ حسرت کرنا کبھی نہ بھولتے۔ پروفیسر اُن سب کا جواب ایک بے ضرر سی، عاجزانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیتا اور کندھے اچکاتا، گردن دابھنے کندھے کی طرف جھکائے گلی میں سے گزر جاتا۔

وہ کشمیری ہاتھوں کی طرح لچیم شحیم تھا۔ دانت چھوٹے چھوٹے تھے، جیسے کسی کسی نے ریتی سے گھسا دیئے ہوں۔ ہمیشہ پرانی سی پتلون اور چٹل پہنتا۔ قمیض پتلون سے باہر رہتی۔ رنگ کھتا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی چالیس کے قریب ہوگی۔ مگر صحت مند تھا۔ ایک زمانے میں اُس نے ریل گاڑیوں میں گھوم پھر کر زنبور سے لوگوں کے دانت نکالنے کا بھی دھندا کیا، مگر یہ دھندا چل نہ سکا۔ انہی دنوں محلے کے پنواڑی چاند خان کی ڈاڑھ میں شدید دواٹھا تو پروفیسر نے اُس کی ڈاڑھ نکالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ چاند خان مان گیا۔ پروفیسر فوراً گھر سے اپنا زنگ آلو زنبور لے آیا اور چاند خان سے بولا۔

”منہ کھولو چاند خان۔“

بوڑھے اور ہڈیوں کے ڈھانچے مراد آبادی پنواڑی نے منہ کھول دیا۔

”اور کھولو۔“

چاند خان نے اور منہ کھول دیا۔

”اور کھولو۔“

چاند خان منہ کھولے ہی کھولے آؤں آؤں کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اس سے زیادہ

منہ نہیں کھول سکتا۔ پروفیسر نے کہا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے دشمن نظر آ گیا ہے۔“

چنانچہ پروفیسر مندری زبور والا ہاتھ لے کر چاند خاں کے کھلے منہ میں گھس گیا اور ایک زبردست دھچکے سے ڈاڑھ اکھاڑ پھینکی۔ چاند خاں بلبلا اٹھا۔ پروفیسر نے کہا۔

”دشمن مارا گیا۔ منہ بند کر لو چاند خاں“

مگر چاند خاں کا منہ دوبارہ بند نہ ہو سکا۔ جانے جبر سے کی کوئی ہڈی کس ہڈی پر چڑھ گئی تھی کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پروفیسر وہاں سے بھاگ گیا اور چاند خاں کو محلے والے تلنگے میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ پروفیسر ایک لارکی میں بیٹھ کر جان بھر کی طرف نکل گیا اور کئی روز محلے سے غائب رہا۔ ایک روز میں شہر کی ہندو آبادی میں اپنے ایک دوست شانتی سروپ سے ملنے گیا تو میں نے پروفیسر کو ایک مندر کے باہر مجمع لگائے دیکھا۔ ماتھے پر تلک تھا۔ سر پر ہندو نہ ٹوپی تھی اور وہ بار بار شری رام شری رام کرشن جی مہاراج کا نام لے رہا تھا اور ہر بار ان کے نام پر ہاتھ چوم چوم کر آنکھوں کو لگا رہا تھا۔ میں اس کے مجمع میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ ماتھا اور گنجا سر پسینے میں شرابور تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ فوراً میرے قریب آیا اور سر پر ہاتھ پھر کر بولا۔

”گوپال پتر! جاؤ تمہاری ماما جی یاد کر رہی ہیں“

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں کہنے ہی لگا تھا میں گوپال نہیں حمید ہوں کہ پروفیسر نے مجھے آنکھ ماری اور دوبارہ ہندوؤں کو اپنی لچھے دار باتیں سناتی شروع کر دیں۔ میں وہاں سے چل دیا۔

چاند خاں ہسپتال سے ٹھیک ہو کر یعنی اپنا منہ بند کر کر آیا تو پروفیسر اس کی دکان پر خود گیا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگ لی۔ چاند خاں بڑی تنک مزاجی سے اس پر برتا رہا۔ پروفیسر ہاتھ باندھے کھڑا رہا اور عاجزانہ انداز میں یہی کہتا رہا۔

”معاف بزرگو! معافی“

یہ سب یہ انجمن پروفیسر مندری کے کردار کا جزو اعظم تھا۔ ایک عاجزانہ سی، کھیاانی

سی ہنسی ہر وقت اس کے چہرے پر رہی۔ آج میں پروفیسر کا چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کی عاجزی میں بے جا رگی نہیں تھی، بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور سکون سا تھا۔ ایک جوگی، ایک ستیاسی کا سکون جو مٹی کو سونا کے بھید سے واقف ہو گیا ہو اور جس کے نزدیک اب سونا مٹی بن کر رہ گیا ہو۔ محلے والے اسے بے وقوف بناتے اور وہ فوراً بے وقوف بن جاتا، بلکہ اپنی کچی اور کھسیانی باتوں سے دوسروں کو شہ دیتا کہ اسے احمق بنایا جائے۔ کوئی بڑا بوڑھا اسے اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ کسی بھی گھریلو یا معاشرتی مسئلے پر اس کی رائے لی جائے۔ گلی کا کوئی ورزی، عطار، حلوائی یا کھرک پروفیسر پر پھبتی کستا تو جواب میں پروفیسر ہنس دیتا۔ اگر کچھ کہتا تو بس اتنا۔

”خوش رو یا رتوں“

اس کی زبان پر اپنے اور غیروں کے لیے ہمیشہ کلمہ خیر ہوتا۔ میں نے اسے کبھی کسی کو گالی دیتے یا بدعما نہیں سنا۔ میں نے کبھی اسے کسی پر ناراض ہوتے یا غصے میں آگ بگولا ہوتے نہیں دیکھا، حالانکہ اس کا دھندا ایسا تھا کہ اسے لوگوں کی پھبتیاں اور آوازے دن میں کئی بار سننے پڑتے۔ کبھی کبھی میں اسکول جا رہا ہوتا یا اسکول سے واپس آ رہا ہوتا تو پروفیسر سر پر ہندو نہ ٹوپی رکھے، ہاتھ میں ٹین کی ڈبیا لیے مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیتا میرے قریب سے گزرتے ہوتے وہ مسکرا کر کہتا۔

”یار حمیدے۔ خوب پڑھائی ہو رہی ہے پھر“

نماز پڑھتے وہ کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ گلی میں وہ ہمیشہ سر جھکائے داخل ہوتا اور سر جھکائے نکل جاتا۔ ایک برس لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا عرس ہوا تو پروفیسر میلے میں مجمع لگانے کے خیال سے ریل میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے راستے یعنی اتاری کے سٹیشن پر پکوڑے خریدنے پلیٹ فارم پر اتر رہا تھا کہ انگوٹھا ڈبے کے دروازے میں آکر آدھا کٹ گیا۔ فوراً عرس مبارک پر جا کر مجمع لگانے کا خیال ترک کیا اور بس ٹک بیٹھ کر واپس امرتسر آ گیا۔ میرے والد نے وجہ پوچھی تو کندھا اچکا کر بولا۔

”خلیفہ! سوچا جائے تو میں لوگوں کو دھوکا دینے عرس مبارک پر چارہا تھا۔ قدرت

نے مجھے وہیں روک دیا۔

اس حادثے کے بعد پروفیسر نے زندگی بھر کی دانا صاحب کے عرس پر جمع نہ لگایا۔ ایک دفعہ ہماری گلی میں محلے کے ایک مالدار شخص کے بیٹے نے کسی بات پر غصا ہو کر ایک جولاہے کے لڑکے کو اس زور کا مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون جاری ہو گیا۔ پروفیسر گلی میں سے گزر رہا تھا۔ اُس سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ جھٹ آگے بڑھا اور زخمی غریب لڑکے کو پیار کرنے اور اپنا پرنا گیلان کر کے اُس کا خون صاف کرتے لگا۔ امیر لڑکے سے صرف اتنا کہا۔

”یار لڑائی جھگڑانہ کیا کرو۔“

امیر زادہ تنک کر بولا۔

”تم کون ہوتے ہو گنجے پروفیسر۔“

پروفیسر عاجزی سے بولا۔

”یار مجھے چاہیے جو کچھ کہہ لو اس لڑکے کو کچھ نہ کہو۔ یہ تو بے چارہ غریب ماں باپ

کا بیٹا ہے۔“

امیر لڑکے کا مالدار باپ بھی اپنے دیوان خانے کی کھڑکی میں بیٹھا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ غصہ کھا کر باہر آیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑا دھڑا پروفیسر کے منہ پر ٹھانچے مارنے شروع کر دیئے۔ پروفیسر کے دانتوں میں سے خون بہنے لگا۔ وہ گیلے پرنے سے خون پونچھتا جاتا تھا اور کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہے جاتا تھا۔

”معاف کر دیو بزرگو! معاف کر دیو۔۔۔۔۔“

نسب و نسب کے قیامت خیز دنوں میں اسی مالدار شخص کے بڑے بیٹے کو گولی لگی تو محلے میں سے کوئی بھی اُسے برستی گولیوں میں ہسپتال لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ پروفیسر نے شدید زخمی نوجوان کو ہانگے میں ڈالا اور اپنی جان پر کھیل کر اُسے ہسپتال لے گیا۔ اُس کے چھوٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ گھر میں اپنے ماں باپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ کبھی اُن کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتا تھا۔ اُسے کوئی نشہ بھی نہیں لگتا تھا۔

نہ پان تبا کو نہ جوان شراب۔ دن میں ایک مرتبہ دوپہر کو روکھی سوکھی کھا لیتا۔ جو کچھ کما کر لاتا اپنی ماں کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا۔ باپ بوڑھا ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ پروفیسر نے لوگوں کی پھبتیاں سنیں، طعنے سہے، آواز سے سننے، مگر بہن بھائیوں سے۔ پرورش کی۔ بہنوں کی اچھی جگہ شادیاں کیں، اور اب وہ اپنے اپنے گھر خوش و خرم ہیں۔ دو بھائی اور ایک بہن لندن میں ہے۔ پروفیسر مندر کی نے خود زندگی بھر شادی نہ کی۔

پاکستان بن جانے کے بعد وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ لاہور آ گیا۔ لاہور میں وہ جب کبھی مجھے بھائی یا نسبت روڈ یا میکورڈ روڈ پر ملتا، سب گھر والوں کی فیروہ فیت دریافت کرتا۔ محلے والوں کی بابت پوچھتا۔

”یار ہماری گلی کے سب لوگ آگئے تھے نا؟“

اُسے اپنے محلے کے سب لوگوں کی فکر تھی۔ اُن لوگوں کی بھی جو اُس پر آوازے کستے تھے۔ اُن لوگوں کی بھی جو اُسے احمق بنایا کرتے تھے۔ اُن لوگوں کی بھی جو بیچ بازار میں اُس کی بے عزتی کر دیا کرتے تھے۔ اُسے کسی کی نفرت یا دہشت تھی۔ وہ سب سے محبت کرتا تھا اور سب کی خیر کا طالب تھا۔

لاہور آکر اس نے ابتدا میں جمع لگایا، انگوٹھیاں بیچتا رہا۔ اس کے بعد جمع لگانا چھوڑ دیا۔ اب اُس کے چھوٹے بھائی جوان ہو گئے تھے اور کمانے لگے تھے۔ بہنیں اپنے اپنے گھر آباد ہو گئی تھیں۔

ایک روز میں سرما کی چکیل دھوپ میں بارخ جناح میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھوم رہا تھا کہ میں نے پروفیسر کو ایک پلاٹ میں بیٹھے دیکھا۔ وہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے بڑے کر کے چڑیوں کو ڈال رہا تھا۔ چڑیاں ہری ہری گھاس پر خوشی سے چبک چبک کر بڑے چبک رہی تھیں۔ پروفیسر چڑیوں کو دیکھ کر بڑا خوش ہو رہا تھا۔ کبھی کوئی چڑیا اُس کے ذرا قریب آکر اپنی چونچ اٹھا کر اُسے تنگے لگتی تو وہ اُس کی طرف گردن نہ جھکا کر پچکارتے ہوئے باتیں کرنے لگتا۔ مجھے اُس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، مگر اُس کی جھکی ہوئی گردن، مسکراتا ہوا چہرہ اور ہلے ہوئے ہونٹ صاف نظر آ رہے تھے۔

تھے۔ مجھے یقین ہے وہ چڑیوں سے یہی پوچھ رہا ہوگا۔

”کیوں بھئی تنہی متی چڑیو! کیا حال چال ہے؟“

آخری بار میں نے پروفیسر کو اتار گلی سے گزرتے دیکھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اتار گلی میں بڑا رش تھا۔ پروفیسر کو اتار گلی دروازے سے نیلے گنبد کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی گردن بائیں کندھے پر ذرا جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر وہی بھولی بھالی پُرسکون سی مسکراہٹ تھی اور وہ لوگوں کے شور و غل اور ہجوم سے بے نیاز یوں چلا جا رہا تھا جیسے بارغ جناح کی کسی سایہ دار سُنسان روٹ پر سے گزر رہا ہو۔ پروفیسر لاغر اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا اور اپنی دنیا میں مگن میرے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ میں اُس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دیا۔ وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔ وہ مجھے ہمیشہ بڑا اچھا لگا تھا۔ وہ نقلی پروفیسر تھا اُس کے پاس کسی سکول، کسی کالج، کسی یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے۔ وہ اُن پڑھ تھا اُس نے کبھی کسی کالج کے کلاس روم میں لیکچر نہیں دیا تھا، اُس نے کالجوں اور سکولوں کے باہر جمع ضرور لگایا تھا۔ میرے خیال میں اُس نے اپنے نمبروں میں جو لیکچر دیئے وہ آج کے پروفیسر کے لیکچروں کے مقابلے میں زندگی سے زیادہ قریب تھے۔ اُس لئے کہ آج کے پروفیسر کو ٹائمریری نے جنم دیا ہے اور وہ پروفیسر بھوک، افلاس، معاشرتی نا انصافی اور مردم آزاری کی دلدلوں میں پیدا ہوا۔ آج کے پروفیسر کے اصلی سرٹیفکیٹ جھوٹے ہیں اور کل کے پروفیسر کے جھوٹے تمنے سچے تھے۔ اُس نے اپنے لیکچروں سے کسی طالب علم کی تربیت نہیں کی۔ وہ خود ہی مرتب ہو گیا۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب پارس پتھر بن گیا جو اپنی اجزائی کمی بیشی کے باعث کسی کو سونا تو نہ بنا سکا، لیکن خود سونا ہو گیا۔

آج سے چند برس پہلے مجھے کسی نے بتایا کہ پروفیسر مر گیا۔ جانے کیوں یہ خبر سننے ہی میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہی مسکراہٹ جو ایک دوپہر پروفیسر کو اتار گلی میں سے گزرتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر آئی تھی۔ اور

پھر میں نے ایک منظر دیکھا۔ سنہری دھوپ میں زمرد کی طرح دکھتا، سرخ گلابوں سے بھرا ہوا خوشبودار بارغ۔ اور اس بارغ کے شفاف پانیوں والی نہر کے کنارے پروفیسر

گھاس پر بیٹھا نیلی آنکھوں والی سبز چڑیوں کو دانہ ڈال رہا ہے۔ ایک بھولی بھالی چڑیا اپنی سرخ چونچ اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی ہے اور پروفیسر اُسے پچکارے ہوئے ذرا سا مسکرا کر پوچھتا ہے۔

”کیوں بھئی تنہی متی چڑیو! کیا حال چال ہے؟“

امرتسر کے جن اور بھوت

دیے تو امرتسر کا ہر مسلمان اپنی جگہ پر جن تھا پھر بھی شہروں کے اپنے بھوت پریت ہوتے ہیں ان کی اپنی کہانیاں ہوتی ہیں، ہر کہانی کو سچا واقعہ کہہ کر سنایا جاتا ہے۔ سنانے والا اپنی بساط کے مطابق اس کے گرد آسیب اور دہشت کے اے بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ آسیبی کہانیاں سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی خاص شہر کی معاشرتی زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔

امرتسر کی ایک چڑیل میان پوترو کی کہانی میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ آج آپ کو کچھ اور بھوت پریت کے واقعات سناؤں گا۔ یہ سارے جن بھوت پاکستان بننے کے بعد امرتسر میں ہی رہ گئے اور اگر پاکستان چلے آئے ہیں تو ان سے پھر کبھی یہاں ملاقات نہیں ہوئی۔

دادا جان سنایا کرتے تھے کہ جب پہلی بار ریل گاڑی چلی تو امرتسر کے چاروں طرف پھلدار باغ اور ٹاہلیاں ہی ٹاہلیاں ہوا کرتی تھیں اور وہاں دن میں جاتے ہوئے بھی آدھی گھبراتا تھا۔ باغوں کے راکھے بلند آواز میں چڑیاں طوطے اڑا کر اپنے دل کا خوف کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں ایک درخت آسیب زدہ تھا۔ دادا جان کہتے ہیں کہ اس درخت پر کبھی کسی راتوں کو آگ کی چٹکائیاں اڑا کرتی تھیں ایک بار ایسا ہوا کہ رات کو باغ کے راکھے کی آنکھ کھل گئی۔ پھلوں کا موسم تھا۔ سارا باغ گول گول سفید امرودوں سے لدا ہوا تھا۔ اسے یوں دگا جیسے کوئی امرود توڑنے باغ میں گھس آیا ہے۔

وہ اپنی چھوٹی سی سے لکل کر باہر آیا تو اسے ستاروں کی دھیمی روشنی میں آسیبی درخت کے نیچے ایک آدمی دکھائی دیا جو ٹوکری امرود بھر رہا تھا رکھا رکھا وہیں سے لکار کر اس کی طرف بڑھا اور سوٹیا گھا کر اس کی ٹانگوں پر مارنا چاہتا تھا کہ وہ آدمی غائب ہو گیا۔ راکھے کا سوٹنا اوپر کا اوپر ہی رہ گیا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درخت کی شاخوں سے کوئی شے دھپ سے زمین پر گر گئی اور راکھ بھٹکتی ہوئی

راکھے کے پاؤں کے ساتھ اگر لگ گئی راکھے نے جھک کر دیکھا۔ وہ کسی انسان کا تانہ کٹا ہوا سر تھا۔ اگلے روز راکھے کی لاش اسی درخت کے ساتھ لٹکتی پائی گئی۔ اس کے بعد کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا جس شخص نے امرودوں کا ٹھیکہ لیا تھا اس کے مزدور بھاگ گئے۔ میں نے امرتسر میں ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ گمروں میں ایک طاق مزدور ہوتا جہاں جمعرات کی جمعرات دیا جلا جاتا۔ ہمارے گھر کی پھلی کو ٹھڑی میں بھی ایک طاق تھا میری نانی یہاں پر جمعرات کی شام کو دیا جلا کرتی۔ دہلی پتلی سفید سی بوڑھی عورت تھی، گندرونی سے بنائی گئی ہے۔ کشمیری زبان بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ ایک روز میرے پوچھنے پر نانی نے بتایا کہ طاق میں بابا جی رہتے ہیں میں اس کو ٹھڑی میں جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک روز نانی دیا جلا کر گئی تو میں نے کیواڑ کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ کا چہرہ دیئے کی نوک کے ساتھ لگا مسکرا رہا ہے میں پیچھے مڑ کر اٹھ بھاگا اور جا کر نانی سے پوچھا اس نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

بابا جی اتم سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ اسے تو ان کی دعاؤں سے تو اس دنیا میں آیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ یہ میرا وہم تھا۔ لیکن اس عہد کے لوگ ان باتوں پر بڑا پکا یقین رکھتے تھے۔

میری آپو جی نے مجھے ایک کہانی سنائی کہ ایک جن تھا جو سمرقند سے امرتسر کی ایک مسجد میں مؤذن بن کر آیا۔ وہ دہلا اور لمبا تھا۔ جب اذان دیتا تو اتنا لمبا ہو جاتا کہ گردن نیچی کر کے سارے امرتسر شہر کا نظارہ کر لیتا بھاری گلی میں ایک لمبا رنگ آدمی تھا کہ اس کے قائد رو یعنی نان ہائی کی دکان پر رات کو خیر گو نہ جا کر تاتھا اس کی گردن اونٹ کی طرح لمبی تھی اور جھک کر چلا کرتا۔ رات کو کاکے کی دکان میں خیر گو نہ تھا اور دن شہر سے باہر کسی تالاب پر مچھلیاں پکڑنے میں گزار دیتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی وہ سمرقند کا جن ہے جس کی کہانی آپو جی نے سنائی تھی۔ وہ جب مچھلیاں پکڑنے والی لمبی چھڑی کندھے پر رکھے، بغل میں تھیلہ لٹکائے گی میں سے گزرتا تو میں بھاگ کر مکان کی سیڑھیوں میں چھپ جاتا۔

لٹکے نانہائی کی دکان میں ایک کتا بھورا آدمی تھا جو قچے گھڑا کرتا تھا وہ سارے کا سارا بھورا تھا۔

پلیس بھی بھوری تھیں اور آنکھیں میچ کر دیکھا کرتا۔ بالکل اُن پڑھ تھا اس کے سر پر جن کا سایہ تھا۔ جب کبھی اسے دور پڑتا تو اس کی آواز بھاری ہو جاتی۔ وہ پوری آنکھیں کھول لیتا اور فر فر فارسی بولنی شروع کر دیتا۔

احمد رفوگر کو آدمی سے زیادہ مثنوی مولانا مودتھی۔ اس نے ایک بار جن کی فارسی کا امتحان لیا اس نے

بھورے سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ بھورے نے کہا۔

”میرا نام سلیمان جن ہے اور میں ایران سے آتا ہوں۔“

”کیا تم ہمیں مولانا روم کی فتویٰ کے شعر سناسکتے ہو؟“

سلیمان جن نے ترنم سے مثنوی رومی سنائی شروع کر دی۔ دکان پر محلے والوں کا جھگڑا لگا تھا۔ مولوی سلام بابا پر تو رقت طاری ہو گئی۔ احمد رفوگر بھی سر جھکائے جھوم رہا تھا۔ سلیمان جن نے کہا:

”اب بتاؤ کون سا پھل کھاؤ گے؟“

احمد رفوگر نے کہا۔

”کوئی بے موسمی پھل آنا چاہیے۔“

بھورے نے اپنے جسم کو سمیٹ کر ہاتھ واسکٹ کے اندر ڈالا اور ایک سرخ قندھاری اتار نکال کر تخت پوش پر رکھ دیا حالانکہ وہ موسم اتاروں کا نہیں تھا۔ لوگوں نے فرط عقیدت سے اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سلیمان جن نے کہا:

”اچھا اب ہم جلتے ہیں، پھر ٹپیں گے۔“

یہ ساری گفتگو وہ فارسی زبان میں کر رہا تھا جس کا ترجمہ ساتھ ہی ساتھ احمد رفوگر لوگوں کو سنائے جاتا تھا جن چلا گیا تو بھورا نیم جان سا ہو کر تخت پوش پر لیٹ گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ ویسے کا ویسا اُن پڑھ تھا اور وہ فارسی کی الف ب سے بھی ناواقف تھا، ضعیف الاعتقاد عورتیں اور مردوں نے بھورے کو اپنا پیرونا لیا اور منتیں ماننے کے بعد پھر کبھی اس کی شکل نہ دیکھی۔

بھاری ساتھ والی گلی میں ایک سیکہ پر بھی جن آتا تھا۔ ظاہر ہے اس کا جن بھی کوئی سکھ ہی ہو گیا اگر سکھ نہیں تھا تو دو تین بار اس سیکہ پر آنے کے بعد خود بھی سکھ ہو گیا ہو گا ویسے بھی اس جن کے سکھ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جو ایک سکھ پر آجائے۔ میرا خیال ہے جن لوگوں نے اس سر کے سکھ دیکھے ہیں انہیں جن دیکھنے کی حاجت نہیں ہوگی۔ یہ سیکہ جو بھاری ساتھ والی گلی میں رہتا تھا۔ ایک ترکھان تھا اور نہایت شریف آدمی تھا۔ وہ لوگ جن کو مسان کہتے تھے۔

جس وقت سکھ کو دورہ پڑتا تو وہ پتے سر کو اس زور سے جھٹکا دیتا کہ گڑھی اچھل کر دور جا پڑتی اور کیس کھل جاتے بکریوں کہنا چاہیے کہ بالوں کا سوٹ کیس کھل جاتا اس کے سر کے بال مونچھوں کے بال ڈاڑھی کے بالوں میں الجھ جاتے اور وہ ایک ٹانگ پر رقص کرنا شروع کر دیتا۔ اس سے پہلے

میں نے اتنا زیادہ کھلا سکھ کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے گھروں کے سامنے والی ٹولی کو بلا لیتے جو سارا سارا دن اور ساری ساری رات دھول کا کھڑکا اور چھینے بجا بجا کر محلے والوں کا ناک میں دم کر دیتے۔ سکھ بے چارے کو ہرل کی دھونی دیتے مگر جن اس بے چارے سکھ کو بچائے چلا جاتا۔ بھلا جو جن سکھ کو برداشت کر سکتا تھا۔ ہرل کی دھونی اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتی تھی۔

سان عام طور پر ہندو سکھوں کے گھروں میں آتے تھے اور جن مسلمانوں پر سوار ہوتے تھے۔ چیلپس اجاڑ باغوں، اور ویران، پرانی حویلیوں میں ڈیرہ لگاتی تھیں۔ چیلپڑے درختوں میں بےیر کرتے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی شکل میں آدھی رات کے وقت مسافروں کو ملتے۔ ان کا راستہ روکتے، قہقہے لگاتے اور پھر انہیں بے ہوش کر کے غائب ہو جاتے۔ ان کے رنگ کالے ہوتے اور منڈے ہوئے سروں پر لمبی بودیاں ہوتی تھیں۔ ہماری گلی میں پوربے کا لڑکا لگا تھا اور اس کی لمبی بودی تھی ہم اسے چھیداکھ کر روڑے مارا کرتے تھے۔

ہمارے محلے میں ہی ایک دائی رہتی تھی جس کا ہم مجھے معلوم نہیں کیا تھا لیکن محلے میں وہ اپنی، ڈب ڈبی کے نام سے مشہور تھی۔ محلے کی ایک پوری نسل کی دایہ گری اسی نے کی تھی۔ سرخ و سفید بھاری بھر کم بڑی رعب داب والی کشمیری عورت تھی۔ اس کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی مشہور تھی۔

کہتے ہیں کہ سردیوں کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ اس سر شہر سنان پڑا تھا۔ اپنی ڈب ڈبی کا گھڑی لیے لحاف میں گہری زیند سو رہی تھی کہ اچانک کسی نے دھڑ دھڑ دروازہ پٹیا شروع کر دیا۔ اپنی ڈب ڈبی کی آنکھ کھل گئی۔ کمرہ پر مڑ کر مڑ پڑا پھر۔ نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا کھڑکی کھول کر چپ اٹھا کر گلی میں جھانکا۔

”کون ہے؟“

سمجھ گئی کہ کوئی ارجنٹ کیس آیا ہے۔ نیچے سے کسی مرد نے آواز دی۔

”بہن جی! جلدی چلیے۔ زچہ کی حالت بہت خراب ہے۔“

آپا ڈب ڈبی نے اپنے جوان بیٹے کو جگایا۔ نیچے آئی۔ دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والا آدمی کھڑا ہے کہنے لگا۔

”بہن جی! میری بہو کے بچہ ہونے والا ہے میرے ساتھ چلئے۔“

اُدھی رات، سخت سردی، ایک اجنبی کوئی۔ اپنی ڈب ڈبی نے کہا:

”بھائی جان آپ کو میں نے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کس محلے سے آئے ہیں؟“

اس اُدھی نے کہا:

”بہن! ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے سوچا تھا۔ بہو کو بچہ

ہونے والا ہوگا تو آپ ہی کو بلائیں گے۔ آج خداوندین نے آیا ہے۔ سو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔

برائے مہربانی جلدی چلئے۔ آپ جتنی رقم کہیں گی میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

اپنی ڈب ڈبی نے کہا:

”جانا کہاں ہوگا؟“

وہ اُدھی بولا:

”زیادہ دور نہیں۔ بس یہی کوئی دو محلے چھوڑ کر ہی اپنا گھر ہے۔ خدا را دیر نہ کریں۔ میری بہو کو اس

وقت آپ کی سخت ضرورت ہے۔“

اپنی ڈب ڈبی نے کہا:

”میں سو سو روپے لوں گی؟“

اس نورانی چہرے والے اُدھی نے کہا:

”میں آپ کو دو سو روپے دوں گا۔ آپ میرے ساتھ چلے جائیں۔“

دو سو روپے آج سے پچاس برس پہلے پانچ ہزار سے کچھ زیادہ ہی قیمت رکھتے تھے۔ اپنی

ڈب ڈبی لالچی عورت تھی فوراً تیار ہو گئی۔ اس نے گرم شال جسے ہم امرتسری کشمیری فرد کہا کرتے تھے لٹھی

کاٹری میں تھے کوٹے ڈال کر ساتھ لیا اور گئی۔ باہر آگئی۔ بازار سناٹا تھا۔ سخت سردی تھی ایک

تانگہ کھڑا تھا۔ بڑا خوبصورت تانگہ تھا۔ سفید گھوڑا جتنا تھا جس کا سار چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

کوچوں خاموش بیٹھا تھا۔ اپنی ڈب ڈبی تلگے میں سوار ہو گئی۔ وہ نورانی صورت والا اُدھی بھی آگے بیٹھ

گیا اور تانگہ ہوا سے باتیں کرنے لگا بازار ختم ہو گیا۔ تانگہ گوالی گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اور ٹھٹھری رات

کی خاموشی میں ایک ویران سڑک پر دوڑنے لگا۔ اپنی ڈب ڈبی نے پوچھا کہ بھائی صاحب آپ کہاں جا رہے

ہیں؟

اس اُدھی نے بڑی ملائمت سے کہا:

”بہن! ہمارا مکان ذرا شہر سے باہر ہے آپ گھبراہٹیں نہیں۔ ہمارا اُدھی آپ کو واپس گھر چھوڑ کر

آئے گا۔“

تانگہ اب جرنیلی سڑک پر آگیا تھا اور بڑی برق رفتاری سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ اپنی ڈب ڈبی کو اپنی

کاٹری سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے ایک بات غامض طور پر محسوس کی کہ اسے تیز ہوا میں بھی

نہیں لگ رہی۔ جب تانگے نے بجلی والی نہر کا پل عبور کیا تو وہ گھبرا گئی اس نے کہا:

”تانگہ روک دیں میں آگے نہیں جاؤں گی۔“

اس اُدھی نے کہا:

”بہن پریشان نہ ہوں۔ ہم غریب لوگ ہیں بڑے شریف ہیں۔ یہو بیٹیوں والے ہیں بس مکان

کنے ہی والا ہے۔“

اور پھر بجلی والی نہر سے کوئی اُدھی مل آگے جا کر تانگہ دائیں جانب کھینچتوں میں گھوم گیا اور تھوڑی

دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

”تشریف لائیے۔“

آپا ڈب ڈبی نے دیکھا سامنے ایک جھونپڑا تھا وہ اُدھی اسے ساتھ لے کر جھونپڑے میں

آگیا۔ وہاں ایک چراغ مل رہا تھا جس کی مدد سے روشنی میں ایک عورت چارپائی پر لیٹی دروازہ میں مبتلا

تھی۔ اپنی ڈب ڈبی فوراً اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جھونپڑے میں ایک فونائیدہ بچے کے

رونے کی آواز بند ہوئی۔ لڑکا پیدا ہوا تھا۔ نورانی صورت والے بزرگ نے اپنی ڈب ڈبی کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے کونے میں سے کچھ کچھ کوٹے اٹھا کر اس کی کاٹری میں ڈالے اور کہا:

”ہماری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول کر دیں۔“

اپنی ڈب ڈبی کو سخت غصہ آیا کہ یہ لوگ اُدھی رات کو اسے اٹھا کر لے آئے اور اب اسے کوٹے

انعام میں دے رہے ہیں۔ ویسے وہ کچھ ڈر بھی گئی تھی اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ان لوگوں کا ایک

اُدھی اسے تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑ گیا۔ اپنی ڈب ڈبی نے غصے میں اگر ان کے دینے ہوئے کوٹے راستے

میں پھینک دیئے۔ رات تین بجے وہ گھر پہنچی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ جان بچا کر آئی۔ صبح اٹھ کر کاٹھڑی کو دیکھا تو وہاں رات کے بچے ہوئے جو دو ایک کوٹے رہ گئے تھے وہ سونے کی ڈلیوں میں تبدیل ہو چکے تھے آپنی ڈب ڈبی سرپیٹ کر رہ گئی۔ اصل میں وہ لوگ جن تھے اور انہوں نے اسے کوٹے کی شکل میں سونے کی ڈلیاں انعام کے طور پر دی تھیں۔ صبح آپنی ڈب ڈبی اپنے لڑکے کو لے کر رات والی جگہ کی طرف گئی مگر وہاں اب نہ وہ جھونپڑی تھی اور نہ وہ لوگ۔

چھ ہرٹہ کی طرف جاتے ہوئے خالصہ کھلے کے عقب میں رام تیرتھ روڈ تھی۔ اس سڑک پر ایک پرانا مندر تھا جہاں ایک زمین دوڑ کھڑا تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اس کنڈ کے بارے میں مشہور تھا کہ بن باس کے دنوں میں سینا اپنے کپڑے یہاں دھویا کرتی تھی۔ اس کنڈ کے اوپر لکیر کا درخت تھا جس میں ایک چڑیل کا بیرا تھا۔ لوگ اس طرف نہیں جاتے تھے۔ شریف پورے کا ایک درزی چھ ہرٹہ کھو رنگ فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر واپس آ رہا تھا کہ رام تیرتھ روڈ پر مندر کے پاس آندھی شروع ہو گئی۔ آسمان ہلکی کے رنگ کا سا ہو گیا۔ ہوا کا اتنا زور تھا کہ درخت دھیرے دھیرے جا رہے تھے۔ درزی ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس تیز آندھی میں مندر کی طرف سے ایک کھلے بالوں والی عورت ہاتھ پر چراغ رکھے اس کی طرف چلی آرہی ہے۔ اس قدر برق رفتار ہوا میں بھی چراغ کی ٹو بالکل بیجا تھی۔ درزی کو ایک دم رام تیرتھ کی چڑیل کا خیال آ گیا۔ عورت اب قریب آگئی تھی اور اس کے باہر نکلتے ہوئے دو لمبے دانت درزی کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ ایک دم اٹھا اور شریف پورے کی طرف دوڑا گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے گھر بیٹ میں زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

”دروازہ کھولو ماں! دروازہ کھولو۔“

”کھولتی ہوں۔“

اندر سے ماں کی آواز آئی۔ پھر دروازہ کھل گیا اور درزی ایک بھیاکے بیچ مار کر سیر حید میں پہنچ ہو گیا کیونکہ دروازہ رام تیرتھ کی چڑیل ہی نے کھولا تھا۔

ہمارے خالوجان فرصت کے اوقات میں بچوں کو قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی کوٹھڑی میں اپنے ایک شاگرد سے پاؤں دہرا رہے تھے انہوں نے کہا۔

”عبدالرحمان! بیٹا چراغ کی ٹو اونچی کر دو۔“

کوئی پندرہ فٹ کے فاصلے پر طاق میں دیا جل رہا تھا۔ عبدالرحمان نے چار پانی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پندرہ فٹ لمبا کیا اور دیکھے کی ٹو اونچی کر دی۔ خالوجان نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

”پچ پچ بتا تو کون ہے؟“

لڑکے نے ادب سے کہا:

”پیر جی! میں عبدالرحمان جن ہوں اور کابل سے آپ سے قرآن شریف پڑھنے آیا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔ مجھے معاف کر دیں اور قرآن شریف مزید پڑھائیں۔“

خالوجان نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ بھرا اور کہا۔

”بیٹے عبدالرحمن! ہم تمہیں پورا قرآن پڑھائیں گے لیکن فلا دو چار قندھاری اٹار تو کابل سے لاؤ۔“

عبدالرحمن جن نے ہاتھ جیب میں ڈال کر چار قندھاری اٹار باکی باکی نکالے اور خالوجان کو پیش کئے۔

”سمحان اللہ! بس میاں جیوں دو چار قندھاری اٹار روز لا کر کھلا دیا کرو۔“

خالوجان نے کہیں ایک محفل میں یہ کہہ دیا کہ کابل کا عبدالرحمن نامی مسلمان جن ان سے قرآن شریف پڑھتا ہے ایک آدمی نے مذاق اڑتے ہوئے کہا کہ وہ کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ سب باتیں جھوٹ ہوتی ہیں۔ دوسرے روز صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ آدمی مسجد کے کنوئیں میں بٹے کے ساتھ اٹاٹا ہوا ہے، وہ دبائی دے رہا تھا کہ مجھے عبدالرحمن سے بچاؤ۔ میں اب کبھی مذاق نہیں اڑاؤں گا۔ خالوجان نے عبدالرحمان سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ کام اسی نے کیا ہے اس کے بعد عبدالرحمن جن صرف رات کے وقت خالوجان سے قرآن پڑھنے آتا تھا۔ جب پورا قرآن ختم ہو گیا تو وہ غائب ہو گیا۔ خالوجان کہا کرتے تھے کہ عبدالرحمان جن جاتے وقت انہیں سونا بنانے کا نسخہ بتا گیا تھا لیکن ہم نے کبھی خالوجان کے ہاتھوں سونا بننے نہیں دیکھا۔

تیز دھوپ اور گرم لومیں سکتری باغ سنان تھا ایک نوجوان مافی جیواں کی خانقاہ کی طرف چلا آ رہا تھا اس نے دیکھا سرو کے ایک درخت کے پاس سبز لیشی کپڑوں میں ملبوس ایک نہایت حسین عورت جو اہرات پہنے کھڑی ہے اتنی حسین عورت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جب وہ اس کے

قریب سے گزرا تو عورت نے پوچھا۔

”بڑی نہر کو کون سی سڑک جاتی ہے؟“

نوجوان نے دیکھا کہ عورت کی آنکھوں سے شعاں پھوٹ رہی تھیں اور اس کا جسم گویا شیشے کا تھا اور نظر جسم سے اکر پار جا رہی تھی۔ وہ ڈر گیا اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پہلوں میں بارغ میں چڑھیں شہزادیوں کا روپ دھار کر ملتی ہیں۔ وہ بھاگنے لگا تو اس کے پاؤں گویا پتھر بن گئے۔ حسین عورت نے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس حسین چڑیل نے نوجوان کا ہاتھ تھاما اور اسے ساتھ لے کر بڑی نہر والے پل کی طرف روانہ ہو گئی اس کے چمنے سے چمن چمن کر آواز پیدا ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ نوجوان دکھائی نہیں دیا۔ کتنی رومانٹک تھیں امرتسر کی چڑیلیں بھی! اب تو نہ سرو کے درخت ہیں اور نہ بڑی نہر کو جانے والی سڑکیں ہیں اور نہ وہ رومانٹک چڑیلیں ہیں جو حسین شہزادیوں کا روپ دھار کر ملتی تھیں اور باتہ تمام کر اپنے ساتھ لے جا کر گم کر دیا کرتی تھیں۔ اب تو ہر سڑک کسی دفتر یا کسی کارخانے کو جاتی ہے اور ایک کارخانے سے نکل کر دوسرے کارخانے کی طرف چل پڑتی ہے۔ سرو کے درخت کارخانوں کے کیمیکلز کے نسوری دھوئیں سے مر جھا گئے ہیں اور نہروں میں کارخانوں کا تیل مل گیا ہے۔ قرآن شریف پڑھنے والے جن شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور چڑیلیں ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں سو رہی ہیں۔

جی میں آتا ہے کہ کسی جھلستی لو والی گرم دھوپ میں امتاس کے زرد بھول لے کر چڑیل کی تلاش میں نکلے اور جب وہ کسی سرو کے درخت سے حسین شہزادیوں کے ریشمی سبز لباس میں کھڑی خج سے بڑی نہر کا راستہ پوچھے تو میں اس کی طرف بڑھوں، اس کا ہاتھ تھاموں اور اسے ساتھ لے کر الیا جاؤں کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں۔

نور بھی ہائی جیک نہیں ہوتا

مولوی حسن اپنے چیل منڈی والے مکان کی میٹھک میں انگلیٹھی پر نیلی کیتلی رکھے پائے اُبال رہا تھا کہ ہم کا دھماکہ ہوا۔ برج پھولا سنگھ کے اکالی سکھوں نے دروازہ مہاں سنگھ پر حملہ کر دیا تھا۔ مولوی حسن ہائی لے کر دروازے کی طرف بھاگا۔ رزاق رفوگر چارپائی کی پٹی لے کر اٹھ دوڑا چوٹی بد معاش کے ہاتھ میں سر یا تھا۔ رفیق گاڈی خالی ہاتھ اکالیوں کی کرپاؤں اور انفلوں کا مقابلہ کرنے جا رہا تھا میں اس زمانے کی نیگر جنریشن تھا۔ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میرے اور ان لوگوں کے درمیان کوئی جینریشن گیپ نہیں تھا۔ جہاں مولوی حسن کے قدم اٹھتے تھے وہاں میرے قدم پڑتے تھے۔ جینریشن گیپ وہاں نمودار ہوتا ہے جہاں نہ پرانی نسل کا ہو اور نہ نئی نسل کا ہو۔ لیکن مارچ ۱۹۴۷ء

کی اس دوپہر کو ہمارے سامنے زندگی کا مقصد موجود تھا۔ پرانی نسل کے سامنے بھی اور نئی نسل کے سامنے بھی۔ اور یہ مقصد تھا پاکستان۔ ایک ایسی جنت جہاں ہیں مہندو زمین پر بٹھا کر جانوروں کی طرح پانی نہیں پلائے گا۔ جہاں وہ ہولی کے تہوار پر نیم غریاں ہو کر فحش گیت گاتا، رقص کرتا۔ ہمارے گلی محلوں سے نہیں گزرے گا اور ہمارے تعزیوں پر گندگی نہیں پھینکے گا اور خود روپوں سے بھری ہوئی تجویزوں کے آگے گاؤں تکیوں پر بیٹھ کر مسلمان نوکروں سے چلیں نہیں بھروائے گا اور جہاں ہماری مسجدوں کی اذانیں ہندو سکھوں کی براتوں کے بیٹڑ کے شور میں گم نہیں ہوں گی اور جہاں کوئی شدمی اور سنگٹن کی تحریک نہیں چلائی جا سکے گی اور جہاں ایک خدا، ایک رسول، ایک قرآن کو ماننے والے اپنے دینی تقاضوں کے مطابق آزادی عزت و نفس اور امن و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔ یہ ہمارا مقصد حیات تھا یہ ہماری منزل تھی اور یہ ہمارے سفر نور کا آغاز تھا جینریشن گیپ کا لفظ ہمارے لئے لغت غریب تھا اور پھر کیا ہوا؟ مولوی حسن شہید ہو گیا۔ رفیق گاڈی کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ رزاق رفوگر

آنکھوں میں بندوق کے چہرے کھا کر گر پڑا۔ چوٹی بد معاش نے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتا برج
 پھولا سنگھ کی دیوار پھلانگ کر کالی سکھوں کے اوپر جاگرا اور پھر واپس نہ آیا۔ مولوی حسن رفیق گاڈی، رزاق رٹوگر
 اور چوٹی بد معاش مشرقی پنجاب کے ہر شہر ہر گاؤں ہر گلی میں تھے۔ وہ زخمی ہوئے شہید ہوئے لیکن نور
 کا سفر جاری رہا۔ جالندھر سے قافلے چلے، سویشیار پور، گورداسپور، روہتک، پانی پت، سونی پت
 انبالہ، لدھیانہ اور پٹھانکوٹ سے نور کے مسافروں کے قافلے چلے اور ایک سنگ میل سے دوسرے
 سنگ میل تک اپنے جگر کے ٹکڑوں کی لاشیں ڈالتے آگے بڑھتے رہے۔ دلی سے مہاجرین کی بھری
 ہوئی ٹرینیں چلیں جالندھر، فیروز پور سے ریشی روانہ ہوئیں اور لاہور ریلوے سٹیشن پر ان خن سے بھری ہوئی
 ریلوں سے نور کے مسافروں کی کٹی ہوئی لاشیں باہر نکالی گئیں۔ لاکھوں زندہ لاشیں اغواء کر لی گئیں ان لاشوں
 کے بھائی ان لاشوں کے خاوند اور ان لاشوں کے باپ مہاجرین کیسوں اور بازیاختہ خواتین کے کیسوں کی خاک
 اڑاتے مر گئے۔ ایک نور کے مسافر نے واگہ باڈر پر پاکستان کا لہرتا جھنڈا دیکھ کر کھڑے پڑھا اور ہان پاک
 سرزمین پر نچا اور کر دی۔ دوسرے نے لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے آدھے کتے جوئے
 سینے پر ہاتھ رکھ کر پاکستان کے نیلے چمکے نورانی آسمان کو دیکھا اور شہید ہو گیا۔ کوئی راستے میں گرا اور پھر
 نہ اٹھ سکا۔ کوئی منزل نور پر قدم توڑ گیا۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی نہ گھر نہ ہار نہ آسمان۔ سب کچھ خون کی لال
 آندھی میں گم ہو گیا شعلوں میں جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر نور کی پہلی سیر طرعی مل گئی۔

اندلس میں ڈوبا ہوا آفتاب پاکستان کے افق سے طلوع ہو گیا۔ بادِ سحر میں افان کی آواز گونج
 اٹھی۔ مسجدوں اور گھروں کی فضائیں درود و سلام اور تلاوت کلام پاک سے معمور ہو گئیں۔ معرکہ بدر کے
 بعد حق اور باطل کے درمیان کیر کچھ گئی۔ رات بھی بہت اندھیری تھی۔ دن بھی بہت روشن نہکل آیا۔ جتنی
 عظیم قربانی تھی۔ اتنا ہی عظیم انعام ملا۔ شرف ملا۔ عزت نفس ملی۔ اپنے دین کی راہ پر چلنے کا حق حاصل
 ہوا۔ بحرِ طلمات سے نکل کر نور کی منزل کا سفر شروع ہوا۔ اس سفر میں خود غرضی، حسد، منافقت اور خویش
 پروری کی آندھیاں بھی چلیں مگر نور کا چراغ روشن رہا۔ نور کا سفر جاری رہا۔ اس لئے کہ نور کے چراغ میں
 شہیدوں کے خون کا روشن تھا۔ یہ صدقہ جاریہ تھا اور اس نور میں کاسر چشمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور
 مکمل تھا اور خدا کا نور علی نور تھا۔ اس نشاۃ الثانیہ کے نورانی سفر کی تیس منزلیں گزر گئیں۔ ایک نئی نسل
 جو ان ہو کر سامنے آگئی۔ ہم ہر منزل پر اپنے صیحوں پر سونے چاندی کے قول چڑھانے لگے رہے

اور نئی نسل ریگڑ کی جیسز پہن کر ڈونا سمر اور اینڈی گب کے پاپ میوزک کی تیز لے پر تھرکتی ہمارے سامنے
 آگئی۔ ہمارے مسئلہ یہ رہا کہ کوٹھی کارینک پلیس کہاں سے آئے۔ اور نئی نسل کا مسکہ یہ تھا کہ ساٹھ میل کی
 رفتار پر سکو ترے کر لبرٹی میں کس لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر سو روپے کا چائینر پنچ کھایا جائے ہم نئی نسل سے
 نفرت کرنے لگے۔ نئی نسل ہم سے نفرت کرنے لگی۔ ہم نے انہیں یہ سکھایا کہ انسان کی عزت کار، کوٹھی
 عہدے اور دولت سے ہوتی ہے۔ اقبال کی خودی کو ہم نے سونے کی ڈوری سے باندھ کر اپنی سرسید پر کار
 کے پچھلے شیشے پر لٹکا دیا نئی نسل سوالیہ نشان بن کر کبھی کبھی ہماری طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے کہ ہم نے
 انہیں کیا دیا؟ پاکستان کیوں بنا تھا؟ لوگ شہید کیوں ہوئے تھے؟ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی کوٹھی
 ہوئی ریل گاڑیاں کیوں آتی تھیں؟ اور ہم نئی نسل کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ رکھ کر اسے لبرٹی کی طرف
 کڑا ہی گوشت کھانے بھیج دیتے ہیں۔ ہم نے انہیں کبھی یہ نہیں کہا کہ واگہ باڈر پر بی آر بی نہر کے کنارے
 بھی ایک لبرٹی ہے۔ فریڈم ہے آزادی وطن کے پر نور مینار ہیں جہاں عزیز بھٹی شہید اور سوار محمد حسین
 شہید ہماری نشاۃ الثانیہ کی منزل کی تاریکیوں کو اپنے خون رنگ آجالوں سے منور کر رہے ہیں۔ ہماری بیکتاری
 یہ چشم پوشی یہ تن آسانی ہیں ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن ہمارے اجداد کی قربانیاں اتنی عظیم
 ہیں کہ ہماری کشتی ہر طوفان سے صحیح و سلامت نکل آتی ہے۔ زہر اگر ہلاکت خیز ہے تو تریاق اس
 سے زیادہ زندگی بخش ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری نئی نسل بے راہ نہیں۔ بے ذوق نہیں
 وہ جانتا چاہتی ہے۔ سمجھنا چاہتی ہے۔ ہمارے قدم سے قدم ملا کر منزل نور کی طرف بڑھنا چاہتی
 ہے۔ وہ ہم سے سوال کرتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے کتاب اسباب بغاوت ہند کیوں لکھی تھی۔ اور
 علامہ اقبال نے الہ آباد میں ایک الگ اسلامی مملکت کا تصور کیوں پیش کیا تھا۔ اور قائد اعظم نے کیوں
 کہا تھا کہ ہم ایک علیحدہ اسلامی ملک چاہتے ہیں؟ ہم ان سوالوں کا حجاب دینے کی بجائے نئی نسل کو
 اینڈی گب کے پاپ میوزک کی نئی کیسٹ دے کر لبرٹی کی طرف سکوٹر پر روانہ کر دیتے ہیں۔ لیکن
 اب ہیں ایسا نہیں کرنا ہوگا۔ ہمیں چکیلی کاروں کے ریس کورس سے باہر نکل کر نئی نسل کا ہاتھ تمام کراست
 بتانا ہوگا کہ سرسید کون تھا۔ چودھری رحمت علی کون تھا۔ سید احمد شہید کیوں شہید ہوئے۔ گاندھی
 جی اور پٹیل نے کیوں کہا تھا کہ قائد اعظم فریبے نہیں جاسکتے۔ علامہ اقبال کے الہ آباد والے خطبے کا
 متن کیا تھا۔ اور عزیز بھٹی شہید بی آر بی کے کنارے تیر و دن بغیر کچھ کھائے پیئے کیوں اپنے مورچے

میں ڈنارہ اور سوار محمد حسین شہید المومنین کا کبس لئے برستی گولیوں میں کیوں نکل پڑا تھا اور مینار پاکستان چاندنی راتوں میں فضا نے بیٹھ کی رفتوں میں کن روشن ستاروں سے باتیں کرتا ہے! یہیں انہیں بتانا ہو گا کہ لاہور شہر کے سبھی راستے میوزک کی دکانوں سپر مارکیٹوں اور پلازوں کی طرف نہیں جاتے۔ ایک راستہ علامہ اقبال کے مزار کو اور ۶۵ کی جنگ کے شہیدوں کی یادگاروں اور مینار پاکستان کو بھی جاتا ہے۔ یہ تہی نسل کا ہم پر قرض ہے۔ جو ہمیں ادا کرنا ہے۔ اگر ہم نے یہ قرض، یہ قرض ادا نہ کیا تو پاکستان تو سلامت رہے گا۔ لیکن آنے والی نسلیں ہمارے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

میں پھولوں درختوں گرتے ہوں اور وطن پاک کی نرم خیز صبحوں اور سنہری چائے کی خوشبوؤں کا افانہ نگاہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سارے پھول، سارے درخت اور درختوں سے گرتے پتے اور طلوع ہوتی۔ صبحوں کے اُجالے اور سنہری چائے کی خوشبوئیں پاکستان کی مٹی سے پیوستہ ہیں میرے باغوں میں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ میں پاکستان میں ہوں۔ سنہری چائے میں نہک اس لئے ہے کہ اس میں وطن پاک کی بہادری کی خوشبو شامل ہے۔ میں فقیر ہو کر بھی یہاں بادشاہ ہوں۔ کیونکہ یہاں میری عزت نفس اور میری آنے والی نسل کا مستقبل محفوظ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس سرزمین کو ہواؤں میں مولوی حسن ایسے تحریک پاکستان کے لاکھوں شہیدوں کی نہک زچی ہے اور لاکھوں ماؤں بہنوں کی ناقابل فراموش قربانیوں کے سورج اس سرزمین کے ذرے ذرے میں جگمگا رہے ہیں۔ یہ ملک اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے شہیدوں کے خون رنگ شفق سے لازوال سورجوں کی روشنیاں لے کر طلوع ہوا ہے۔ یہ زندہ رہنے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ یہیں اپنے کردار دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے سانچے میں ڈھال کرنی نسل کے لئے ایک مثال بننا ہو گا۔ اسی میں ہماری نئی نسل اور آنے والی نسل کی بقا ہے۔ پاکستان ایک طرز فکر ہے۔ ایک رویہ ہے ایک سفر ہے روحانی ارتقا کا دین مبین کے نور کا۔ اور نور کبھی بانی جیک نہیں ہوا کرتا۔

الوداع مسجد کے مینارو

گلی کے دروازے پر ہم بھٹا تو ایک کہرام مچ گیا۔ کوئی دروازہ میاں سنگھ کی طرف، کوئی لال چلی کی طرف اور کوئی الہی گوجر والی گلی کی طرف۔ جدھر جس کا منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ لوگوں نے اپنا اپنا سامان ہاندھ کر رکھا تھا کہ مسلم لیگ کے ٹرک انہیں گے تو اس میں لاؤ کر شریف پورہ کیمپ پہنچ جائیں گے۔ ٹرک آنے سے پہلے ہندو فوج آگئی۔ اور انہوں نے ہم مار کر گلی کا آہنی دروازہ اٹا دیا۔ ہماری گلی میں دوسرے محلوں کے مسلمانوں نے بھی اگر پناہ لے رکھی تھی۔ ان میں عورتیں بچے بوڑھے جوان تھے۔ ہم کا دھماکہ ہوا تو ہر کوئی سامان وہیں چھوڑ کر دوسری طرف کو بھاگا۔ گلی کی دوسری طرف سے دو تین راستے باہر جی ٹی روڈ کی طرف جاتے تھے جی ٹی روڈ سے آگے بائیں گراؤنڈ تھی اور سامنے شریف پورہ تھا۔ شریف پورے کے باہر بلوچ رجمنٹ کے جوان کیمپ کے مسلمانوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ گلی میں بھگدڑ مچی تو مسلمان بھاگ کر جی ٹی روڈ پر آ گئے۔ ایک طرف سے سکھ اور دوسری طرف سے ہندو فوج فائرنگ کر رہی تھی۔ کئی عورتیں، بچے اور جوان شہید ہو کر گرے۔ کوئی خانقاہ کی لائبریری کے باہر اور کوئی بدرو میں اور کوئی تاروں والے بارغ میں۔ ہر قسمی مسلمان شریف پورے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ شاید کسی نے بھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے کہ وہ آگے آگے ہوں گے اور پیچھے ہندو سکھ ان پر گولیاں برسا رہے ہوں گے۔ شاید ہندو سکھوں نے ایسا سوچ رکھا تھا۔ کاش مسلمان بھی کچھ سوچتے، کچھ فکر کرتے، کچھ آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھنے کی کوشش کرتے۔

جب یہ پریشان حال عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے شریف پورے کے قریب پہنچے تو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے انہیں مشین گنوں کا تحفظ دیا۔ یہاں تک جو مسلمان اپنی جانیں بچا کر

آئے تھے وہ شریف پور سے پہنچ گئے۔ شریف پور میں امرتسر شہر کے مشرقی حصے کے ہزاروں مسلمان جمع تھے۔ دکانداروں نے سارا مال باہر لاکر رکھ دیا تھا اور انہوں نے پونے بیچ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے والے ہیں۔ پتہ نہیں زندگی میں انسان کیوں ذلیل و خوار کرتا ہے۔ بلیک مارکیٹ کرتا ہے۔ چیزوں کو مہنگے سے مہنگے داموں میں فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ ایک دن یہاں سے بھی اسے کوچ کر جانا ہے۔ زندگی کا شریف پور بھی اسے کوچ کر جاتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

پچھلے ہماری گلی کے مکانوں کو لوٹ کر بند و سکون نے آگ لگا دی۔ دیکھتے دیکھتے جی ٹی روڈ پار کے ہماری گلی کے مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ دھواں آگ اور لاشیں۔ یہ ان دنوں کے معمولات میں تھا ایک عجیب نالافس سی جلی ہوئی بو تھی جس نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نہ مکانوں سے اٹھتے شعلے دیکھ کر کسی کو حیرت ہوتی تھی اور نہ سڑک پر پڑی ہوئی لاش دیکھ کر کوئی رکتا تھا۔ شہر کے درختوں پر سے چڑیا، بلیں اور فاختائیں غائب ہو گئی تھیں۔ سارا سارا دن گدھیں منڈلایا کرتی تھیں اب امرتسر سارے کا سارا خالی ہو چکا تھا۔ شریف پور سے کی دوسری جانب ریلوے لائن گزرتی تھی۔ اس لائن پر مال گاڑی کے چند ایک خالی ڈبے آگے گئے اور مسلمان مہاجرین سے دیکھتے دیکھتے بھر جاتے بلکہ ابل پڑتے اور پھر بولے بولے ریلتے ہوئے امرتسر ریلوے سٹیشن سے نکل کر لاہور کی جانب روانہ ہو جاتے ابھی پاکستان پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ راستے میں امرتسر کرائسٹن تھا جہاں سکھ تواریں لے گھوم رہے تھے۔ آگے چھ مہلے کرائسٹن تھا جہاں سکھوں کا بہت بڑا گوردوارہ تھا اور جہاں کے نہنگ اور کالی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ گاڑیاں کٹ بھی رہی تھیں۔ لاشیں ریلوے لائنوں پر بکھر بھی رہی تھیں اور پاکستان کی منزل کا سفر بھی جلدی تھا۔

شریف پور سے کے جنوب میں تحصیل پورے کی آبادی تھی۔ یہاں سے ایک کچا راستہ لوکاٹ کے باغ میں سے ہو کر اوپر ریلوے لائن پر چلا جاتا تھا۔ میں نے اس کے راستے کا ذکر اپنے امرتسر کے بد سے میں لکھے گئے افسانوں میں خاص طور پر کیا ہے اس راستے پر کھٹے کے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا اور مارچ اپریل میں جب ان درختوں پر سفید پھول کھلتے تو سارا راستہ خوشبو کی سرنگ بن جاتا تھا۔ منہ اندھیرے میں کو جاتے ہوئے میں خوشبو کی اس سرنگ میں سے بہت آہستہ آہستہ

گورا کرتا۔ یہاں کھٹے کے پھولوں کی اس قدر خوشبو ہوتی کہ سانس اندر کھینچنے کے بعد باہر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سانس کے ساتھ جسم کے رگ و پے میں خوشبو کا ایک چکر بندھ جاتا تھا۔ سانس اور خوشبو کا فرق مٹ جاتا۔ کچھ پتہ نہ چلتا کہ سانس کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور خوشبو کہاں سے ختم ہو رہی ہے۔ ان دنوں میں سوچا کرتا تھا کہ جنت کو جانے والا راستہ بھی شاید اسی طرح کا ہوگا۔ منہ اندھیرے کے نور میں درختوں کی شاخوں پر سفید پھول نسیم صبح کے جھونکوں کے ساتھ گرا کرتے اور جب میں سیر سے واپس آتا تو یہ کچا راستہ سفید پھولوں سے بھرا ہوتا جیسے درختوں نے عبادت کرنے کے لئے سفید پاکیزہ چادر بچھا رکھی ہو۔ مجھے یاد ہے اس راستے پر پاؤں لے کر نہیں جاتا تھا اور باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ آج یہ راستہ ویران تھا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کھٹے کے درختوں پر کوئی پھول نہیں تھا خوشبو کی سرنگ میں سوختہ مکانوں اور جلی ہوئی لاشوں کی بو تھی۔ شریف پور خالی ہو رہا تھا مسلمان ٹرینوں میں بھر بھر کر پاکستان کی طرف کوچ کر رہے تھے راستے میں ان پر حملے بھی ہو رہے تھے مگر پاکستان کی طرف مہاجرین کا سفر جاری تھا۔ شریف پور کے سامنے لائن پار امرودوں کے بڑے وسیع اور ہرے بھرے باغ تھے۔ بڑے میٹھے اور گورے گورے امرود لگا کرتے تھے ان درختوں پر اور بڑے ظالم راکھے ان درختوں کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ اب یہ باغ بھی ویران تھے۔ امرود پک پک کر درختوں سے گر رہے تھے جگہ جگہ امرودوں کے ڈھیر لگے تھے کوئی راکھا نہیں تھا، کوئی مالک نہیں تھا کوئی نوکر نہیں تھا۔ امرودوں کے ڈھیر تھے جو گل سڑ رہے تھے مگر پھر بھی ان میں سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل رہی تھی۔ پھل مر کر بھی خوشبو دیتا ہے اور انسان زندگی میں بھی کوئی خوشبو دیتا ہے انسان کے اندر کا امرود شاید مر گیا ہے۔

آخر ہم بھی ایک مال گاڑی میں بیٹھ کر شریف پور سے، امرتسر سے، کپنی باغ اور مسجد خیر الدین کے امرتسر سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر چار پر اگر گاڑی رگ گئی ایک دہشت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان سٹیشن کی چھت پر لیٹے سیلا مندر کی طرف سے آنے والی ہندوؤں کی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ جب تک گاڑی امرتسر کے سٹیشن پر کھڑی رہی لوگوں کا دم خشک رہا۔ خدا خدا کر کے ٹرین نے بولے بولے کھسکا شروع کیا۔ ریلوے یارڈ گزرا، ایگوبرج گزرا گیا۔ امرتسر شہر پر نگاہ ڈالی۔ ایک غبار سا دکھائی دیا۔

خاک آلود، دیران دیران، جس میں آگ اور موت کی دہشت تھی، جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چہرے ہرٹریوے سٹیشن پر پھر گاڑی کھڑی ہو گئی۔ بوجہ رجمنٹ کے جوان ڈبلوں سے اتر کر پہرہ دینے لگے۔ سکھ دور کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور تمواریں لہرا رہے تھے مگر کسی کو گے آنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی آگے روانہ ہوئی۔ خاصہ سٹیشن بھی گزر گیا پھر گوروسہ ستانی بھی گزر گیا۔ اردگرد مسلمانوں کے بڑے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ یہ دیران پڑے تھے، اور مسجدوں کے سفید مینار خاموش تھے ہنسنا تھے۔ دل گرفتہ تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب ان میناروں سے کبھی اذان کی صدا بلند نہ ہوگی، پھر ٹاری بھی گزر گیا اور گاڑی واپس پلٹ گئی۔

یہاں پہلی بار ایک درخت کے ساتھ لہراتا ہوا پاکستانی سبز پرچم دیکھ کر چہرے کھل گئے۔ مسلمانوں نے فلک شکاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ منزل پر پہنچ کر راستے کی ساری مصیبتیں، تکلیفیں اور اذیتیں بھول گئیں۔ ٹرین اب پاکستان کی آزاد اور خوبصورت فضاؤں میں سفر کر رہی تھی دور مغلیہ ورکشاپ کی بلند چمنی نظر آئی۔ مغلیہ پرٹرین رکی تو مسلمان روٹیاں، پانی اور اچار لے کر ٹرین کی طرف دوڑے، زخمیوں کو اتار کر ان کی مرہم پٹی کی گئی۔

لاہور ریلوے سٹیشن پر ہر طرف ہجوم ہی ہجوم تھا۔ ٹرین رکی تو مسلم لیگ کے رضا کار پانی، روٹیاں اور اچار لے کر تقسیم کرنے لگے۔ وہ ہر ایک سے پوچھ رہے تھے کہ کون والٹن کیمپ جائیں گے اور کون لاہور اپنے رشتہ داروں کے ہاں جاتا پسند کریں گے۔ سٹیشن سے باہر چھ سات مہاجر کیمپ لگے تھے جہاں سے مہاجرین کو بسوں اور ٹرکوں میں بٹھا کر والٹن یا ان کے رشتہ دار کے ہاں پہنچایا جارہا تھا۔ ریلوے سٹیشن کی عمارت میں بار بار پاکستان زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے فیروز پور سے مسلمانوں کی کئی کئی گاڑیاں بھی آرہی تھیں لیکن ہر مہاجر کے سینے میں ایک نئے عزم ایک نئے ولولے کی شمع بھی روشن تھی، نیا وطن اور درو دیوار سامنے تھے۔ اس نئے وطن کے آئینے کو بھولوں سے سبانا تھا۔ ہر گھر میں نئی آرزوں کی نئی شمع روشن کرنی تھی جسم گرواؤد تھے، پاؤں میں آبلے تھے، زخموں سے خون بہہ رہا تھا مگر دل میں ایک دولہہ تازہ تھا، تعمیر وطن تھا، اک احساس عظیم تھا تحفظ عزت و اکبر و کا۔

امرتسر کی آخری بھٹک

امرتسر میں ایک دروازہ مہان سنگھ تھا۔ اسی دروازے سے ایک چھوٹی سڑک تحصیل پورے کو جاتی تھی اس سڑک پر ٹاٹلیوں کی گھنی چھاؤں تھی اس کی ایک جانب آرٹ سکول تھا جہاں میں دوسری سے چوتھی جماعت تک پڑھا تھا۔ دوسری جانب مستندی امراض کا چھوٹا سا ڈسپنسری ٹائپ کامیونٹی ہسپتال تھا ٹاٹلیوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی کچی سڑک آگے جی ٹی روڈ کو کراس کرتی ہوئی تحصیل پورے کے مختصر سے میدان میں اتر جاتی تھی اس میدان میں ایک جانب کچا کوٹھا تھا جس کی چار دیواری کے اندر سواری رنگ کے بڑے بیروں والا ایک گھنا دھشت تھا ہم اس درخت پر پتھر مار کر بیر جھاڑتے تو اندر سے ایک بوڑھی عورت سوٹائے کر ہمیں مارنے نکلا کرتی تھی اس کے بالمقابل تحصیل کا دفتر تھا جو کسی پرانے قلعے کی یاد دلاتا تھا۔ یہاں سے آگے تحصیل پورے کی آبادی کا جنوبی کنارہ شروع ہو جاتا تحصیل پورہ اصل میں شریف پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسر مسلمانوں پر مشتمل تھا مگر تحصیل پورے کا ایک حصہ تھا۔ یہ ساری آبادی امرتسر مسلمانوں پر مشتمل تھی مگر تحصیل پورے کی جنوبی پٹی میں کچھ ہندو اور سکھ آباد تھے۔ ان کی دو تین گلیاں ہی تھیں۔ ایک چھتا ہوا کنواں بھی تھا میں صبح صبح چالیس کھوہ اور ریلوے لائن کی طرف سیر کرنے کو جاتا تو اس کنوئیں پر ہندو اور سکھ نہا رہے ہوتے تھے۔ دوسری طرف ہندو سکھ عورتیں کانسی کے گھڑوں میں پانی بھر رہی ہوتیں جہاں تحصیل پورے کی آبادی ختم ہوتی وہاں سے لکاٹ اور آکوپے کے بارغ شروع ہو جاتے۔ ان باغوں کے درمیان سے ایک کچی پگ ڈنڈی ریلوے لائن تک جاتی تھی۔ اس پگ ڈنڈی کی دونوں جانب کھٹے کے درخت تھے جو اوپر جا کر آپس میں مل گئے تھے بہار کے دنوں میں ان پر سفید کلیاں کھلتیں تو سارا راستہ خوشبو سے منک جاتا تھا۔ اسی تحصیل پورے میں میرا ایک دوست رہتا تھا مانو رنگ

دو یا دو قدموں پر موٹے شیشوں کی عینک پیچھے کوگرے ہوئے سیدھے بال ہم دونوں کبھی کبھی اپنی بارغ میر کرنے جاتے تو وہ مجھے اپنی اردو کی نظلیں سنایا کرتا تھا میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اس کی نظموں میں عربی فارسی کے بے شمار لفظ ہوتے تھے وہ مجھے ان الفاظ کے معنی بھی سمجھایا کرتا اس نے عربی فارسی کچھ کے حوالے سے اسلامی رنگ غالب تھا۔ مسلمانوں کے کھانے شوق سے کھاتا اور لباس بھی ہندو نہیں پہنتا تھا۔ پتلون قمیض اور شور قمیض اسے بہت پسند تھی اب مجھے اس کی باتیں یاد آرہی ہیں وہ سگریٹ بہت پیتا تھا مجھے یاد ہے ایک روز شام کے وقت ہم کپنی بارغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والے پلاٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ ویدک عہد پر باتیں کر رہا تھا کہنے لگا۔

”اے ہندو نہیں تھے۔ یہ ہندو تو برہمن دور کے بعد کی پیداوار ہیں میں بھی ہندو ہوں کیرنگ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں مگر مجھ میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں۔ جو تم ہر ہندو میں پاؤ گے۔ ہندو دہریہ بھی ہو جائے تب بھی ہندو ہی رہے گا میرے پتا جی کہتے ہیں رام مورتی! مسلمانوں کے ساتھ مت بیٹھا کرو مگر میں کہتا ہوں کہ ہندوؤں میں میرا دم گھٹتا ہے تم مسلمان ہو تمہارا کچھ ہندوؤں سے امتیاز مختلف ہے کہ تم لوگ ان کے ساتھ ایک جگہ دو دن بھی نہیں گزار سکتے۔ اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو میں نہیں ایک نظم سناتا ہوں۔“

جب امرتسر میں تحریک پاکستان کا آغاز ہوا اور جلوس نکلتے لگے تو ایک روز رام مورتی طائر نے کہا۔

”یہ ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا تم دیکھتے نہیں ہمارے امرتسر میں کتنے پاکستان بنے ہوئے ہیں۔ شریف پورہ بھی ایک پاکستان ہے جہاں کے امرتسر مسلمان اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں چوک فرید بھی ایک پاکستان ہے اسی طرح کرناہ کرم سنگھ کا ایک حصہ بھی ایک پاکستان ہے۔ یہ حصہ ہندو اور سکھوں سے لگ بھگ ہے پاکستان اس ملک کے سیاسی اور تہذیبی ارتقاء کا ایک قدرتی نتیجہ ہے تم دیکھ لینا پاکستان بن جائے گا۔“

پھر امرتسر میں تحریک پاکستان کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا گیا قائد اعظم کی خلعانہ اور بے لوث قیادت میں مسلمان اپنی جدوجہد آزادی میں کامیاب ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا مجھے یاد ہے جس رات آل انڈیا ریڈیو سے قائد اعظم نے تشکیل پاکستان کے اعلان کے بارے میں تقریر کی میں پٹھان کوٹ

میں تھا۔ وہاں میں اصفہانی چائے کپنی میں سلیز میں کی حیثیت سے ملازم تھا ایک چائے خانے کے ریڈیو پر میں نے قائد اعظم کی تقریر سنی۔ پٹھان کوٹ کے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا پاکستان زندہ باد قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے جلوس گزرتے مجھے پٹھان کوٹ کی سڑکوں کے نام یاد نہیں رہے میں زیادہ دیر وہاں رہا بھی نہیں۔ ایک نشیبی آبادی تھی جہاں مکانوں کے آنگن تھے اور ان میں سفیدے اور چیرمھ کے درخت ہوا میں جھومکرتے تھے۔ پیچھے دور ڈلیوز کی پہاڑیوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی تھی مجھے سیاسی شعور بھی نہیں تھا۔ اسی لئے میں جسے جلوسوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا رام مورتی طائر کہتا تھا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے امام پیر جی بھی یہی کہتے تھے کہ پاکستان مزدبے لگا جہاں مسلمانوں دینی آزادی کے اسلامی ماحول میں زندگی بسر کریں گے۔ مجھے یاد ہے ایک بار رام مورتی طائر نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا تم کبھی جنگ اور پنجاب کے دیہاتوں میں گئے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں تو وہ بولا۔ ”پھر تمہیں کیا پتہ کہ جب پاکستان بن جائے گا تو ہندو ساہوکار کی زنجیریں کسی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ پھر وہ سگریٹ کا کش لگا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔“

پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی مارچ ۱۹۴۷ء کی دوسری یا تیسری تاریخ تھی کہ امرتسر شہر میں پہلا کرفیو لگا دیا گیا امرتسر ہمارا اپنا شہر تھا کرفیو کے دوران تو ہم گلی میں بند رہتے۔ جونہی کرفیو کھلتا ہم ہندو سکھوں کے محلوں میں بھی آوارہ گردی کرنے نکل جاتے ایک روز میں تحصیل پورے کی طرف گیا تو دیکھا کہ اس آبادی میں جو چند ایک سکھوں کے گھر تھے وہ خالی ہو چکے تھے رام مورتی طائر کا مکان بھی لٹ لٹا کر خالی پڑا تھا۔ فسادات کی آگ تشدد اختیار کرتی چلی گئی ہمارے اپنے محلے میں جو چند ایک ہندو سکھوں کے مکان تھے وہ بھی خالی ہو گئے ہندو سکھ شہر کے اندر غیر مسلم محلوں میں چلے گئے کبھی کبھی کرفیو کھلتا تو کوئی نہ کوئی ہندو یا سکھ پولیس کی معیت میں اپنا مکان دیکھنے یا وہاں سے کوئی شے اٹھانے ضرور آتا مگر رام مورتی طائر نہ آیا۔

اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا امرتسر میں چاروں طرف آگ لگی تھی شہر ہندو اور مسلم آبادی میں بٹ کر رہ گیا تھا دیہات اور پنجاب کے دوسرے شہر سے مسلم ہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ ایک الگ انتہائی دور داستان ہے بہر حال اتفاق سے گیارہ اگست کو میں ہوڑہ ایکسپریس میں بیٹھ کر امرتسر

سے لاہور آگیا امرتسر کے درمیان ریل گاڑیاں ابھی تک چل رہی تھیں کشیدگی اگرچہ بہت زیادہ تھی مگر امرتسر کے مسلمانوں کی جرأت دلیری اور جاننازی ہندوؤں کو ان کے محلوں کی طرف ایک انچ بھی بڑھنے نہیں دے رہی تھی۔ یہ اسی بے خوفی کا ثبوت تھا کہ میں گیارہ اگست کو ہونڈہ ایکسپریس میں سوار ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

چھوڑا ٹیٹھن پر ہندو سکھ دور جنگ کے باہر کھڑے تواریں لہرا لہرا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ لاہور پہنچا تو یہاں جو ہمارے رشتے دار تھے وہ فجر پر برس پڑے کہ تم کیا سوچ کر امرتسر میں بیٹھے ہو؟ کیا تم سب کا دماغ مرنے کا ارادہ ہے؟ فوراً واپس جاؤ اور ان سب کو لے کر لاہور آ جاؤ۔ میں نے دوسرے دن صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ والی گاڑی پکڑی اور واپس امرتسر پہنچ گیا ریوے ٹیٹھن پر مسلمان عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم دیکھا جو پلیٹ فارموں پر پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ شہر میں ساڑھے دس بجے سے کر فیو گئے والا ہے اس وقت دس بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے مجھے ریوے ٹیٹھن پر شیخ قیوم مل گیا اس کا مکان مال بازار کے پہلو میں ایک گلی میں واقع تھا اس نے کہا ابھی کر فیو گئے میں پانچ منٹ میں چلو نکل چلتے ہیں ہمارے محلے کے بودی نے کہا خبردار ٹیٹھن سے باہر نہ نکلنا گورکھا اور ہندو جاٹ رجمنٹ کے فوجی پھر رہے ہیں وہ دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ مگر نوجوانی کا خون تھا۔ ہم نے کوئی پروا نہ کی اور ریوے یارڈ کی گول باغ والی دیوار چاند کر سڑک پر آ گئے پانچ منٹ پہلے ہی بازار سنان ہو گئے تھے ایک جگہ ہندو فوجی گشت کرتے نظر آئے ہم نے کوئی پروا نہ کی اور سکندر گیٹ کی طرف چلنے لگے ایک مکان کی کھڑکی میں سے ایک شخص نے سر باہر نکال کر اوپر سے کہا۔

”اے منڈیو! مرنا ہے؟ کر فیو لگن والا اسے اندر آ جاؤ۔“

ہم نے دوڑنا شروع کر دیا شیخ قیوم کا مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ہم دوڑتے دوڑتے اس کی گلی میں داخل ہو گئے اس کے ساتھ ہی کر فیو کا بھونپوچھ اٹھا۔ شیخ قیوم کا مکان تین منزلہ تھا اور کافی کشادہ تھا وہاں دیکھا کہ عورتوں بچوں اور مردوں سے بھرا پڑا ہے پیچھے جو ہندو آبادی تھی وہاں سے مسلمان اپنی جانیں بچا کر اس مکان میں آ گئے تھے ان میں زنانہ چہرے والے ایک سرخ و سپید آدمی بھی تھے جن کے سر پر ترکی ٹوپی تھی وہ سخت خوف زدہ تھے اور بار بار شیخ قیوم سے

کہتے۔

”قیوم پتر خجے کسی طرح ٹیٹھن پر پہنچا دے۔“

کر فیو کے گتے ہی پیچھے جو ہندوؤں کے محلے تھے ادھر سے فائرنگ شروع ہو گئی شام تک یہ فائرنگ ہوتی رہی ہمارا محلہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ میں اور قیوم چھوٹی سی شہر تھیں میں درسی پر بیٹھ گئے دوپہر کو دال روٹی کھانی رات کے نو بجے ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے کہ ایک دم بجلی چلی گئی مکان میں عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا مرد انہیں حوصلہ دینے لگے ہم نے کوٹھے پر جا کر دیکھا سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں ہمارے محلے کی جانب کسی مکان میں آگ لگی ہوئی تھی جس کے شعلے اوپر اٹھ رہے تھے۔ شیخ قیوم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”حمید امیر خیال ہے گلی انگریزوں کا کوئی مکان جل رہا ہے۔ باغ راماندر کے ہندوؤں نے یہاں آگ لگائی ہوگی۔“

مجھے اپنے گھر والوں کی فکر پڑ گئی۔ مگر وہاں تو سر کوئی پریشان تھا خدا کر کے رات گزری میری باغ اور بازار بکرواناں کے سارے مسلمان گھرانے گھر بار چھوڑ کر تھوڑا بہت سامان سروں پر اٹھا ہماری گلی میں آ گئے تھے گلی میں گزرنے کو جگہ نہیں تھی میں لوگوں کے ٹرنکوں اور بستروں کے اوپر سے گزرتا اپنے گھر پہنچا انہیں کہا کہ جس طرح ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔ کوئی بھی امرتسر چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ صرف والدہ لڑکیوں کو لے کر چلنے پر تیار ہو گئیں ایک بھائی انہیں لے کر ریوے ٹیٹھن کی طرف روانہ ہو گیا ہم باقی بھائی والد صاحب اور دوسرے رشتے داروں کے ساتھ مکان پر ہی رہے ان سب کا ابھی تک یہی خیال تھا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں گلی میں اپنے محلے کے دوستوں کے پاس آ گیا ابھی تک ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں آدمی لاطیلیاں بلیں لئے پھر رہے تھے گلی کے دروازے پر لوہے کا جگلا چڑھا ہوا تھا جو اندر سے بند تھا وہاں محلے کا جاناں بد معاش بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا کر فیو کھلے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا ہو گا کہ شہر میں واردات شروع ہو گئی اس کے فوراً بعد دوبارہ کر فیو لگا دیا گیا ساتھ واسے محلوں سے جھپٹوں کچھ مسلمانوں کی لاشیں لگی ہیں آئیں تو وہاں کہرام مچ گیا۔ گلی انگریزوں اور بازار بکرواناں کے مسلمان علاقے میں باغ راماندر کے ہندوؤں کا قبضہ ہو چکا تھا انہوں نے مکان کو لوٹ کر آگ لگا دی

تھی۔ گلی انگریزوں کی مسجد میں کئی مسلمان شہید ہو گئے۔

اسر تیر کی وہ رات بڑی خوف ناک رات تھی ساری رات تھری ناٹ تھری کی گولیوں کے دھماگے ہوتے رہے ان میں بم پھٹنے کے دھماکے بھی شامل تھے اسی رات ہماری مسجد کے اہم پیر جی کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز ۱۴ اگست کا دن تھا صبح ہوئی کر فیونہ کھلا مگر ہندو سکھوں نے ہندو سکھ فوج کو ساتھ لے کر ہماری گلی پر بازار والے دروازے کی طرف سے حملہ کر دیا۔ گلی میں بھگدڑ مچ گئی فوج کا مقابلہ نیم نہتے مسلمان کہاں کر سکتے تھے لوگ اپنا اسباب و بیابان گلی کی دوسری جانب لال حویلی اور گجروں کے دیڑھے کی طرف بھاگے ہندو فوج نے ہینڈ گرنیڈ مار کر گلی کا دروازہ اڑوایا اتنی دیر میں مسلمان گلی سے بھاگ کر لال حویلی اور گجروں کے دیڑھے سے ہوتے ہوئے باہر جی ٹی روڈ کے بد رو پر پہنچ چکے تھے اور بھی ہندو فوج گشت لگا رہی تھی اس نے بھاگتے مسلمانوں پر فائرنگ شروع کر دی موسیٰ اپنے شیر خوار بچے کو گود میں اٹھا لے کر شریف پور سے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ گولی لگنے سے وہیں شہید ہو گیا۔ بہت سے مسلمان بچے عورتیں اور مرد شہید ہو کر گرے باقی پاتھی گراؤنڈ والی سڑک پار کر کے شریف پور سے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پور سے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شریف پور سے کو مسلم مہاجرین کمیپ قرار دیا گیا تھا۔ وہاں بلوچ رجمنٹ مسلمان مہاجرین کی حفاظت پر مامور تھی بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے فائرنگ کا کر دیا اور سینکڑوں مسلمان عورتیں اور مرد ہندو فائرنگ سے بچ گئے بلوچ رجمنٹ کی فائرنگ سے ہندو فوجی پاتھی گراؤنڈ سے بھاگ گئے تھے۔

شریف پور سے نے باقاعدہ مہاجر کمیپ کی شکل اختیار کر لی تھی شریف پور سے میں جو مسلمان آباد تھے انہوں نے اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے لاہور سے مسلم لیگ کے ٹرک آنا شروع ہو گئے جی ٹی روڈ کی جانب سے مسلم لیگ کے سڑکوں کے ذریعے اور ریوے لائن کی طرف سے قالی مال گاڑیاں کے ذریعے شریف پور سے سے مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہو گئی۔ کمیپ کو سکیرڈوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور بلوچ رجمنٹ کے جوان اپنی لگرائی میں بھی بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوان موجود ہوتے تھے ہماری باری تین چار روز کے بعد آنے والی تھی ایک روز میں پھرتے پھرتے تحصیل پور سے والی آبادی کی طرف نکل گیا

وہاں سے لوگ ایک مکان کے باہر جمع تھے میں بھی تماشہ دیکھنے وہاں پہنچ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے دو جوان موجود تھے۔ دو سکھ فوجی بھی تھے ایک تانگہ لگی کے باہر تحصیل کی عمارت کے پاس کھڑا تھا بلوچ رام مورتی طائر کے مکان کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے رام مورتی طائر کے پتا کو دیکھا کہ سکھ فوجی اور پولیس والوں کے ساتھ اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک اگلے کے پائیدان کے پاس مجھے رام مورتی طائر نظر آ گیا۔ وہ تحصیل کی قلعہ نما عمارت کی طرف منہ کئے سگریٹ پی رہا تھا میری طرف اس کی بیٹھ تھی۔ میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف اپنی سینک کے موٹے ٹیشوں سے دیکھا وہ کچھ دبا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ میری طرف ساکت کھڑا دیکھتا رہا پھر مسکرایا اور مجھے گے لگایا میں نے پوچھا کہ وہ اپنے خالی مکان پر کیا کرنے آیا ہے؟ اس نے ہنس کر کہا۔

”میرے پتا جی مکان کی پرستی میں رکھی ہوئی کرشن کی مورتی نکالنے آئے ہیں“

میں نے کہا ”کیا وہ ابھی تک مکان میں ہی ہوگی؟“

رام مورتی طائر نے سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

”مسلمان بت ٹھن ہے اسے مورتی سے کیا سروکار؟ ظاہر ہے مکان میں ہی کسی بگڑی ہوگی۔“

پھر رام مورتی طائر کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور کہنے لگا۔ ”میرے پتا جی کھڑا ہندو ہیں تم ہندوؤں کو پوری طرح نہیں جانتے میں جانتا ہوں وہ جو مورتی لینے آئے ہیں اس کے اندر لالہ جی یعنی میرے پتا جی کے قیمتی جواہرات بھرے ہوئے ہیں میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم یہ راز بلوچ رجمنٹ کو بتا دو مگر اس سے کیا فرق پڑے گا ہندو تو لاہور کے مکانوں سے کروڑوں روپے کے خزانے ساتھ ہی لے کر یہاں آ گئے تھے تم لوگوں کو تو لاہور میں ملی ہوئی شاہ عالمی ملے گی۔“

پھر میرے کاندر سے پر مانتہ زکھ کر بولا۔

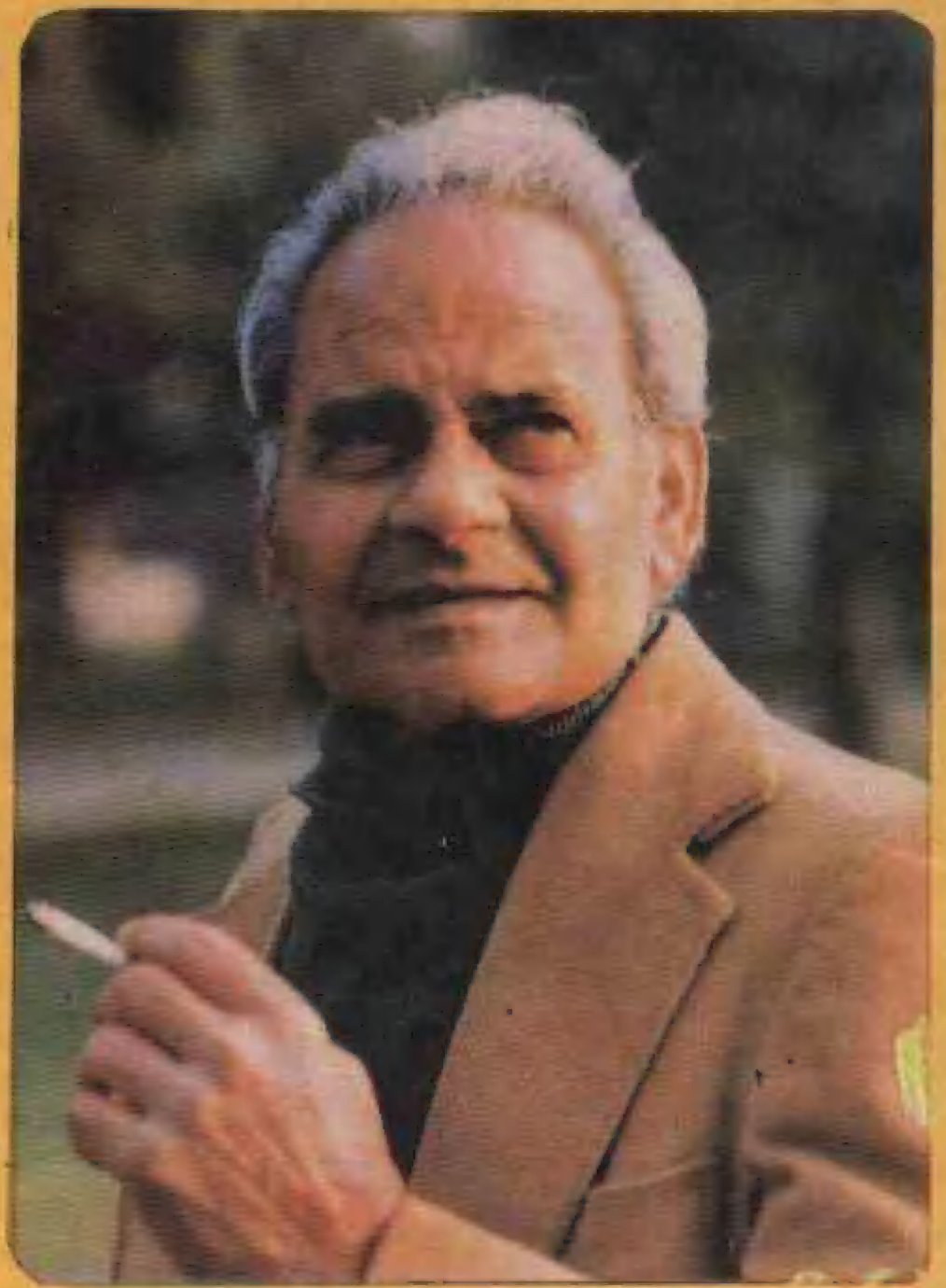
لیکن پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جیسے اب ہندو لالہ کہیں نہیں لوٹ سکے گا۔ دیکھو میں ہندو ہو کر تمہیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں مگر میں ہندو نہیں ہوں تم کو پاکستان مبارک ہو میری ایک بات یاد رکھنا پاکستان کی حفاظت کرنا ایک جان اور متحد ہو کر رہنا نہیں تو ہندو بننے کی سیاست تمہیں بڑپ کر جائے وہ ہنسے لگا۔

”یار..... تم ہندو کو نہیں جانتے یہ برہمن ہے آریہ نہیں ہے دو سگریٹ پٹو۔“

رام مورتی طاٹر کا اب مکان سے مورتی نکال کر لایا تو مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مورتی کو توڑا جائے
لوگوں کو شک پڑ گیا تھا صورتحال ایسی ہو گئی کہ مورتی کو تھوڑی سے توڑنا پڑا اندر مرجان اور مرد ہی زمرہ بھرے
ہوئے تھے ان جہازات کو بوجہ رجسٹر نے اپنی تحویل میں لے لیا اور بعد میں مسلم لیگ کے حوالے کر دیا۔
آخر ایک روز ہماری بھی باری آگئی ہم تمام گھروں کے ایک ٹرک میں سوار ہو گئے دوپہر کا وقت تھا آسمان
پر دھواں سا پھیلا ہوا تھا مسلم لیگ کے ٹرک آہستہ آہستہ جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف ریٹکے لگے میں ٹرک
میں جھکے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہر تک رہا تھا امرتسر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا تھا مسلم ہائی
سکول گزر گیا اور بھائیوں والی نہر کاریوں سے بھاٹک نظر آیا اس نہر میں ہم چلا گئیں لگایا کرتے تھے۔ ٹرک ریل
کے پل کی چڑھائی چڑھ رہے تھے پل کے اوپر جا کر سٹیشن کی طرف مڑنے تو مجھے روز کمپنی باغ کا کرٹل ہوٹل
والا دروازہ نظر آتا درخت جیسے ہاتھ بلا کر مجھے الوداع کہہ رہے تھے یہ درخت میرے بڑے بھائی کے ہاتھ سے
تھے کمپنی باغ بھی گزر گیا ٹرک پتلی گھر کے قریب سے نکل گئے چھوٹے بھی گزر گیا کھیتوں میں دیرانی
برس رہی تھی کئی جگہوں پر جھاڑیوں میں انسانی لاشیں اونڈھی پڑی تھیں پھر یہ سب کچھ گزر گیا امرتسر گزر
گیا اور دور باڈر پر ایک درخت میں پاکستان کا پرچم لہراتا نظر آیا پشورہ چہرہ پر زندگی کا تروتازہ خون
دوڑنے لگا فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی ہم پاکستان کی پیاری اور اپنی سرزمین میں
داخل ہو گئے اس وقت مجھے رام مورتی طاٹر کا فقرہ یاد آگیا۔

”پاکستان کی زمین خزانوں سے بھری ہوئی ہے جیسے اب ہندو لاکھ بھی نہیں لاوی سکے گا پاکستان
کی حفاظت کرنا ایک جان اور متحد رہنا۔“

اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر گیا ہوگا؟ آپ سب جانتے ہیں اور اس وقت میں اپنے ماضی کو یاد کر
کے کیا سوچ رہا ہوں؟ یہ بھی آپ سب جانتے ہوں گے۔ خدا پاکستان کی حفاظت کے لیے سیر پائی
دیوار بن جائیں۔ اختلافات ختم کر دیں کیونکہ ہمارا سب کچھ پاکستان ہی ہے۔



”اُمّ تسر کی مسجدوں پر پیارا مضمون لکھنے والے اے حمید کو میرا سلام پہنچے۔ کتنی پیاری تصویر کھینچی ہے، آپ نے اُمّ تسر کی معاشرت کی کس قدر آباد بھٹیں، قرطبہ کی بیٹیاں، کتنے اچھے تھے، امام صاحب اور ان کے بیٹے۔ قرطبہ کے حوالے سے تاریخ کے درپے کھول دیے، جن سے اس ملک کے مستقبل پر دُھندلی دُھندلی روشنی۔ ذرے کچھ چمکتے، کچھ بجھتے نظر آتے۔ اشاریت نے چودہ طبق روشن کر دیے۔ پرانا اے حمید پھر جاگ اُٹھا ہے، کاش ایسی شاہکار تحریریں دوئیں اور لکھ ڈالے۔“

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے ایک خط سے)

اے حمید۔ پھولوں، تتلیوں اور خوشبوؤں کے تعاقب میں ہم سے دور جاتا مصنف

راشد اشرف۔ ۹ اپریل ۲۰۱۱

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان جب کسی اسپتال کے آئی سی یو میں وینٹیلیٹر کے سہارے سانس لے رہا ہوتا ہے تو بے ہوشی کے عالم میں وہ کیسے کیسے مناظر دیکھتا ہوگا۔۔۔ اور بیہوشی کی سرحدوں سے ہوش میں آنے کے مختصر درمیانی عرصے میں وہ کن کن باتوں کو یاد کرتا ہوگا۔۔۔ یقیناً وہ تمام باتیں اسے یاد آتی ہوں گی جو اس کی زندگی سے جڑی تھیں!

اپنی تحریروں میں تو اتر کے ساتھ جنگل، خوشبو، بارش، ناریل، درخت اور چائے کا ذکر کرنے والا پاکستان کا درویش صفت، ایماندار اور ہر دلعزیز مصنف پچھلے ایک ماہ سے بھی اسی کیفیت سے دوچار ہے۔ جناب عبدالحمید جو اے حمید کے نام سے جانے جاتے ہیں، لاہور کے ایک نجی اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسی جنگ جس میں زندگی کے غالب آ جانے کا امکان روز بروز کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھ جیسے ان کے ان گنت چاہنے والوں کے یہ ایک افیت ناک صورتحال ہے۔ یہ تو خدا سلامت رکھے جناب عطاء الحق قاسمی کو کہ جن کی تگ و دو کی وجہ سے اے حمید کے علاج کا تمام خرچہ حکومت پنجاب برداشت کر رہی ہے ورنہ ان کے اہل خانہ میں اس کی سکت نہ تھی۔ اس ملک میں ہر کوئی ان جیسا خوش قسمت کہاں جس کو اس کڑے وقت میں کوئی عطاء الحق قاسمی نصیب ہو جائے۔۔۔ کتنے ہی ادیب و شاعر کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ گئے۔ شاعر و ادیب کیا، یہاں تو اساتذہ کا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوتا۔ ۷ دسمبر ۲۰۰۳ کو ملیر، کراچی میں واقع ایک تاریخی درسگاہ میں علم کی روشنی پھیلانے

والے پروفیسر غازی خان جا کھرائی اور ان کی اہلیہ کی پندرہ روز پرانی لاشوں کا ملنا تو آج بھی کچھ لوگوں کو یاد ہوگا جو بھوک سے دم توڑ گئے تھے۔ عدالت میں دائر کیس کے تفصیلات اور اس میں ملوث لوگوں کے نام و دیگر تفصیل یہاں پڑھی جاسکتی ہے:

<http://archives.dawn.com/2006/05/16/local4.htm>

کل شام مجھے اے حمید کے بیٹے مسعود حمید اپنے والد کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی عطاء الحق قاسمی صاحب کی کوششوں کے بارے میں آگاہ کر چکے تھے۔۔۔۔۔ آج صبح جب مجھ سے رہانہ گیا تو لاہور میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو فون کر ڈالا۔۔۔۔۔ وہ مجھے حمید صاحب کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں اور ان کے مثبت نتائج کے بارے میں بتاتے رہے۔ لیکن ہر آن پر اُمید باتیں کرنے والے عطاء صاحب، اے حمید کی صحتیابی کے بارے میں تذبذب کا شکار نظر آئے۔ جو شخص چند دن وینٹیلیٹر پر گزار لے، اس کی صحت کے بارے میں ڈاکٹر بھی زیادہ پر امید نہیں رہتے اور ادھر اے حمید تو پورے ایک ماہ سے وینٹیلیٹر (ventilator) پر ہیں۔۔۔۔۔ لیکن بقول عطاء صاحب، ہمیں خدا کی ذات سے امید نہیں چھوڑنی چاہیے!

مارچ ۲۰۰۸ کی ایک شام میں لاہور میں واقع اے حمید صاحب سے ملاقات کی عرض سے سمن آباد لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر گیا تھا۔ وہ ایک گھنٹہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا، وہ کتابوں سے گھرے چھوٹے سے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں بے صبری سے اس شیفنگی کا ذکر کر رہا تھا جو ایک زمانے سے مجھے ان سے ان کی تحریروں کے تعلق سے ہے۔ وہ میری باتیں سن کر انکساری سے مسکرا رہے تھے۔ میں ان کو شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب کی ان کے بارے میں رائے

یاد دلاتا ہوں کہ کس طرح شہاب صاحب جو اس زمانے میں پنجاب ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے عہدے پر فائز تھے اور حمید صاحب کو پاور لومز کا پرمٹ دے چکے تھے (ان دنوں پاور لومز کا کاروبار انتہائی منفعت بخش کہلاتا تھا اور قدرت اللہ شہاب کے پاس دن بھر اسی سلسلے میں سفارشوں کا بیزار کن تانبہ بندھا رہتا تھا) اور کچھ عرصے بعد حمید صاحب، جو ان پرمٹس کو باآسانی بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے ایک بڑی رقم بنا سکتے تھے، شہاب صاحب کو وہ پرمٹس واپس کرنے آئے تھے۔

میں اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے۔۔۔ وہ قدرت اللہ شہاب سے کہہ رہے تھے۔

یہ شہاب صاحب کے لیے ایک غیر متوقع بات تھی۔۔۔ اور پھر انہوں نے قلم اٹھایا اور شہاب نامہ میں حمید صاحب کے لیے یہ جملہ لکھا:

اس کی دلنشین تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا ہی صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔۔۔۔۔ شہاب اس محکمے میں اپنی تقرری کے تمام عرصے کے احوال کے اختتام پر لکھتے ہیں: پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید، آتا پیسنے کی چکی والا محمد دین، آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقاتیں اس زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سرانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔



اے حمید۔ پاک ٹی ہاؤس کے باہر

شہاب نامہ میں درج اس واقعے کے ذکر پر حمید صاحب ہنسنے لگے اور کہا:
”یار! جب کبھی میری بیوی مجھ پر ناراض ہوتی ہے تو میں اسے شہاب نامہ دکھا کر کہتا ہوں کہ دیکھو
قدرت اللہ شہاب جیسے انسان نے میرا ذکر کتنے اچھے انداز میں کیا ہے“

پھر میں اے حمید کو ان کے لکھے ناول ڈربے کے اقتباسات سنانے لگتا ہوں جو میرہ پسندیدہ ترین ناول
ہے۔ میں ان سے اس ناول کے کرداروں کے بارے میں دریافت کرتا ہوں ورنہ نہیں یہ بات بتاتا ہوں
کہ کالج کے زمانے میں کس طرح ایک لائبریری سے ۱۹۶۰ کا شائع ہوا یہ ناول مجھے ملا تھا جسے میں نے
منہ مانگی قیمت (تیرہ روپے) دے کر اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور پھر ایک روز اس ناول کو میرے
والد

مرحوم نے پڑھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کو محفوظ کرنے کی خاطر اس پر گرد پوش لگا دیا۔ حمید صاحب
میرے ہاتھ سے اس ناول کو لے کر بغور دیکھتے ہیں، میری درخواست پر ناول پر اپنے آٹو گراف ثبت
کرتے ہیں

اور اس کے تازہ نسخے کے حصول کے لیے مقبول اکیڈمی کے مالک کے نام مجھے ایک رقعہ لکھ دیتے ہیں۔
میں نے اس رقعے کو تبرک سمجھ کر حفاظت سے رکھا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا، ملاحظہ ہو:

<http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/5109237158/>

اس ملاقات کی تصویر اور ایک مختصر سی ویڈیو (انٹرنیٹ پر موجود واحد ویڈیو ریکارڈ) بھی یہاں دیکھی جاسکتی
ہے:

<http://www.flickr.com/photos/41786707@N05/4371908038/in/photostream/>

حمید صاحب کو اپنی یاداشیں لکھنے کی درخواست کے ساتھ ان سے ملاقات کی خوشگوار یادیں لے کر میں
وہاں سے لوٹا تھا!

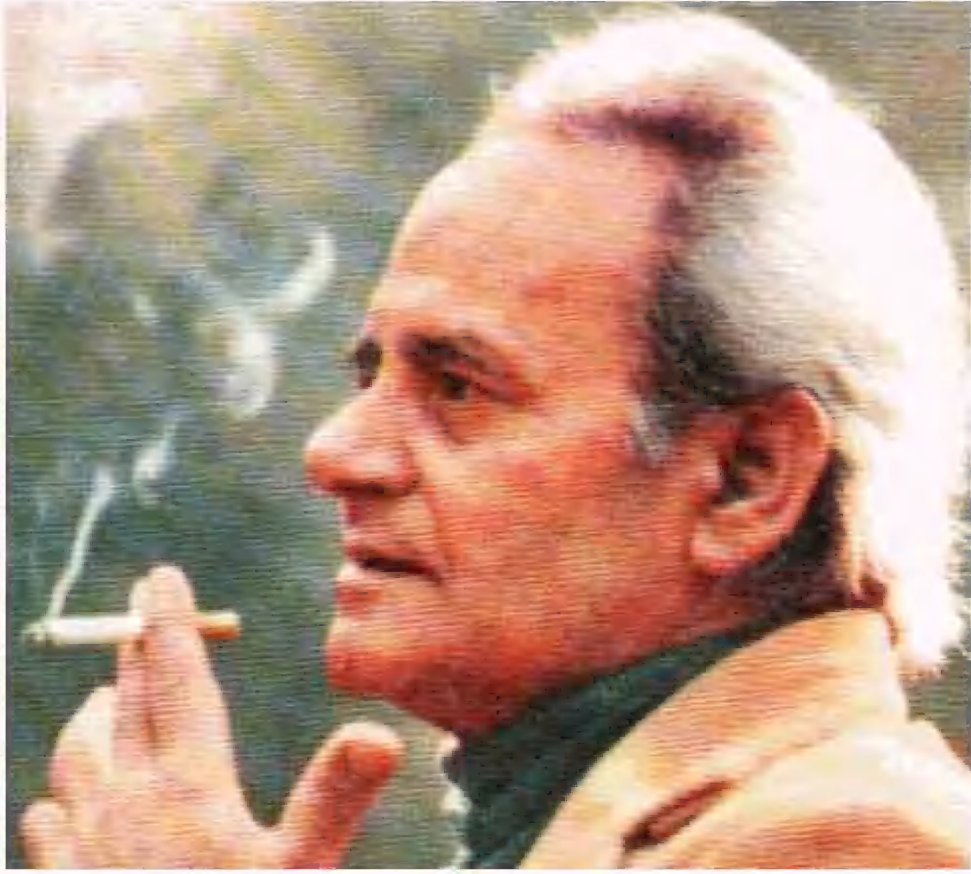


اے حمید (دائیں جانب) اور احمد راہی

اس دن کے بعد سے حمید صاحب سے مستقل فون پر رابطہ رہنے لگا اور گا ہے گا ہے کراچی سے ان کو لاہور کتابیں ارسال کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اپنی بیماری سے چند ماہ پیشتر انہوں نے مجھ سے ابن انشاء پر اپنی لکھی کتاب کی فرمائش کی جو لاہور میں نایاب ہے اور حمید صاحب کے پاس بھی اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔ یاد رہے کہ اے حمید ابن انشاء کے گہرے دوست رہے ہیں اور ابن انشاء کے خطوط پر مبنی کتاب خط انشاء جی کے^۲ میں اے حمید کے کئی بے تکلفانہ خطوط موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک خط میں (اقتباس) انشاء جی رقم طراز ہیں:

ارے حمید، میری جان! تمہارے یادوں کے گلاب سب کے سب میں نے پڑھے ہیں بلکہ سونگھے ہیں اور پرانے دنوں کی یاد پر دل کو کچھ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔ تم ڈنڈی مار جاتے ہو۔ عشق و عاشقی اور لڑکیوں کے تذکرے میں بھی تم ڈنڈی بلکہ ڈنڈا مار جاتے ہو۔ لڑکیاں تمہاری بھولی بھالی صورت رومانیک تحریر کے چکر میں آ جاتی ہیں۔ خیر میاں ہم تو تمہارے عاشق ہیں۔ فی زمانہ اور کوئی ہمیں اپنے اوپر عاشق ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔^۲

حمید صاحب کی لکھی ایک کتاب امرتسر کی یادیں^۳ میں عرصہ پندرہ برس سے تلاش کر رہا تھا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ حمید صاحب کے پاس بھی اس کتاب کا ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ پیشتر کراچی سے ایک شناسالاہور جا رہے تھے، میں نے ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ حمید صاحب سے وہ نسخہ لے کر اس کی فوٹو کاپی بنوا کر لے آئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام سرانجام پایا اور



اے حمید۔ پچیس برس قبل کی ایک تصویر

میں نے حمید صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

حمید صاحب کا سن پیدائش ۱۹۲۸ ہے، اس حساب سے وہ ۸۳ برس کے ہوئے۔ امرتسر میں پیدا ہونے والے اے حمید نے ۱۹۴۸ میں اپنا پہلا افسانہ منزل منزل لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت جلد ان کے افسانے لاہور سے شائع ہونے والے معیاری جریدوں کی زینت بننے لگے۔ وہ ایک کثیرالتخیر مصنف ہیں، انہوں نے کم وبیش ۲۰۰ ناولز لکھے جبکہ بچوں کے لیے ان کی لکھی مشہور زمانہ سیریز امبرناگ اور ماریہ کے ۱۰۰ ناولز منظر عام پر آئے۔ ان کی چند دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں:

منزل منزل

لاہور کی یادیں

داستان گو

امریکا نو

چاند چہرے

گلستان ادب کی سنہری یادیں

دیکھو شہر لاہور

جنوبی ہند کے جنگلوں میں

اردو شعر کی داستان

اردو نثر کی داستان

مرزا غالب لاہور میں

اے حمید نے ریڈیو پاکستان میں عرصہ دراز تک ملازمت کی، بعد ازاں وہ وائس آف امریکہ سے وابستہ ہو کر واشنگٹن چلے گئے جہاں سے واپسی پر انہوں نے وائس آف امریکہ کی دلچسپ یادوں کی قلم بند کیا جو پہلے کراچی کے ایک جریدے نیارخ میں قسط وار شائع ہوئی اور بعد ازاں اسے کتابی صورت میں امریکا نو کے عنوان سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور نے شائع کیا۔ انہوں نے ٹیلی وژن کے لیے ڈرامے بھی لکھے، خاص کر بچوں کے لیے لکھا گیا سیریل عینک والا جن بہت مقبول ہوا۔ وہ پچھلے کئی برس سے لاہور کے روزنامے نوائے وقت میں اتوار کے روز کا لم لکھ رہے تھے۔۔۔ ۲۰۰۳ میں ابوالحسن نعیمی کی خودنوشت یہ لاہور ہے منظر عام پر آئی جس میں نعیمی صاحب نے اے حمید کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دسمبر ۲۰۱۰ میں لاہور

سے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ رہے ناصر قریشی صاحب کی خودنوشت ادبیات نشریات شائع ہوئی جس میں قریشی صاحب نے حمید صاحب کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔



مارچ ۲۰۰۸ء۔ اپنی رہائش گاہ پر۔ راقم نے محفوظ کی

اے حمید ان لوگوں میں سے ہیں جن کی شخصیت کا مکمل عکس پڑھنے والے کو ان کی تحریروں میں گاہے بگاہے نظر آتا ہے اور یوں مزید معلومات کے حصول کے لیے کسی خارجی سہارے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ کڑکی کے زمانے میں بھی حمید صاحب اچھا لباس پہنتے تھے اور احباب کی محفل میں الگ ہی نظر آتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمیشہ بہترین لباس پہنو، بہترین خوشبو استعمال کرو اور بہترین لڑکی سے محبت کرو۔

ان کی تحریروں میں ایک عجب دلکشی ہے، پڑھنے والا کچھ دیر تمام غموں سے نجات پا کر گھنے جنگلوں، درختوں، پرندوں، خوشبوؤں کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ نکلنا نہیں چاہتا لیکن کیا کیجیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کتاب ختم ہو جاتی ہے اور اسے دنیاوی بکھیڑوں میں لوٹنا پڑتا ہے۔

وہ لاہور شہر کی روایات کے امین ہیں۔ لاہور کی محفلوں، کھانوں، ناشتوں، پہلوانوں، تکیوں، اکھاڑوں، لائبریریوں اور تھیٹر کمپنیوں کا جس انداز سے اے حمید نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے وہ کسی

اور کو کہاں نصیب۔۔۔۔۔ اسی طرح امرتسر شہر کے ذکر میں بھی یہی موضوعات ان کی تحریر کا خاصہ رہے ہیں (دیکھئے: امرتسر کی یادیں۔ سن اشاعت: ۱۹۹۱)۔ ممتاز مفتی جب ہندوستان کا سفر نامہ لکھ رہے تو اے حمید کے ذکر کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی محفلوں کا تذکرہ جس طرح اے حمید نے کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دنوں کا احوال ہر حساس پڑھنے والے کو افسردہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس افسوسناک احوال کی منظر کشی یا تو اے حمید نے کی ہے یا پھر معروف مزاح نگار محمد خالد اختر کے مضمون منٹو کے آخری دن سے اس کا پتہ ملتا ہے۔

اے حمید کی خاکہ نگاری کا ڈھنگ بھی دوسروں سے جدا نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب چاند چہرے میں انہوں نے فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، پروفیسر وقار عظیم، اخلاق احمد دہلوی، ابن انشاء، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، عبدالمجید عدم، احمد راہی، ابراہیم جلیس، راجہ مہدی علی، چراغ حسن حسرت، مرزا سلطان بیگ وغیرہ پر خاکے لکھے ہیں اور ان خاکوں میں ایسے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جو کہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ اسی طرح ان کی کتاب ”گلستان ادب کی سنہری یادیں“ بھی حقیقتاً سنہری یادوں اور باتوں کا ایک ایسا مرجع ہے جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اے حمید اوائل عمری ہی میں گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے

اور انہوں نے یہ عرصہ بمبئی میں گزارا تھا۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیاء کے بھی کئی ممالک بھی انہوں نے اچھی طرح دیکھ رکھے تھے۔ آگے چل کر اس آوارہ گردی کے تجربات ان کی تحریروں کو جلا بخشنے میں خوب کام آئے اور ان ممالک کے تجربات، رہن سہن، بول چال اور ثقافت کو انہوں نے اپنی تحریروں میں گاہ بگاہ استعمال کیا اور ان کی تحریروں کا یہی وصف ان کے قارئین کے دل میں گھر کر گیا!

اب دیکھئے کہ بھلا اس انداز تحریر کو کون پسند نہ کرے گا:

میں کبھی اکیلا اور کبھی کسی دوست کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے ٹولٹن مارکیٹ کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا۔ اس کی وجہ ٹولٹن مارکیٹ کی وہ مخلوط ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو تھی جو وہاں فضا میں ہر طرف بسی ہوئی ہوتی تھی۔ میں جنوب مشرقی ایشیاء کے ملکوں سے نیا نیا جدا ہوا تھا۔ ان ملکوں کی بارشوں کی آواز اور استوائی پھولوں کی گرم خوشبوئیں میرے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ جب میں ٹولٹن مارکیٹ میں داخل ہوتا تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میں رنگون کی اسکاٹ مارکیٹ اور کولمبو کے ساحل سمندر پر بارش میں بھگتے ناریل کے درختوں میں آگیا ہوں۔

لاہور کی سڑکوں کا احوال بیان کرتے ہوئے انداز تحریر ملاحظہ ہو:

سردیوں کے موسم میں جب مطلع صاف ہوتا تھا تو ڈیوڑھوں روڈ سنہری دھوپ میں ایک ایسی روشن سڑک لگتی جو مستقبل کے حسین سبزہ زاروں کی طرف جا رہی ہو۔ رات کو یہ سڑک کسی گمنام جزیرے کا خواب انگیز راستہ معلوم ہوتا تھا۔ جب ساون کی جھڑیاں لگتی تھیں تو بارش میں اس پرسکون خالی خالی سڑک پر ایک ایسی جنگلی عورت کا گمان ہوتا تھا سنسان جنگل میں اکیلی بارش میں نکل آئی ہو۔

جوں جوں لوگوں کے دل تنگ ہوتے گئے، ڈیوڑھوں روڈ کشادہ ہوتی گئی۔ درختوں پر کلہاڑے چلتے گئے۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ اصل سڑک کی جگہ ایک ایسی سڑک نمودار ہو گئی جس کا اصل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ کبھی یہ سڑک فطرت کی آغوش میں سانس لینے والی ایک آزاد جنگلی لڑکی تھی جو جنگل کی بارش میں بے فکری سے نہایا کرتی تھی اور آج یہ سڑک مجھے ایک ایسی بھکاری عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے جس

کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، جس کے بالوں میں گرد جمی ہے اور جو خوفزدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ (یادوں کے گلاب)

اپنے مخصوص انداز میں ماضی کے کسی دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا تو اے حمید سے سیکھئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

غفور بٹ ہفت روزہ اسکرین لائٹ کا مالک اور ایڈیٹر تھا۔ دوسری منزل پر اس کا دفتر تھا جہاں ہم شاعر ادیب تقریباً روزانہ شام کو مل بیٹھے تھے۔ ہم سب فاقہ مست ادیب تھے۔ کبھی کبھی اشفاق احمد بھی میرے اصرار پر یہاں آ جاتا تھا۔ مبارک سینما کے مالک ملک مبارک صاحب کا انتقال ہو گیا۔ غفور بٹ سیڑھیاں چڑھ کر ہانپتا ہوا آیا اور اپنے ایڈیٹر سے مخاطب ہو کر بولا:

تجمل! ملک مبارک کی وفات پر معذرت کا چوکھٹا لگانا نہ بھولنا

تجمل نے جان بوجھ کر کہا "معذرت کا چوکھٹا؟"

غفور بٹ بولا: "ہاں یار! وہی کہ ملک مبارک کے انتقال پر ادارہ اسکرین لائٹ ان کے لواحقین سے معذرت خواہ ہے۔ (داستان گو)

اے حمید ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ریگل سینما میں فلم مدام بوارے لگی۔ میں نے اور احمد راہی نے فلم دیکھنے اور اس کے بعد شیزان میں بیٹھ کر چائے اور کریون اے کے سگریٹ پینے کا پروگرام بنایا۔ اتفاق سے اس روز ہماری جیبیں بالکل خالی تھیں۔ ہم فوراً ادب لطیف کے دفتر پہنچے۔ ان دنوں ادب لطیف کو میرزا ادیب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔

ہم نے جاتے ہی مرزا ادیب سے کہا:

میرزا صاحب! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال کے بہترین ادب کا انتخاب ہم کریں گے

میرزا ادیب بڑے شریف آدمی ہیں، بہت خوش ہوئے، بولے:

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ احمد راہی صاحب حصہ نظم مرتب کر لیں گے اور آپ افسانوی ادب کا انتخاب کر لیں۔“

ہم نے کہا: ”تو ایسا کریں کہ ہمیں پچھلے سال کے جس قدر انڈیا اور پاکستان کے ادبی رسالے دفتر میں

موجود ہیں، دے دیجیے تاکہ ہم انہیں پڑھنا شروع کر دیں“

میرزا صاحب خوش ہو کر بولے: ”ضرور۔۔ ضرور“

اس کے آدھے گھنٹے بعد جب ہم ادب لطیف کے دفتر سے باہر نکلے تو ہم نے ادبی رسالوں کے دو بھاری

بھر کم پلندے اٹھا رکھے تھے۔ آپ یقین کریں کہ ہم وہاں سے نکل کر سیدھا موری دروازے کے باہر

گندے نالے کے پاس ردی خریدنے والے ایک دکاندار کے پاس گئے اور سارے ادبی رسالے سات

یا آٹھ روپوں میں فروخت کر دئے۔ اس شام میں نے اور احمد راہی نے بڑی عیاشی کی۔ یعنی مادام بوارے

فلم بھی دیکھی اور شیزان میں بیٹھ کر کیک پیسٹری بھی اڑاتے اور کریون اے کے سگریٹ بھی پیتے رہے۔

اس کے بعد تقریباً دوسرے تیسرے روز میرزا ادیب ہم سے پوچھ لیتے:

”بھئی انتخاب کا مسودہ کہاں ہے“

ہم ہمیشہ یہی جواب دیتے: ”بس دو ایک دن میں تیار ہو جائے گا۔ ہم دراصل بڑی ذمہ داری سے کام

کر رہے ہیں۔“ (یادوں کے گلاب)

ہمارے ممدوح کو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اس کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ سعادت حسن منٹو

سے اپنی آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میو اسپتال کی دوسری منزل کے میڈیکل وارڈ میں دروازے کے ساتھ ہی ان کا بستر لگا تھا۔ منٹو صاحب بستر پر نیم دراز تھے اور ان کی بڑی ہمشیرہ ان کو چھج کے ساتھ سوپ پلانے کو کوشش کر رہی تھیں۔ میں خاموشی سے بستر کے ساتھ بیچ پر بیٹھ گیا۔ منٹو صاحب بے حد نحیف ہو گئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ منٹو صاحب نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا:

اب کیسی طبیعت ہے منٹو صاحب ؟

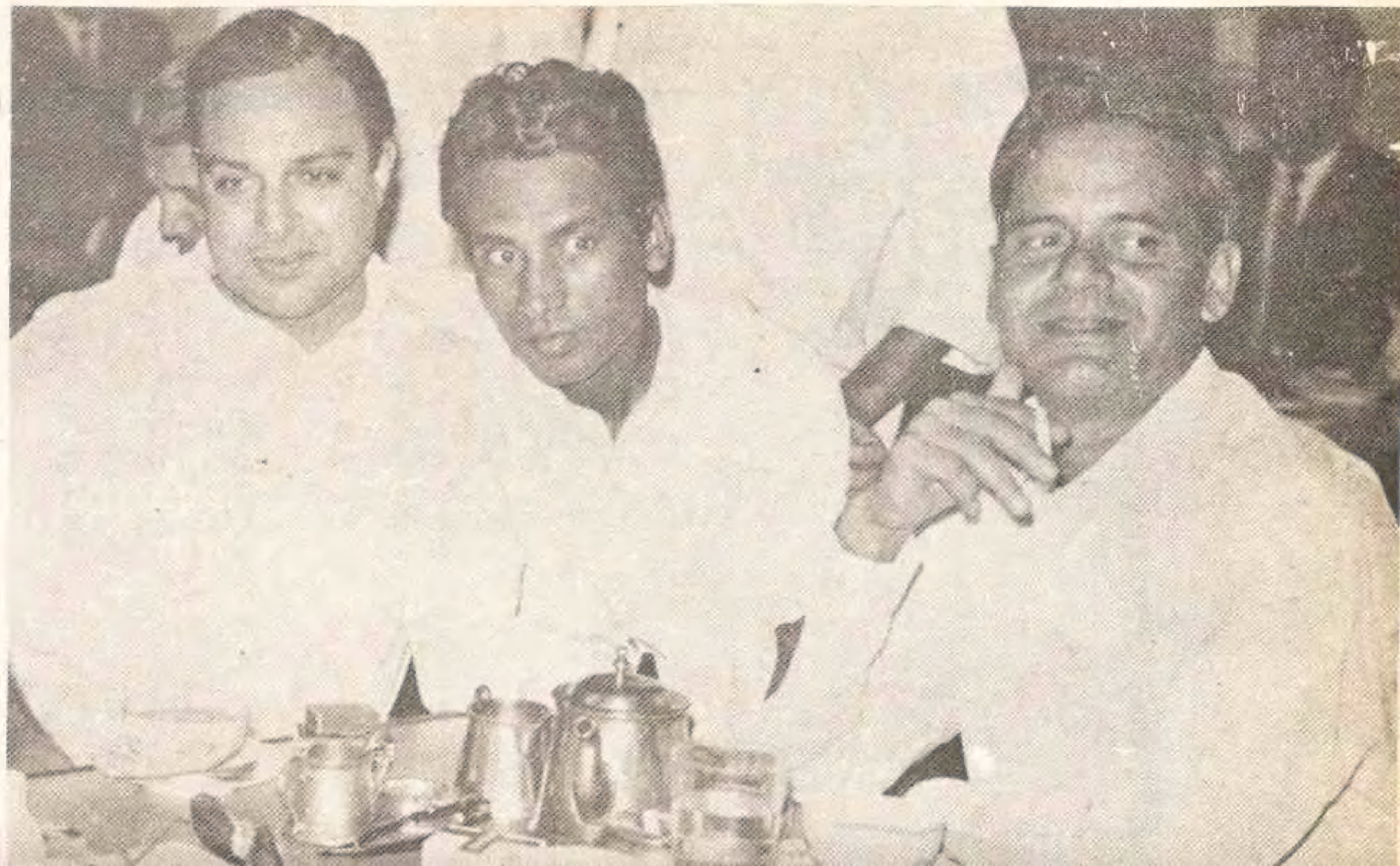
اس عظیم افسانہ نگار کے کمزور چہرے پر ایک خفیف سا اداس تبسم ابھرا اور صرف اتنا کہا:
دیکھ لو خوجہ!

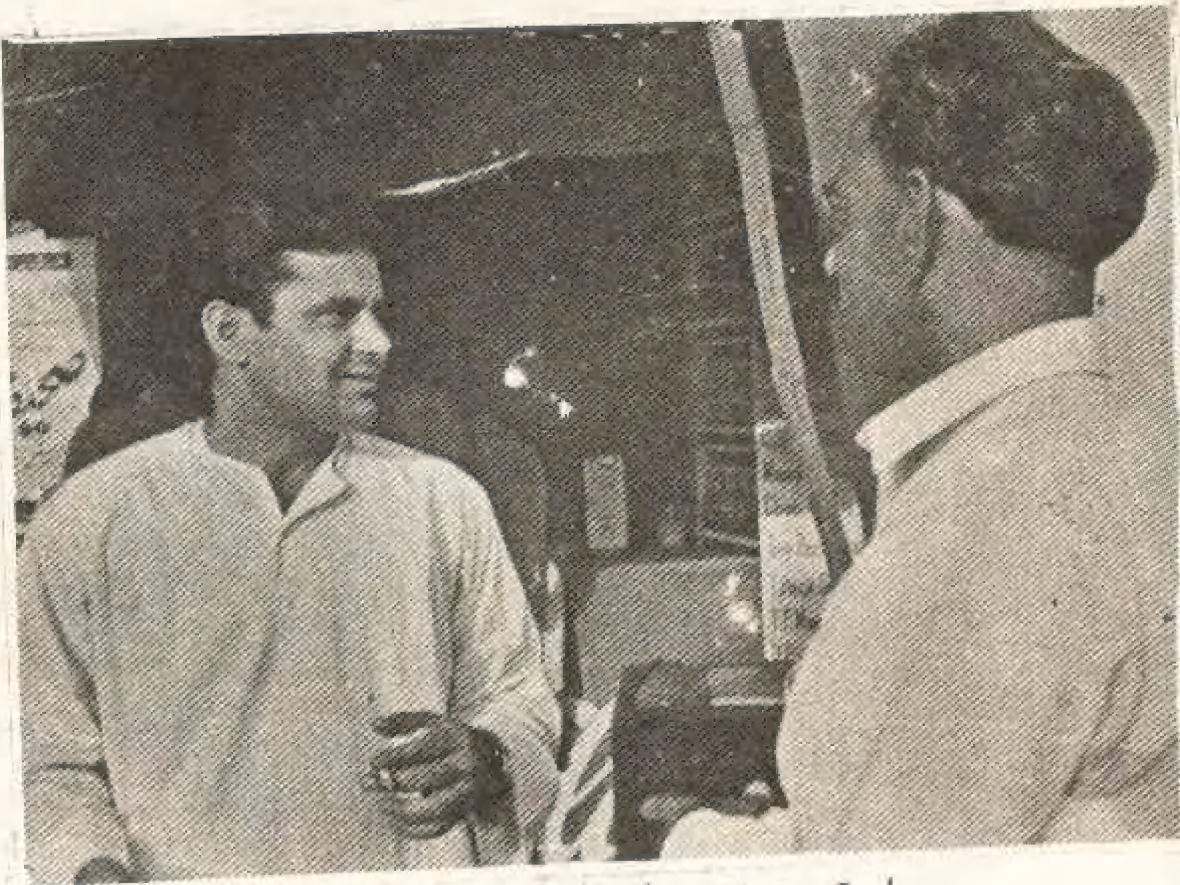
اور اس کے کچھ ہی روز بعد سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ (یادوں کے گلاب)

اے حمید لکھتے ہیں کہ نریش کمار شاد جب دہلی سے لاہور آیا تو سعادت حسن منٹو کی قبر پر جا کر بہت رویا اور پھر کہا: ”خدا مسلمانوں کو خوش رکھے۔ ہمارے پیاروں کا نشان (قبر) تو بنا دیتے ہیں۔“

اپنی ایک تحریر میں اے حمید نے یہ بات لکھی تھی کہ میں اپنے فلاں بیمار دوست کو بستر مرگ پر دیکھنے نہیں گیا اس لیے کہ میں جن سے محبت کرتا ہوں ان کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔
حمید صاحب! ہم آپ کو اس حالت میں دیکھنے کا حوصلہ کہاں سے لائیں ؟

ایم حمید
ابراہیم جلیبی
ایک
چائے
کی
دعوت
میں





اے حمید اور اصغر سلیم
(پاک فٹے ہاؤس کے باہر)

اے حمید کی دوسری برسی راشد اشرف۔ ۷ مئی ۲۰۱۳۔ کراچی

ناول آپ نے پڑھا۔ یہ تحریر اس مصنف کی ہے جس نے تمام عمر سوائے لکھنے کے، اور کوئی کام نہ کیا۔ جناب اے حمید نے ریڈیو کی ملازمت تو روٹی تو کما کھائے مچھنڈر کے مصداق اختیار کی تھی۔ ان کی اصل دلچسپی تو صرف اور صرف لکھنے ہی میں رہی تھی۔ لاکھوں معصوم ذہنوں کی تربیت کرنے والے اس درویش صفت مصنف کی دوسری برسی بھی ۲۹ اپریل ۲۰۱۳ کو خاموشی سے گزر گئی، گویا برسی نہ ہوئی، بے حسی ہو گئی۔ حمید صاحب کے پرستار کسی ٹی وی چینل پر، کسی اخبار میں ایک کالمی خبر کے منتظر ہی رہ گئے۔ شاید ان میں سے کئی ایسے رہے ہوں جنہوں نے اس شخص کی تحریروں کو پڑھ کر ہی زندگی میں کوئی مقام پایا ہو، چار لوگوں میں بات کرنے کا سلیقہ اپنایا ہو۔

شہرت بخاری نے اپنی خود نوشت کھوئے ہوؤں کی جستجو میں لکھا تھا کہ یہ موت مجھے کہیں مجسم حالت میں مل جائے تو میں اس کا منہ نوچ لوں، کلیجہ چبالوں۔ یہ ڈائن بار بار ہمارے پیاروں کو ہم سے جدا کر دیتی ہے۔

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مرجائیں گے

لیکن صاحبو! موت تو برحق ہے۔۔۔ اپنا وار کرتی رہے گی۔ علم تصوف میں بتایا جاتا ہے کہ زمانے میں ہمہ وقت ”حشر نشر“ کا سلسلہ جاری ہے۔۔۔۔۔ ایک سمت سے ہر لحظہ مخلوقات کو دنیا میں نشر کیا (پھیلایا)

جار ہا ہے اور دوسری جانب انہیں حشر (جمع ہونے/سمیٹے جانے) کا سامنا ہے۔ یوں زمانے کی گود میں ازل سے ترتیب و ابتری حرکت میں ہیں، اور روئے زمین پر اسی طور ابد تک محبت اور موت کی نبرد آزمائی جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کافر مان ہے (ترجمہ): "یہی ہے ازل سے تیرے رب کا طریقہ اور تو ابد تک اس میں کوئی تبدیلی نہ پائے گا۔"

فیض لدھیانوی (وفات: ۶ جنوری ۱۹۹۵ء لاہور) کا کیا خوب اور منفرد شعر ہے:

میں ہوں ناواقف مگر ہر سال آتی ہے ضرور
فیض جس کو کل کہیں گے میری تاریخ وفات

اے حمید صاحب نے اپنے ایک یادگار ناول ڈربے (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) میں ایک گورکن کی زبانی موت کے فلسفے پر سادہ و دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس گورکن کی ہر نصیحت کسی نہ کسی مقولے پر ختم ہوا کرتی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہ تھا مگر اس کی باتیں دور دور کی خبر لایا کرتیں۔ موت کے فلسفے پر وہ اس قدر آسانی سے روشنی ڈالا کرتا کہ ہر لفظ جگنو کی مانند چمک چمک کر اپنا مفہوم بتا دیتا تھا:

"لوگ موت سے خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ سچ پوچھو تو زندگی کے لیے یہ بڑی ضروری شے ہے۔ ہمیں پھول کیوں اچھے لگتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کھلتے ہیں۔ اور پھر مرنے سے ہمیں نقصان ہی کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ ہم اس دنیا میں باقی نہیں رہتے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو لوگ پہاڑوں سے کودتے، پتھر باندھ کر دریاؤں میں چھلانگ لگاتے،

انجن تلے سر دیتے۔ پھر سوچو زندگی کتنی گھناؤنی ہوتی۔ بھئی میں تو ہنسی خوشی جان دوں گا۔ موت کا استقبال تھوڑی صورت ہونا چاہیے۔ برخوردار یہ سب دکھوں کا آخری علاج ہے۔

کہتے ہیں اگلے وقتوں میں روح قبض کرنے پر مامور فرشتے کو آتا دیکھ کر لوگ دشنام طرازی کیا کرتے تھے۔ طے پایا کہ اس سے بچنے کے لیے موت کے مختلف ذرائع مقرر کر دیے جائیں۔ لہذا ہم نے دیکھا کہ اے حمید صاحب نمونیہ کے شدید حملے کا شکار ہوئے اور تقریباً دو ماہ تک اسپتال میں داخل رہنے کے بعد ۲۹ اپریل ۲۰۱۱ کی رات دو بجے انتقال کر گئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون

وہ تمام عمر سکرات کے اس عالم سے محفوظ رہے جس سے خاص کر ہمارے معاشرے کا کم و بیش ہر ادیب و شاعر گزرتا ہے یعنی زندگی میں قدر نہ ہونے کا احساس۔ اے حمید صاحب کو ان کے چاہنے والوں سے بے اندازہ محبت ملی!

ان کی اہلیہ اسپتال میں پچھلے دو ماہ سے مقیم تھیں جہاں پنجاب حکومت نے ان کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا تھا۔ ان کو اسپتال انتظامیہ نے رات دو بجے اطلاع دی کہ حمید صاحب کی حالت نازک ہے۔ جب وہ کمرے میں پہنچیں تو حمید صاحب جاچکے تھے!۔۔۔ اچانک ان کے جسم میں پانی بھرنا شروع ہو گیا تھا اور دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ سے گفتگو کرتے وقت حمید صاحب کی اہلیہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں:

حمید صاحب کے چہرے پر بڑا سکون تھا اور اس کئی لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ انتقال کے بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے دریافت کیا کہ اس وقت ان کا جسدِ خاکی کہاں ہے تو ان کی اہلیہ نے بتایا کہ ابھی ابھی ان کو اسی کمرے میں لایا گیا ہے جہاں میں (رقم) ۲۰۰۸ میں ان سے ملاقات کی غرض سے دیر گئے تک بیٹھا رہا تھا۔

چشمِ تصور سے میں نے وہ منظر دیکھا اور بوجھل دل کے ساتھ روائتی تعزیتی جملے کا سہارا لیا:
اللہ آپ کو وقت کے ساتھ صبر دے!

پیٹا! وقت تو میرے لیے رک گیا ہے، ختم ہو گیا ہے، تو یہ صبر کیسے آئے گا؟
حمید صاحب کی اہلیہ کے اس جواب سے میری آواز میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

اے حمید صاحب اپنی خودنوشت تحریر کر رہے تھے اور میں اکثر ان سے اس بارے میں فون پر دریافت کر لیا کرتا تھا۔

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی خودنوشت کا نام ”چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں“ تجویز کیا تھا۔

فارغ بخاری کی خودنوشت ”مسافین“ کا آخری باب ان کے پیٹے قمر عباس نے تحریر کیا تھا جو خود بھی ایک مصنف تھے اور بعد ازاں ۷ مئی ۲۰۰۷ کے روز پشاور میں قتل کر دئے گئے تھے۔

حمید صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی عنایتوں کے سائے تلے ہمیشہ رکھے۔۔۔ لیکن آپ کی خودنوشت کا آخری باب کون تحریر کرے گا؟